قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2023 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ♦ زبان شناسی
- میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

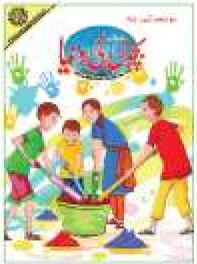

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:6، جون 2023

مدیر : پروفیسر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید — ظفر انصاری 8
حکیم مومن خاں مومن کے فارسی خطوط کا تنقیدی جائزہ — نیلوفر حفیظ 11

کوچۂ نرگسیت کا والہ و شیدا ریاض خیر آبادی — محمد یونس ٹھوکر 15
انشائیہ کا فن — نوشین حسن 18
قرۃ العین حیدر کے سفرناموں کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ — عدیلہ جبیم 23
منشی محمد الدین فوق — الطاف احمد 26

زبان اور زمینی صورت حال
زبانیں ہی ثقافت کی محافظ ہیں — محمد اسماعیل 28

کتاب دریچہ
جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — منظور احمد گنائی 31

لعل و گہر
ایس ایم سرور کی شاعری میں مشترکہ ہندوستانی تہذیبی عناصر — کے پی شمس الدین 34
اثر انصاری بحیثیت غزل گو شاعر — عتیق الرحمٰن 36
مختلف الجہات شخصیت ملک زادہ منظور احمد — عادل احسان 39

ذکر جگن ناتھ آزاد
جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری — مشتاق احمد وانی 42

وطن میں اجنبی تقسیم اور ہجرت کے آئینے میں — امتیاز احمد 45

خراج عقیدت
محمد مستقیم
یادوں اور باتوں میں — ارشاد احمد 47
مٹی کی سوندھی خوشبو کا شاعر سرفراز شاکر — اکمل نعیم صدیقی 50

سلسلۂ صحافت
اڈیشا کا پہلا اردو اخبار — خاور نقیب 52
تحریک آزادی ہند اور اردو اخبارات — جہانگیر احمد خان 55
عوامی ترسیل اور نئی ٹیکنالوجی — وثیق الرحمٰن داؤد علی 58

عالمی ادبیات
بھکاریوں کی ہڑتال — احسان عبدالقدوس، مترجم: محمد قطب الدین 61
عربی ادب کا ایک ناول 'لقیطہ' — پریتی بھارتیا 63

زبان و تعلیم
تعلیمی مسائل کی سماجی اساس — محمد شاداب عالم 66

تاریخ و تہذیب
روہتاس- آدیباسیوں کی قدیم جائے پناہ — شمیم قاسمی 68

خصوصی گفتگو
ڈاکٹر شکیل احمد سے ادبی گفتگو — ظہیر حسن ظہیر 73

فلم
آزادی کے بعد ہندوستانی سنیما کے 75 سال — واثق الخیر 75

طب اور اردو
اردو زبان پر سنسکرت کے اثرات طب کے حوالے سے — عبدالسمیع 78

نیا آسماں نئے ستارے
واجد علی شاہ اختر اور ان کی بیگمات کے خطوط — محمد رضا اظہری 81

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 84

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 93

ہماری بات

زبانوں کو جدید وسائل اور ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی وجہ سے لسانی اور ثقافتی منظرنامہ خاصا وسیع ہوا ہے۔ دور دور تک ادب وثقافت کی رسائی کی صورت نکلی ہے۔ افادیت کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔ تعلیم وتدریس کی سطح پر بھی جب سے یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے تو اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ خاطرنشاں رہے کہ زبان و ادب کے فروغ میں جہاں بہت سے عناصر وعوامل کا اہم رول رہا ہے وہیں تدریس کا بھی کلیدی کردار ہے۔ پرانے زمانے میں تدریس کا طریقۂ کار بہت مختلف تھا لیکن جیسے جیسے حالات تبدیل ہوتے گئے اس کے طریقۂ کار میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ آج کے ڈیجیٹل عہد میں تعلیم وتدریس کی سطح پر بہت سے نئے تجربے کیے جارہے ہیں ان میں ایک تجربہ یہ بھی ہے کہ جدید ترین تکنیکی وسائل اور ٹیکنالوجی کو تعلیمی اور تدریسی نظام کا حصہ بنایا جارہا ہے اور اس کا بہت بہتر تجربہ اس دور میں کیا گیا جب

کورونا کی وجہ سے سارے راستے مسدود تھے اور صرف ایک ہی راہ بچی تھی کہ آن لائن تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ طلبا کا تعلیمی نقصان نہ ہو۔ اس کی وجہ سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ درس وتدریس کا دائرہ صرف کلاس روم تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے دائرے میں وسعت آتی گئی اور بہت سے وہ افراد بھی اس سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہوئے جو کلاس روم تک نہیں آسکتے تھے۔ جو اساتذہ پہلے تدریس کے روایتی طریقہ کار پر عمل پیرا تھے انھوں نے بھی آن لائن کلاسز کے ذریعے عصری ٹیکنالوجی سے نہ صرف خود کو ہم آہنگ کیا بلکہ اس ٹیکنالوجی کے دوسرے فوائد سے آشنا بھی ہوئے اور ان کے سامنے امکانات کے نئے در کھلتے گئے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان بھی عصری ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہوچکی ہے اور اس کا بھی بیشتر ادبی اور علمی سرمایہ آن لائن موجود ہے۔ اس کی وجہ سے یہ آسانی ہوگئی ہے کہ آپ کسی بھی خطے میں ہوں اپنے مطلوبہ مواد تک بہ آسانی رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں متعلقہ مواد تک پہنچنے میں محققین کو بہت ساری دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر اب راہ آسان ہوگئی ہے۔ اب بہت سے ایسے اہم ادارے ہیں جن کی ویب سائٹ پر اردو زبان و ادب کے تعلق سے نہ صرف اہم کتابیں دستیاب ہیں بلکہ مقالات اور مضامین کی بھی معتد بہ تعداد موجود ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ پر نہ صرف یہ کہ سائنسی، سماجی، نفسیاتی، تاریخی طبی علوم اور ادب اطفال کا وسیع ذخیرہ ہے بلکہ ادبیات پر مشتمل کتابوں کے علاوہ قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والے چاروں رسائل سہ ماہی 'فکروتحقیق'، ماہنامہ 'اردو دنیا'، ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اور ماہنامہ 'خواتین دنیا' کے شمارے موجود ہیں جن سے قارئین استفادہ کرسکتے ہیں۔

عصری ٹیکنالوجی کی وجہ سے نابینا افراد کو بھی بہت ساری سہولیات میسر ہوئی ہیں۔ ایک زمانے میں نابینا حضرات کے لیے بریل اسکرپٹ کا رواج تھا جس کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ آج ٹیکسٹ ٹو اسپیچ ٹیکنالوجی نے اس مرحلے کو بہت آسان کردیا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو عصری ٹیکنالوجی کی وجہ سے بہت سی وہ راہیں کھلی ہیں جو شاید پہلے مسدود تھیں یا جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ آج کی نسل عصری ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہے اور نئی چیزوں کو بہ سہولت قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اگر اس ٹیکنالوجی کا استعمال صحیح طور پر زبان و ادب کے فروغ کے لیے کیا جائے تو اس کے بہت مفید اور مثبت نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ اردو زبان میں تدریس کے تعلق سے مواد کی کمی کا شکوہ کیا جاتا رہا ہے مگر آج کی ٹیکنالوجی نے اس شکایت کا باب بھی بند کردیا ہے کہ اب بہت سی ویب سائٹس پر تدریس سے متعلق بھی مواد کی کمی نہیں ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ھے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ھے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ہوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (ادارہ)

'اُردو دنیا' مئی 2023 موصول ہوا۔اس کے خوش رنگ سرورق پر تجریدی آرٹ کا خوشنما دریچہ نظر آرہا ہے جس میں سہمے سہمے چاند ستارے تکونی شکلوں میں جلوہ گر ہیں۔ اس شمارے کی ترتیب میں کوئی 16 شہ سرخیاں جگمگا رہی ہیں۔ اداریہ یعنی ہماری بات (ص4) میں کسی نہ کسی صورت اردو زبان کی بقا کی ضمانت دی جارہی ہے اور اس کے اسباب وعلل بھی بیان کیے گئے ہیں۔خطوط (ربط والتفات ص5) کے ذیل میں تین خطوط درج ہیں۔ص6 پر سوالنامہ دیا گیا ہے جس کی روشنی میں یا تو انٹرویو لکھنا ہے یا پھر کوئی افادی مضمون ترتیب دینا ہے۔اس میں دراصل رہنما خطوط وضع کیے گئے ہیں تا کہ اُردو دنیا کو درکار حقیقی صورت حال سے واقفیت ہو۔'ادب: زاویے اور جہات (ص7 تا 12) اس میں دو مقالے درج ہیں۔ پہلا 'اردو ناول میں ثقافتی نوحہ گری' کی ابتدا ڈی ایچ لارنس کی خوش فہمی سے ہوتی ہے۔اس میں دلّی ولکھنؤ کے خستہ حالات پھر تقسیم کا سانحہ اور اس دور میں لکھے گئے ناولوں کا تذکرہ ہے اور پھر فاروقی صاحب کے ناول کا تذکرہ یعنی 'کئی چاند تھے سرآسماں'۔اس ناول میں وزیر خانم (چھوٹی بیگم) کو ایڈورڈ مارٹن بلیک کی زوجیت میں دو اولادیں تولد ہوئیں، پھر وہ دیگر صنادید کی زوجیت میں جیسے جیسے داخل ہوتی گئیں تو ظاہر ہے یہ اولادیں سن شعور کو پہنچ گئی ہوں گی تو انھیں کس قسم کے نفسیاتی احساسات کا سامنا ہوا ہوگا؟ اس کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ ناول میں بھی نہیں۔ دوسرا مضمون تقابلی مطالعہ تعریف آغاز وارتقا اور طریقۂ کار' خالص نفسیاتی، علمی وتحقیقی مضمون ہے اور نہایت لاجواب قابل صد ستائش ہے۔انشا فنی اور فکری زاویے (ص13 تا 20) میں دو مضامین ہیں۔ ان میں پہلا 'انشاء اللہ خان انشا کے غیر منقوط ادبی کارنامے' یہ مضمون اپنے آپ میں بے مثال ہے۔لکھا ہے کہ انشا نے ایک بے نقط داستاں 'سلک گوہر لکھی' اور رانی کیتکی کی کہانی میں عربی فارسی الفاظ کو یکسر ترک کر کے خالص ہندوستانی زبان میں تحریر کی۔ ایک دیوانِ بے نقط بھی تحریر کیا ہے جس میں تقریباً تمام اصناف نظم شامل ہیں۔ یہ مضمون تمام تر عالمانہ اور محققانہ انداز لیے ہوئے ہے۔ یہ طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لیے بھی یکساں افادیت رکھتا ہے۔دوسرا مضمون 'کلامِ انشا اس میں ہندو تہذیب اور کردار' بھی عالمانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔اس میں انشا نے ہندو معاشرے اور عقائد کی عکاسی نہایت دلکش انداز میں کی ہے۔ان کی نظموں میں کشن جی اور کنہیا جی سے مراد شری کرشن جی ہیں اور رادھکا سے مراد رادھا کے ہیں۔اس مضمون کو کوئی آٹھ مستند حوالہ جاتی کتب سے تیار کیا گیا ہے۔اس طرح یہ ایک علمی وتحقیقی مقالہ ہے۔ پانچویں صنف سخن 'زبان اور زمینی صورت حال' (ص21 تا 23) میں ایک اہم مضمون شامل ہے کہ 'یہ کیسے ممکن ہے کہ رسم الخط کے بغیر اُردو زندہ رہ جائے گی' سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مضمون کو ص6 پر دیے گئے سوالنامہ کے دروبست میں تیار کیا گیا ہے لیکن اس میں اختیار کردہ موضوع نہایت ہی اہم ہے کہ اس کا تعلق اُردو رسم الخط سے ہے۔اردو رسم الخط اس لیے بھی اہم ہے کہ دیگر زبانوں کے برخلاف اس میں حروفِ حلقی بھی شامل ہیں۔'لعل وگہر' (ص24 تا 33) میں تین ستائشی مضامین شامل ہیں۔ 'زبان وتعلیم' (ص34 اور 35) میں جناب سیّد امتیاز حسن نے 'مادری زبان اُردو — کل آج اور کل' شماریاتی طریقے سے تجزیہ کیا ہے جو اپنے آپ میں عمیق تحقیقی مقالہ ہے جس میں انھوں نے کوئی سات شماریاتی شکلوں کی مدد سے اپنے موضوع کو واضح کیا ہے۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ 'ہندوستان میں اُردو عمر دراز ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور بھی ہوتی جارہی ہے۔' جس سے اتفاق کرنا نہ کرنا آپ کے اپنے اختیار میں ہے۔'کتاب دریچہ' (ص36 تا 38) اس کے تحت ایک مضمون 'جن کتابوں نے متاثر کیا' محترمہ شہناز رحمٰن صاحبہ کا ہے۔ اس میں آدھے درجن سے زائد متاثر کن کتابوں کا تذکرہ ہے۔'خراجِ عقیدت' (ص39 تا 42) کے تحت منظر اعجاز کے توانا اور تنقیدی ذہن کی مفصل ستائش 'سلسلہ صحافت' (ص43 تا 51) میں دو صحافتی روداد درج ہیں۔ پہلے بیانیہ میں تین بھولی بسری خاتون (یعنی خواتین) اور قومی تحریک آزادی میں 'لکھنؤ

مسیحی مشنری پادری کریون نے مسز ہیڈلی کی ادارت میں 'رفیق نسواں' نامی ایک نسوانی رسالہ جاری کیا۔ معروف کانگریسی لیڈر عبدالمجید خواجہ کی زوجہ بیگم خورشید خواجہ نے علی گڑھ سے اُردو ہفت روزہ 'ہند' جاری کیا تھا۔ دوسرے کلثوم نے پندرہ روزہ 'رہبر' (غالبا بمبئی (موجودہ ممبئی) سے جاری کیا) تعجب ہے کہ مصنف رو میں اخبار کے مقام اجرا کو بیان کرنا ہی بھول گئے۔ اور تیسرے ہاجرہ بیگم نے ماہنامہ 'روشنی' جاری کیا تھا۔ یہ مضمون کئی وجوہات کی بنا پر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ فی الواقعی تحقیقی مضمون ہے۔ دوسرے اس میں جنگ آزادی میں خواتین نے اردو جریدوں کے ذریعے بھرپور حصہ لیا اور تیسرے یہ اسے گمنام اور نامور خواتین کی بذریعہ صحافت تاریخِ آزادی کہیے۔ اس لحاظ سے مصنف اسعد فیصل فاروقی صاحب اور 'اردو دنیا' کا شعبۂ ادارت دلی مبارکباد کا مستحق ہے۔ دوسرا مضمون 'رہنمائے دکن' حیدرآباد کے تابناک سفر سے متعلق ہے۔ اس مشہور زمانہ کی شہرت تمام تر دشواریوں کے باوجود ساری اردو دنیا میں آج تک برقرار ہے۔ قابل مصنف نے اس کی صحافتی تاریخ کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ 'یادِ شمیم' (ص 52 تا 59) میں تین مضامین پیش ہیں۔ ایک تو اُن کی کالم نگاری پر دوسرا غالب شناسی اور جدیدیت پر ان کی فلسفیانہ اساس پر مبنی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'خصوصی گفتگو' (ص 60 اور 61) میں کرناٹک کے مشہور شاعر حافظ کرناٹکی کا انٹرویو پیش کیا ہے۔ 'فلم' (ص 62 تا 64) میں ستیہ جیت رے اور ان کی فلموں پر سیر حاصل تبصرہ شامل ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' (ص 67-65) میں قاضی عبدالستار کی شخصیت اور ان کے فن پر تاریخی وستائشی گفتگو کی گئی ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' (ص 68 تا 78) میں کوئی گیارہ کتابوں پر آپ کی سہولت کی خاطر تبصرے دیے گئے ہیں۔ اخیر میں 'خبرنامہ' (ص 79 تا 98) میں اُردو دنیا کی خبریں دی گئی ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ ان کے مطالعے کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑے گا اور آپ تہہ دل سے اس کی ستائش پر آمادہ ہوں گے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی کا تازہ شمارہ، موصول ہوا۔ ملتے ہی ورق گردانی شروع کردی پھر فرداً فرداً موضوعات پر نظر دوڑایا۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے ناولوں میں ثقافتی نوحہ گری کے موضوع کو اپنایا۔ یہ موضوع بہت وسیع و بسیط ہے اور تقریباً اردو کے اکثر ناولوں میں دیکھنے کو مل جاتا ہے 'امراؤ جان ادا' سے لے کر 'آخری سواریاں' تک یہ موضوع چبھتا ہوا نظر آتا ہے، تاہم خوبصورت اشارات پیش کرتا ہے۔ دوسرا موضوع تقابلی مطالعے پر ہے جس کا آخری پیراگراف اصول وکلیات پیش کررہا ہے۔ 'کلام انشا میں ہندو تہذیب اور کردار' تکمینہ حبیب صاحبہ کا ایک معلوماتی مضمون ہے جس سے ہندو اساطیر و مذہب کی بنیادی معلومات فراہم ہوتی ہیں اور ساتھ ہی اردو کے شعری سرمایہ میں یہاں کے مذہب کو کس قدر جگہ ملی ہے اس کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ ہندوازم کی تاریخ ومذہب کو سمجھنے کی جانب بھی اشارہ ملتا ہے۔ انٹرویو کے صفحات بھی بہت ہی زیادہ فکرآور ہیں ہر ایک کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ کنزالمطالب پر ڈاکٹر ابراہیم افسر کا خوبصورت مضمون ہے اس کے لیے انھیں مبارکباد پیش ہے۔ باقی سارے مضامین پر ابھی سرسری انداز میں نظر ڈالی ہے جو موضوعات کے لحاظ یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔ رسالے کی خوبصورت ترتیب اور عمدہ مضامین کے انتخاب کے لیے ادارتی عملے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر امیر حمزہ: مدرسہ محلہ، نوادہ، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.......................... بتاریخ........................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورتِ حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذراسی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے وِدیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

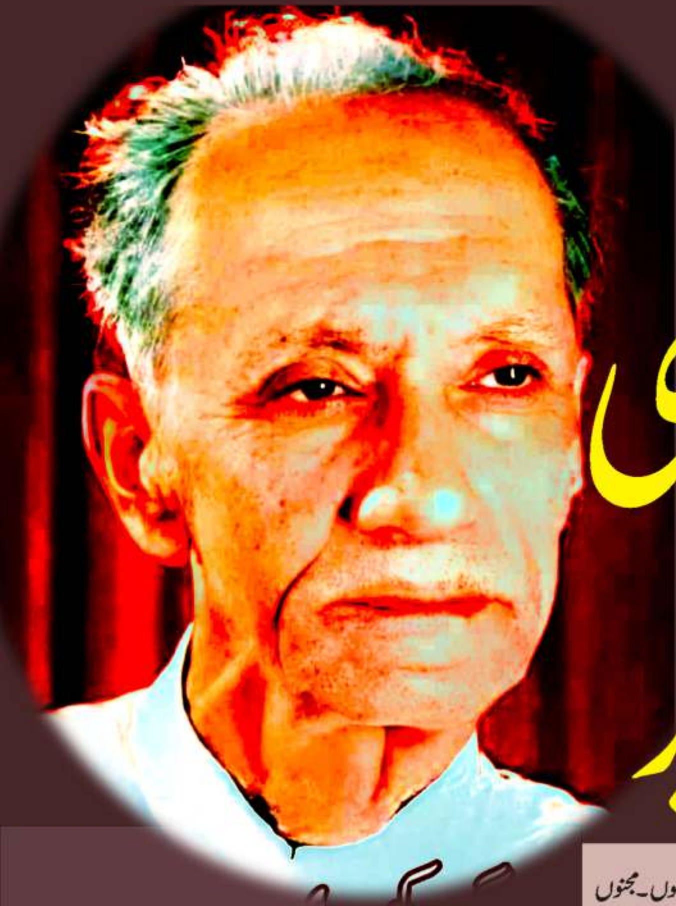

مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید

ظفر انصاری

پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کا شمار اردو کے عظیم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے تخلیقی ادب میں بھی گراں قدر نقوش ثبت کیے ہیں اور ان کے افسانے اور ان کی شاعری بھی معیار و اقدار کے لحاظ سے قابل اعتنا ہے اور ادب میں ان کی حیثیت بھی مسلم ہے، لیکن ایک نقاد کے طور پر ان کو جو شہرت حاصل ہوئی اس نے ان کی ادبی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو پس پشت ڈال دیا اور ایک نقاد کی صورت میں ہی ان کی شناخت قائم ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری نے اردو کی مختلف اصناف کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا جن میں غزل، مثنوی اور افسانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

مجنوں گورکھپوری اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے باریک بیں اور نکتہ رس نقاد ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، جس کا ثبوت ان کی تنقیدی تحریریں بجا طور پر پیش کرتی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری سے متعلق اردو کے سخت گیر نقاد کلیم الدین احمد نے جو خیالات پیش کیے ہیں وہ ان کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ کلیم صاحب اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں مجنوں گورکھپوری کی علمی بلند قامتی اور تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحیح معنوں میں نقاد وہی ہوسکتا ہے جس کے دماغ میں ہزاروں دماغوں کی صلاحیتیں یکجا ہوں۔ مجنوں پر یہ خیال صادق آتا ہے۔ ان کے دماغ میں ایک بڑے نقاد، ایک بڑے افسانہ نگار، ایک بڑے شاعر اور ادیب کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ، 1983، 269)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں مجنوں گورکھپوری بذات خود ایک فکشن نگار بھی ہیں اور انھوں نے ایک ناولٹ اور خاصی تعداد میں افسانے بھی لکھے ہیں۔ اردو کے رومانی افسانہ نگاروں میں ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اردو کے افسانوی ادب سے متعلق بھی اپنی تنقیدی آرا پیش کی ہیں جو 'افسانہ' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب کی شکل میں منصۂ شہود پر آئیں۔ علاوہ ازیں چند افسانہ نگاروں سے متعلق بھی انھوں نے اپنے دیگر تنقیدی مجموعوں میں مضامین لکھے جو اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ مجنوں گورکھپوری فکشن تنقید سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اردو فکشن کی تنقید میں ان کی کتاب 'افسانہ' خاصی اہمیت کی حامل ہے جو 1935 کی تخلیق ہے اور جس میں ان کے دو طویل مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے توسط سے انھوں نے فکشن سے متعلق اہم نکات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ ان کی نظر میں افسانے سے مراد صرف مختصر افسانہ نہیں

"مجنوں گورکھپوری اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے باریک بیں اور نکتہ رس نقاد ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کا ثبوت ان کی تنقیدی تحریریں بجا طور پر پیش کرتی ہیں۔"

ہے بلکہ وہ تمام تحریریں ہیں جو فکشن Fiction کے ذیل میں آتی ہیں۔ان میں طویل داستانیں بھی شامل ہیں اور مختصر افسانے، قصے اور حکایتیں بھی۔ بلکہ انھوں نے اردو افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے محض نثری تحریروں کو ہی افسانہ نہیں مانا ہے بلکہ ان منظوم تحریروں کو بھی افسانہ ہی سمجھا ہے جن میں افسانوی عناصر یعنی قصہ پن پایا جائے۔اس طرح انھوں نے اردو مثنویوں کو بھی فکشن ہی کے زمرے میں رکھا ہے، کیونکہ ان میں بھی پلاٹ یعنی واقعات کی منطقی ترتیب پائی جاتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے فکشن سے متعلق ایک اہم بات یہ بھی کہی ہے کہ قصہ کہنے اور سننے کی روایت کا آغاز اس لیے ہوا کہ اس کے ذریعے انسانوں کو تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا جا سکے۔اس لیے اس میں دلچسپی کے عناصر کا پایا جانا ضروری ہے۔اگر کسی افسانے میں دلچسپی کے عناصر نہ ہوں گے تو اسے کامیاب افسانہ نہیں مانا جا سکتا ہے۔وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''زائرین کنٹر بری مالک سرائے کے مشورے سے قصے کہنا صرف اس لیے شروع کیے کہ راستہ خوش وقتی کے ساتھ کٹ جائے اور تکان میں کمی رہے،لیکن ہم اس تخلیق محض کے معصوم دور سے گزر کر تخلیق وتنقید کے معقول کو سمجھ گئے ہیں۔اب ہم کسی ایسی چیز کی حقیقت کو تسلیم نہیں کر سکتے جس کا تجزیہ نہ ہو سکے اور جس پر تنقید نہ کی جا سکے۔افسانہ کو بھی اسی میزان منطق پر پورا اترنا ہے اور افسانہ نگار کو بھی اپنی حمایت میں کچھ نہ کچھ کہنا ہے،لیکن اس نکتے کو کبھی نہ بھولیے کہ افسانہ دراصل افسانہ ہے اور اس کی غایت جی بہلانا اور تکان دور کرنا ہے۔''

(افسانہ،مجنوں گورکھپوری مکتبہ ایوان اشاعت گورکھپور 1935،ص 5-6)

محولہ اقتباس سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ فکشن میں دلچسپی اور تفریح طبع کے عناصر موجود ہونا چاہیے تاکہ یہ انسان کے تھکے ہوئے ذہن اور درماندہ جسم کو راحت اور آرام پہنچا سکے۔فلسفیانہ خیالات کی پیش کش اور نقطۂ نظر کا اظہار افسانوی ادب میں دوم درجے کی چیز ہوا کرتی ہے، اس لیے ایک افسانہ نگار کو اپنے نظریے کی اشاعت پر ہی اپنا تمام تخلیقی زور صرف نہیں کر دینا چاہیے بلکہ اس کا بالخصوص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے افسانے سے اس مقصد کو حاصل کر رہا ہے کہ نہیں۔یعنی افسانے کی غایت اصلی تفریح طبع ہے اور یہی اس کا فنی امتیاز واختصاص ہے اور یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

مجنوں نے افسانے کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ان کے مطابق ایک افسانے میں چار اجزا کا ہونا ضروری ہے۔پہلا ماجرا یا ترتیب واقعات، دوسرا افراد اور کردار نگاری، تیسرا نقطۂ خیال اور چوتھا اسلوب۔انھیں چاروں اجزا کے ذریعے کوئی افسانہ وجود میں آتا ہے، جس طرح چار عناصر کے ذریعے انسان کا وجود تشکیل میں آیا ہے۔بقول چکبست ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشان ہونا

یعنی کہ مذکورہ چار اجزا کا معتدل ومتوازن انداز میں ایک افسانے میں ہونا اشد ضروری ہے،اگر ایسا نہیں ہوتا تو کوئی افسانہ افسانہ نہیں رہ پائے گا بلکہ فنی نقطۂ نظر سے اس کی موت ہو جائے گی۔اس لیے بغیر پلاٹ یا بغیر کردار کے افسانہ لکھنے کا رواج جو ایک زمانے میں عام ہوا، اسے مجنوں گورکھپوری کے نظریے کے مطابق مستحسن عمل نہیں مانا جا سکتا، کیوں کہ ایسے افسانوں میں دماغی کسرت اور فکری ورزش کے لیے تو جگہ تھی،لیکن ان میں وہ خوبیاں موجود نہ تھیں جن کا تعلق تفریح طبع سے ہے۔یہ افسانے دماغی الجھن اور جسمانی تھکاوٹ مٹانے کے بجائے دماغ کو مزید الجھن میں مبتلا کرنے اور جسم کو اور زیادہ درماندہ بنا دینے والے تھے۔

بہر حال، انھوں نے ان چاروں اجزا کے تعلق سے فرداً فرداً بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے۔وہ پلاٹ سے متعلق لکھتے ہیں:

''کسی افسانے میں سب سے پہلے جو چیز ہمارے ذہن کو اپنی طرف منتقل کرتی ہے وہ چند واقعات ہوتے ہیں جن پر اس افسانے کی بنیاد ہوتی ہے۔انھیں کی ترتیب کو ماجرا یا پلاٹ کہتے ہیں۔افسانہ اور کچھ ہو یا نہ ہو اس کو افسانہ تو ہونا ہی ہے۔اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو حالات و واردات اس میں بیان کیے جائیں عام اس سے کہ وہ فرضی ہوں یا واقعی ان کے اندر بجائے خود اتنی صلاحیت ہو کہ پڑھنے اور سننے والے کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیں۔افسانے کی کامیابی کی پہلی شرط یہی ہے۔''

(افسانہ، مجنوں گورکھپوری مکتبہ ایوان اشاعت گورکھپور، 1935،ص 7)

اس اقتباس سے پلاٹ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے پلاٹ سازی پر بھی اصولی گفتگو کی ہے، ان کا یہ کہنا درست ہے کہ ''افسانہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ جن واقعات کو وہ اپنے افسانہ کے لیے منتخب کرے وہ عوام کے لیے کوئی اجنبیت تو نہ رکھتے ہوں لیکن ان کے اندر ایک ندرت وتازگی ضرور ہو اور ان کی اہمیت مسلم ہو ورنہ جو اثر افسانہ نگار پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا نہ کر سکے گا۔اس کے یہ معنی ہوئے کہ افسانے میں واقعات کا زمانہ، ماحول اور معاشرے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔'' [ایضاً،ص 7-8)

پلاٹ کی اہمیت کے مدنظر مجنوں گورکھپوری نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ افسانے میں کس طرح کے واقعات کو جگہ دی جانی چاہیے اور ان واقعات کا بیان کس انداز میں کرنا چاہیے تاکہ افسانے کا معیار بلند ہو جائے اور فنی اعتبار سے وہ افسانہ کامیابیوں سے ہمکنار معلوم ہو۔کیونکہ یہ مرحلہ ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے اور اس مرحلے کو بہ حسن وخوبی طے کر لینے کے بعد ہی کوئی افسانہ فن کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔واقعات کے انتخاب اور ان کے بیان کے تعلق سے مجنوں گورکھپوری رقم طراز ہیں:

''افسانہ نگار کو واقعات کے انتخاب اور ان کے بیان میں بڑے تفحص اور بڑی تمیز سے کام لینا چاہیے۔ انسان کی زندگی میں ہر قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ان میں سے بعض واقعی غیر اہم اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں جن سے بڑی خوبی کے ساتھ تجاہل برتا جا سکتا ہے، لیکن بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی بادی النظر میں کوئی قدر واہمیت معلوم نہیں ہوتی مگر جو دراصل اس قدر اہم ہوتے ہیں کہ زندگی کو دور تک متاثر ومتعین کر دیتے ہیں اور ہم ان کی طرف سے ایسے غافل رہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا؟ افسانہ نگار کی نگاہ سانحات پر گہری پڑنا چاہیے۔اس کو نہ صرف ان واقعات کو لینا چاہیے جو سب کی نظر میں اہم اور مقتدر ہیں بلکہ ان واقعات کو بھی چھوڑنا نہ چاہیے جو در اصل اہم اور پرتاثیر ہوتے ہیں مگر عوام کی نگاہیں ان پر نہیں پڑتیں۔افسانہ نگار کو اس کی بھی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ جن واقعات وحالات پر افسانہ کی بنیاد ہو ان کے تمام میلانات وامکانات کو جو بالعموم نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں پڑھنے والے پر اظہر من الشمس کر دے۔'' (ایضاً،ص 9-10)

پلاٹ کے تعلق سے مجنوں گورکھپوری نے اس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ افسانے کی بنیاد چوں کہ واقعات پر ہوتی ہے، اس لیے افسانہ نگار کو واقعات کی ترتیب پر بھی خاص طور سے توجہ دینی چاہیے۔اسے واقعات کو منطقی ربط کے ساتھ اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ ان کے درمیان کسی طرح کے خلا کا احساس نہ ہو اور افسانے کے پلاٹ سے قاری حتی الوسع لطف وانبساط حاصل کر سکے۔وہ لکھتے ہیں:

''واقعات کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا خیال

رکھنا چاہیے کہ ربط وتسلسل ہاتھ سے جانے نہ پائے اور پڑھنے والا کہیں کوئی خلا محسوس نہ کرے۔افسانہ کی ترتیب میں اگر ایسا توازن و تناسب نہ ہوا تو پڑھنے والے کی طبیعت بدمزہ ہو جائے گی۔افسانہ نگار کواس کا خیال رکھنا ہے کہ کہیں سے یہ احساس پیدا نہ ہونے پائے کہ واقعات کی ترتیب میں کسی قسم کی زبردستی کو راہ دی جارہی ہے۔ہر واقعے کا ذکر ٹھیک وقت اور ٹھیک موقع سے ہونا چاہیے اور مختلف واقعات کے درمیان ایک لازمی نسبت قائم کر دینا چاہیے۔" (ایضاً،ص 14-13)

پلاٹ کے سلسلے میں مجنوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے کے فن پر وہ عمیق نظر رکھتے ہیں۔

افسانے کا دوسرا جزو افراد اور کردار نگاری ہے اور افسانے میں اس کی اہمیت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔افسانے کے ارتقائی سفر پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد ہی اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ افسانے میں داخلی کیفیت پیدا ہوتی گئی جس کے باعث پلاٹ پر انسان کی شخصیت حاوی ہوتی گئی اور یہی وجہ ہے کہ افسانے میں کردار نگاری کو لازمی تصور کیا جانے لگا۔مجنوں گورکھپوری نے اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ افسانے میں کردار نگاری کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ وہ اس کے قائل ہیں کہ افسانہ نگار کو اپنے افسانے میں ایسے کردار خلق کرنے چاہئیں جن میں واقعیت پائی جائے اور جو قاری کے فہم وادراک کے مطابق ہوں تا کہ وہ ان سے ذہنی وابستگی قائم کرنے میں کسی طرح کی دقت محسوس نہ کرے۔

مجنوں اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"شخصیت اور کردار کی اہمیت کو تسلیم کر لینے کے بعد اب ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کردار نگاری کس قسم کی ہونی چاہیے اور اس کے شرائط کیا ہیں۔سب سے پہلے افسانہ نگار کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ اپنے افراد کو کس حد تک واقعی بنا سکا ہے اور وہ کہاں تک پڑھنے والے کی سمجھ میں آتے ہیں... اب انسانیت اور مدنیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو افراد کسی افسانے میں پیش کیے جائیں وہ ہماری آپ کی طرح اسی دنیا کے انسان ہوں اور اسی گوشت پوست کے انسان ہوں۔اب رجال داستان عجیب الخلقت ہوئے تو ہم ان کو زیادہ دلچسپ نہیں پائیں گے۔افسانہ کے اشخاص کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص ان کو اپنا ہی سا پائے۔اگر افراد قصہ انوکھے ہوئے اور بجائے پاؤں کے سر کے بل کھڑے نظر آئے تو ہم کو ان سے کوئی موانست

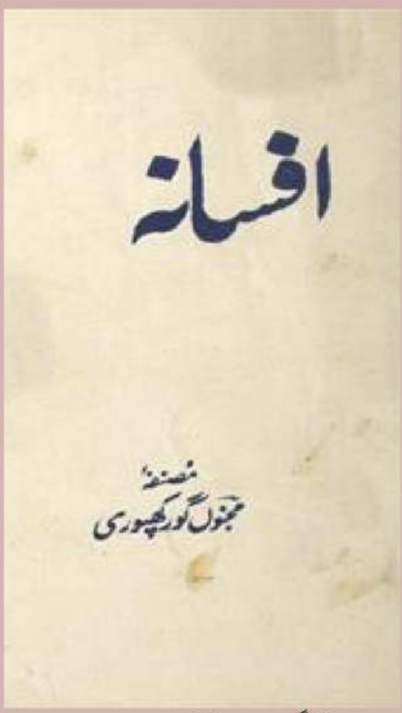

پیدا نہ ہو سکے گی۔افسانہ کے کردار جتنا ہی زیادہ ہم سے قریب ہوں گے اتنا ہی زیادہ ہم ان کو واقعی سمجھیں گے اور اتنا ہی زیادہ ان سے اثر قبول کریں گے۔" (ایضاً،ص 24-26)

مجنوں گورکھپوری کے مطابق افسانے کا تیسرا لازمی جزو نقطۂ خیال ہے۔وہ اس سے متعلق لکھتے ہیں:

"افسانے کا موضوع چوں کہ حیات انسانی ہے اس لیے ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ جس زندگی کو افسانہ نگار پیش کر رہا ہے اس کے متعلق اس کی اپنی کیا رائے ہے۔ظاہر ہے کہ افسانہ نگار غیر ذی شعور آلہ نہیں ہوتا۔زندگی کے متعلق اس کے اپنے کچھ خیالات ہوں گے جن کا عکس اس کے افسانے میں نظر آئے گا... افسانے کی بنیاد محض تجربات و واقعات پر نہیں ہوتی۔افسانے کی اصل جان وہ رائے ہوتی ہے جو افسانہ نگار ان واقعات و تجربات کے متعلق رکھتا ہے۔یہ واضح رہنا چاہیے کہ افسانے کا کام صرف زندگی کی نقل اتارنا نہیں ہے بلکہ اس کو از سر نو پیدا کرنا ہے۔"

(ایضاً،ص 38)

یہ اقتباس اس نکتے کی وضاحت کرتا ہے کہ افسانے میں کسی افسانہ نگار کی زندگی سے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار ہونا چاہیے لیکن یہ اظہار محض نقل کی صورت میں نہ ہو بلکہ اس میں اس کا اپنا وژن Vision بھی منعکس ہونا چاہیے۔کسی بھی فن کار کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ حیات و کائنات کی محض نقالی نہیں کرتا بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ ترمیم واضافہ کرتا ہے جس کے باعث اس میں تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

افسانے کا آخری جزو اسلوب ہے اور اس کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے اسلوب کے ذیل میں زبان، لب و لہجہ، سوز وگداز اور طنز و تمسخر سبھی کچھ آتے ہیں۔مجنوں گورکھپوری اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسانے کی کامیابی کا راز اسلوب ہی میں مضمر ہوتا ہے۔اس لیے کہ واقعات کی ترتیب ہو یا افراد کی کردار نگاری یا کسی نقطۂ خیال کی اشاعت کے لیے کوئی دلکش پیرایہ اختیار نہیں کیا جائے گا تو کسی پر کوئی اثر نہ ہوگا۔" (ایضاً،ص 51-50)

افسانوی تخلیق میں اسلوب یا طرز کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

"دنیا کے جس بڑے افسانہ نگار کا مطالعہ کیجیے آپ کو اس کے اندر اور کوئی بات ملے یا نہ ملے ایک بات ضرور ہی ملے گی۔وہ صاحب طرز ضرور ہوگا۔ورنہ ادبی افسانہ کی تاریخ میں اس کو کوئی جگہ نہیں دی جائے گی۔اور بعض افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز یہی ہوتا ہے۔"

(ایضاً،ص 52-51)

محولہ بالا اقتباس سے افسانے میں اسلوب یا طرز کی اہمیت بہ حسن وخوبی واضح ہو جاتی ہے۔عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو کے بھی جتنے افسانہ نگار ہوئے ہیں وہ اپنی طرز تحریر اور اسلوب نگارش کے نقطۂ نظر سے بھی انفرادی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔اس سے یہ شق ابھرتی ہے کہ افسانے میں طرز یا اسلوب بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے اور اس کے ذریعے ہی کسی افسانہ نگار کا اختصاص و انفراد قائم ہوتا ہے اور وہ امتیازی شناخت کا حامل بنتا ہے۔

الختصر یہ کہ مجنوں گورکھپوری نے فکشن کے تعلق سے جو باتیں کی ہیں وہ اصولی نوعیت کی ہیں۔ان باتوں سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور ذی شعور نقاد تھے۔اس کے باوجود یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی نقاد کی تمام آرا سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کے دلائل سے اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ اس کی تنقید کا معیار کتنا بلند یا پست ہے۔

■

Dr. Zafrullah Ansari
Assistant Professor, Dept of Urdu
Allahabad University
Prayagraj - 211002 (UP)
Mob.: 8853579247
Email:zafrullahansari@gmail.come

حکیم مومن خاں مومن کے فارسی خطوط کا
تنقیدی جائزہ

نیلوفر حفیظ

حکیم مومن خان مومن ایک همه گیر اور همه جهت شخصیت کے مالک تھے اپنے عهد کے تقریباً تمام مروجه علوم وفنون پر ان کو دسترس حاصل تھی انھوں نے اردو اور فارسی دونوں هی زبانوں کو اپنے احساسات دروں اور جذبات صادقانه کی ترجمانی کا وسیله بنایا۔

خط فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نشان، لکیر، فرمان، مکتوب اور پیغام وغیرہ کے ہوتے ہیں عموماً دولوگوں کے درمیان ہونے والی تحریری گفتگو کو خط کہا جاتا ہے خطوط نویسی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس فن کی تاریخ اس قدر قدیم اور کہنہ ہے کہ بعض مواقع پر تو ہمارے محققین ومورخین کی دوررس نگاہیں بھی اس کا احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال قبل خطوط نویسی کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن افسوس کہ پختہ اور حتمی ثبوت ہماری دسترس میں نہ ہونے کے سبب وثوق کے ساتھ کوئی بھی رائے قائم کرنا قدرے دشوار محسوس ہوتا ہے البتہ اگر فارسی زبان وادب میں خطوط نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قدیم ایران کی تاریخ کے جو خطوط آج ہماری دسترس میں ہیں وہ ایران کے مشہور ومعروف ساسانی بادشاہ نوشیروان عادل کے زمانے میں تحریر کیے گئے تھے بعد میں انھیں تمام خطوط کو 'توقیعات' کے نام سے یکجا کر دیا گیا جو آج بھی ہماری دسترس میں ہیں اور فارسی ادب کا قیمتی سرمایہ تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ فارسی خطوط کے اولین نقوش کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد سے ہی اس فن کی با قاعدہ اور باضابطہ شروعات ہوئی اور فارسی زبان میں خطوط نویسی کا یہ سلسلہ نسل در نسل منتقل ہوتا چلا گیا نہ صرف یہ کہ ایرانی بادشاہوں نے اعلیٰ ترین خطوط لکھے ہیں بلکہ ہر خاص وعام میں یہ افادی فن اپنے تمام تر لوازمات اور طمطراق کے ساتھ رائج رہا ہے اور ایران پر عربوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد تو اس فن نے عام وخاص کے درمیان مزید وسعت، کشادگی اور مقبولیت حاصل کی اور مختلف ادوار میں تاریخی، ادبی اور سیاسی اعتبار سے بے پناہ اہمیت کے حامل خطوط مسلسل منظر عام پر آتے چلے گئے جو تا عصر حاضر بھی مورخین ومحققین کے لیے مورد استفادہ اور قابل تفکر نظر آتے ہیں۔

کشور ہندوستان کی فارسی زبان وادب کی تاریخ میں جب بھی فارسی خطوط نویسی کا ذکر کیا جاتا ہے تو مرزا غالب کے بعد حکیم مومن خان مومن کا نام سرفہرست نظر آتا ہے اس دانشور عالی نے فن مکتوب نگاری کو جو عروج اور رونق عطا کی وہ ہمارے ملک کے فارسی داں طبقے سے پوشیدہ نہیں ہے۔

حکیم مومن خان مومن ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اپنے عہد کے تقریباً تمام مروجہ علوم وفنون پر ان کو دسترس حاصل تھی انھوں نے اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں کو اپنے احساسات دروں اور جذبات صادقانہ کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا حالانکہ مومن کو زیادہ تر لوگ اردو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب پر بھی پوری دسترس حاصل تھی گو کہ انھوں نے مرزا غالب کی طرح اپنی فارسی دانی کی غیر معمولی صلاحیتوں کو اپنے لیے کبھی باعث فخر اور نشان عالی تو تصور نہیں کیا ہے اور غالباً یہ ان کی طبیعت کی بے پناہ سادگی اور انکساری ہی تھی کہ فارسی زبان کا بڑا ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی دعوائے یکتائی نہیں کیا بلکہ اس معاملے میں ہمیشہ میانہ روی اور عاجزی اختیار کی ان کی فارسی دانی کا لوہا بڑے بڑے اساتذۂ فن نے مانا ہے اور ان کو فارسی کا ایک عظیم شاعر اور نثر نویس گردانا ہے شواہد سے تو یہاں تک ثابت ہوتا ہے کہ خود اہل زبان بھی ان کی غیر معمولی فارسی دانی کی صلاحیتوں کے سبب ان کو ایرانی سمجھتے تھے اور ان کی قدر ومنزلت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے اس سلسلے میں عبدالغفور نساخ لکھتے ہیں:

"مومن کو فارسی میں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ اہل ایران ان کو ایرانی سمجھتے تھے"[1]

مومن کی بے پناہ فارسی صلاحیتوں کی اہمیت وارزش کو ہر دور میں خراج تحسین پیش کیا جاتا رہا ہے اور صرف ان کے معاصرین ہی نہیں بلکہ متاخرین نے بھی ان کو دنیائے فارسی کا ایک عظیم شہہ سوار قرار دیا ہے 'مومن شخصیت اور فن' کے مصنف نے اردو کے ساتھ ساتھ ان کی فارسی خدمات کا بھی گہرائی و گیرائی سے مطالعہ ومحاسبہ کیا ہے اور ان کو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی نظم ونثر کا بھی ایک استاد بزرگ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"وہ جہاں اردو کے ایک بلند پایہ شاعر تصور کیے جاتے ہیں وہاں فارسی میں بھی ان کے استادانہ کمال سے انکار کرنا غیر ممکن ہے جس کے ثبوت میں فارسی دیوان مومن اور انشائے مومن دو شاہد عادل پیش کیے جاسکتے ہیں۔"[2]

مومن خان مومن کے اردو دیوان کے ساتھ ساتھ ان کا فارسی دیوان بھی ان کے پھوپھی زاد بھائی اور دہلی کی قدآور شخصیت سمجھے جانے والے شاہی طبیب جناب حکیم احسن اللہ خاں نے ترتیب دیا تھا اس کے علاوہ حکیم مومن خان مومن کے فارسی خطوط اور تقویموں کے دیباچوں وغیرہ کو بھی 'انشائے مومن' کے عنوان سے احسن اللہ خاں نے ہی مرتب کیا اور عام لوگوں کی دسترس میں پہنچایا اور اسی مرتب شدہ خطوط کو بعد میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بڑی محنت ومشقت کے بعد اردو ترجمے کے ساتھ کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے جس کو عام وخاص میں خصوصی مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوئی اور ان کی مومن خان مومن کے لیے اختیار کی گئیں مساعی جمیلہ کو خوب خوب سراہا گیا آقائے ظہیر احمد نے بھی مومن خان کو فارسی زبان کا ایک بڑا شاعر اور نثر نویس قرار دیا ہے اور مختلف شواہد کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ فارسی دانی کے معاملے میں ان کا مرتبہ کسی ایرانی شاعر اور ادیب سے کمتر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے ان کے فارسی خطوط کی اہمیت وارزش پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"فارسی انشا پردازی کا جو دور ہندوستان میں ظہوری، فیضی اور نعمت خاں عالی سے شروع ہوا تھا وہ غالب اور مومن پر ختم ہو گیا یہ درست ہے کہ مومن کی نثر سرتا پا رنگینی سے معمور اور تصنع سے بھرپور ہے لیکن اس میں بھی انھوں نے اپنی طباعی اور نکتہ سنجی سے وہ انفرادیت پیدا کی ہے کہ ہر اہل نظر کو ایمان لانا پڑتا ہے علمی اصطلاحات، مشکل تلمیحات، نازک استعارات اور نادر تشبیہات نے اس کی نثر کو گنجینہ معنی کا ایک طلسم بنا دیا ہے اس میں بلا ارادہ مصنف کی ذات اور ماحول کی نسبت کچھ ایسے اشارے بھی آ گئے ہیں جن سے ہمیں اس عہد کی معاشرت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے"[3]

مومن خان کی فارسی نثر انشا پردازی کا ایک اعلیٰ نمونہ اور منہ بولتا ثبوت یہ ہے ان کی تحریروں میں وہ اثر آفرینی اور سحر بیانی ہے جس کی وجہ سے ہر بار پڑھنے سے کوئی نہ کوئی نکتہ روشن ہو کر اذہان وقلوب کو جلا بخشتا ہے ان کے خطوط اعلیٰ فارسی نثر کا بہترین نمونہ کہے جاسکتے ہیں ان کے بیشتر خطوط (کچھ کو چھوڑ کر جو انھوں نے بعض ایسے عزیزوں اور دوستوں کو لکھے ہیں جو فارسی زبان وادب سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتے تھے ان کی فارسی کم فہمی اور کم علمی کے سبب انھوں نے ان کو سادہ اور سلیس انداز میں خط لکھے ہیں) ان کی فارسی دانی کا منہ بولتا ثبوت ہیں انھوں نے خط لکھتے وقت عبارت آرائی اور مشکل بیانی کو بروئے کار لانے میں کوئی تردد نہیں کیا ہے اور یہ مشکل بیانی اور عبارت آرائی ان کے دور کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس عہد میں کشور ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا سورج اپنے عروج کی انتہائی منازل کو طے کر چکا تھا فارسی داں طبقہ سبک ہندی میں طبع آزمائی کرتے ہوئے مسلسل ترقی کے راستے پر گامزن تھا اور بہترین ادبی فارسی اور اشارے کنایوں کی زبان استعمال کرنا ہی شاعر یا مصنف کی ذہانت وذکاوت کا ثبوت ہوتا تھا، تمام تر حالات کی نامساعدی اور ناسازگاری اور دشمنوں کی حیلہ پروری وسازشوں کے باوجود بھی لوگ ابھی بھی فارسی زبان کو ہی زیادہ قابل اعتنا تصور کرتے تھے یہی سبب ہے کہ عہد مومن میں مشکل پسندی کا رجحان بہت زیادہ بڑھ چکا تھا اور زیادہ تر شعرا وادبا تازہ گوئی اور معانی آفرینی کی طرف اپنی توجہ مبذول کیے ہوئے تھے ظاہر ہے مومن بھی اپنے زمانے کے عام رجحان سے مستثنیٰ کیسے رہ سکتے تھے لہٰذا انھوں نے وہی رجحان اپنایا جو اس وقت مستعمل تھا اور بلاشبہ وہ اس میں معاصرین میں سبقت لے گئے ہیں۔

حکیم مومن خان کے خطوط کی سب سے بڑی انفرادیت اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زیادہ تر فارسی خطوط میں علم طب اور علم نجوم وغیرہ کی اصطلاحات کو بڑی روانی اور فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے جو ان کا سا انداز ان کے معاصرین نثر نگاروں اور شاعروں کی تحریروں میں کسی اور کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے ہمارا یہ یگانہ عصر فنکار علم طب اور علم نجوم میں ہی مہارت نہیں رکھتا تھا بلکہ فن موسیقی اور علم فلکیات پر بھی گہری دسترس تھی اس کے علاوہ وہ اپنے عہد کے شطرنج کے کھلاڑیوں میں بھی سب سے بلند درجہ رکھتے تھے اس کے ساتھ بھی اور نہ جانے کون کون سے علوم وفنون تھے جن سے حکیم مومن خان کو بڑی گہری واقفیت اور دلچسپی تھی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان سب علوم وفنون سے گہری آگاہی کا اظہار ان کی فارسی تحریروں میں بڑی شدت کے ساتھ کیا گیا ہے جس کے سبب زمانہ دراز تک ان کی فارسی تحریریں عام فہم لوگوں کے لیے چیستاں بنی رہیں اور عام وخاص کی عدم توجہی کے سبب ان کی زندگی میں فارسی خطوط وشاعری کو وہ قبول عام حاصل نہیں ہو سکا جو ان کی اردو شعر وشاعری کو حاصل ہو گیا تھا کیونکہ ان کے فارسی خطوط کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو فارسی زبان وادب سے کما حقہ واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اس عہد میں رائج مختلف علوم وفنون کے متعلق بھی جانکاری رکھتے ہوں ان کے اس مشکل اور پیچیدہ اسلوب نگارش کی وجہ سے عام فہم اور سہل پسند لوگ عرصہ دراز تک ان کے اس انفرادی وعظیم ادبی کارنامے سے واقفیت ہی حاصل نہیں کر سکے اور اگر اس کے متعلق کوئی بات کی بھی گئی تو بات چند سطروں سے متجاوز نہ ہو سکی:

"اسی طرح بعض خطوط میں طب اور نجوم کی اصطلاحیں ایسی برمحل استعمال کی ہیں کہ وقائع نعمت خان کا اسلوب نگاہوں میں پھر جاتا ہے"[4]

جیسا کہ قبلاً ذکر کیا گیا کہ مومن کے فارسی خطوط کو بہت زیادہ قبول عام نہیں مل سکا ایک تو ان کے مشکل انداز بیان کے سبب دوسرا یہ کہ بعض دانشوروں کا ماننا ہے کہ ان کے خطوط میں ان کی ذاتی زندگی اور معاشرتی حالات کی تلاش صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے ان خطوط میں اپنی ذاتی زندگی اور اپنے معاشرے کے متعلق کوئی خاص معلومات بہم نہیں پہنچائی ہیں کیونکہ ان خطوط کو لکھنے سے ان کا مقصد اپنے معاصرین کے درمیان اپنی بے پناہ فارسی دانی کا اظہار کرنا مقصود تھا تاریخی یا سماجی صداقتوں کو منظر عام پر لانا نہیں تھا پروفیسر نذیر احمد مکاتیب مومن کے متعلق لکھتے ہیں:

"مومن کے خطوط سے ان کے حالات زندگی اور شخصیت وغیرہ پر بہت زیادہ روشنی نہیں پڑتی ہے کیونکہ وہ زیادہ تر محمد شاہی طرز میں لکھے گئے ہیں اور عبارت آرائی، مشکل پسندی اور غیر معمولی تصنع سے بھرپور ہیں"[5]

مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں مومن کے خطوط کے متعلق حتمی طور پر یہ نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ان خطوط میں اپنے عہد کی عکاسی نہیں کی ہے بھلے ہی انھوں نے شعوری طور پر اس طرف توجہ نہ کی ہو

البتہ لاشعوری طور پر ان کے خطوط میں ان کی ذاتی زندگی اور سماجی حالات کا ذکر جا بجا موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ مومن کے بعض خطوط تو ان کی ذاتی زندگی کی بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں ذیل میں ان کے خطوط سے کچھ اقتباس نقل کیے جا رہے ہیں جو ان کی ذاتی زندگی کے متعلق معلومات یکجا کرنے میں بڑے معاون ثابت ہوسکتے ہیں ان کے متعدد فارسی خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کو بھی دیگر لوگوں کی طرح زندگی کے بے شمار نشیب وفراز سے سابقہ پڑا اور بہت سے تلخ وتند حالات سے گزرنا پڑا لیکن ان کی وضع داری اور خاندانی شرافت نے کبھی ان کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ زندگی کے مسائل ومصائب کی تاب نہ لا کر واویلا کریں ان کو تنگدستی، مفلسی اور غربت کے کوہ گراں کا بار اپنے ناتواں شانوں پر اٹھانا پڑا حالانکہ والدہ کی طرف سے ان کو تھوڑی بہت زمین وراثت میں ملی تھی البتہ اپنوں وبیگانوں کی سازشوں نے وہ بھی ان سے چھین لی جس کے بعد وہ زبردست مالی مصائب میں گرفتار ہوگئے اپنے ایک خط میں احسن اللہ خان کو اپنی مالی پریشانیوں اور دلی کیفیات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زمانے کی ناقدری اور ناقہمی کے باعث کوئی میرا خریدار نہیں ہے اور میرے آبدار موتیوں کا بازار تاریکی میں بھی مندا ہے، میرا بسامان جو بند پڑا ہے اس پر کساد بازاری کی گرد اس قدر بیٹھ گئی ہے کہ طوفان نوح سے بھی نہیں دھل سکتی اور میرے آئینہ پر کسمپرسی کی زنگار اس قدر جم گئی ہے کہ صرصر کا غبار بھی اس کو جلا نہیں سکتا میرے یوسف مراد کلام کو بڑھیا کے سوت کی انٹی کے بدلے بھی لوگ نہیں خریدتے اور اس کو چاہ کنعاں سے کھوٹے سکوں کی عوض بھی نہیں نکالتے، ید بیضا کے معجزے کے باوجود میں خالی ہاتھ ہوں اور دم عیسیٰ کے ہوتے ہوئے بیماری میں مبتلا ہوں۔ سامری کیش میرے صحیفہ کمال کو پسند نہیں کرتے خواہ قلم قدرت کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو۔ اس کے برخلاف نااہلوں کو جو عجلاً جسدً الہ خوار کے مصداق ہیں سونے میں تولتے ہیں۔ میری موشگافی فرعون کے موتیوں میں پروئی ہوئی داڑھی پر رشک کرتی ہے اور میری باریک بینی سرمہ شداد کی حسرت میں اشک خون برساتی ہے اس ناقدری کے باوجود میں نے کبھی ہنر کی آبرو نہیں بیچی اور امراء کی آستین سے توقعات وابستہ نہیں کیں۔ میں نے جو کی روٹی پر قناعت کی اور آسمان کی خوشہ گندم پر کبھی نظر نہیں ڈالی۔ میری خرقہ پوشی کبھی آسمان کے اطلس کی طرف راغب نہیں ہوتی اور میری خاک نشینی ذات الکرسی (ستاروں کی ایک شکل جو کرسی نشین عورت سے مشابہ ہے) کا سہارا نہیں لیتی لیکن کیا کیا جائے، اگر نا انصاف دنیا یہ بھی نہ دیکھ سکے اور ناقدری زمانہ بستر خاک سے بھی ایک درجہ نیچے بٹھائے ایک نیا ظلم جو پرانے دشمن مراد آسمان نے کیا یہ ہے کہ تھوڑی سی زمین جو مجھے والدہ سے ورثہ میں ملی تھی وہ بھی زبردستی چھین لی۔''[6]

مومن خان مومن اپنے عہد کے ایک بارسوخ، غیرت مند اور خوددار گھرانے کے چشم وچراغ تھے ان کی خاندانی شرافت، غیور طبیعت اور خوددارانہ مزاج نے کبھی کسی کے در پر ناصیہ فرسائی کا گناہ گوارا نہیں کیا حالانکہ ان کو انگریزوں کی طرف سے کئی بار ان کا ندیم خاص بننے کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے ہر بار اس کو مسترد کر دیا کیونکہ وہ ایسی کوئی بھی ملازمت اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے جو ان کے مزاج اور طبیعت کے موافق نہ ہو یہی سبب تھا کہ ان کو طویل وقت تک مالی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا چونکہ آمدنی کا کوئی مضبوط وسیلہ ان کے پاس نہیں تھا لہٰذا اکثر ان کو مقروض بھی ہونا پڑتا تھا حالانکہ وہ مالی لحاظ سے ایک خوشحال متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی خاندانی پنشن ایک ہزار روپے سالانہ تھی لیکن انگریزی حکومت کی حیلہ پروری اور مکاری کے سبب وہ پنشن بھی ان کو پوری یا وقت پر نہیں ملتی تھی جس کے سبب وہ اکثر مالی مسائل کا سامنا کرنے پر مجبور رہتے تھے اپنی تنگدستی اور مالی پریشانیوں کا شکوہ ان کے کئی فارسی خطوط میں بڑے واضح انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے ان کے فارسی خطوط کے مجموعے میں بہت سے ایسے شواہد ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ پریشانی اور مالی مسائل کو فرو کرنے میں گزارا اور بعض اوقات تو ایسے مواقع بھی آئے کہ ان کی عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی اور ان کو اپنوں وبیگانوں کے سامنے شرمندہ بھی ہونا پڑا۔ ذیل میں ان کے ایک خط کی چند سطور نقل کی جا رہی ہیں جن کو پڑھ کر با آسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مومن خان کی تنگدستی اور غربت نے ایک دو بار نہیں بلکہ متعدد مرتبہ ان کی عزت نفس کو سر بازار رسوا اور ذلیل کیا اور ان کو اپنی بے عزتی اور رسوائی کو زندگی کے ایک تلخ گھونٹ کی طرح برداشت کرنا پڑا:

''ایک بقال جس سے نان ونمک زر سالانہ کے وعدے پر لیا تھا اس سے وعدہ پختہ تھا کہ زر سالانہ وصول ہونے والا ہے رقم ادا ہو جائے گی، اس کے تقاضے پر میں سختی سے ڈانٹا اور گالیاں دیں، وہ بھی لپٹ پڑا اور عزت آبرو پر ہاتھ ڈالا چیخ پکار بلند ہوئی اور بال بھی کھینچا تانی میں آئے''[7]

مومن خان کو بھی اپنے عہد کے دیگر شاعروں اور ادیبوں کی طرح ہمیشہ اس بات کا شکوہ رہا کہ اہل زمانہ نے ان کے ہنر وکمال کے مطابق ان کی قدر افزائی نہیں کی اور فلک کج رفتار نے ہمیشہ ان پر پریشانیوں کے کوہ گراں کو مسلط رکھا حتیٰ کہ ان کی ازدواجی زندگی میں بھی ان کو بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ان کی پہلی شادی 1823 میں ہوئی تھی لیکن افسوس کہ ان کی بیوی ان کی مزاج آشنا اور ہمدرد ثابت نہیں ہوسکی اور دونوں میں ہمیشہ ان بن رہی اور آخر کار دونوں میں علیحدگی ہوگئی اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک عزیز بنام غلام ضامن کو خط لکھ کر اپنی قسمت کی نارسائی اور ناکام ازدواجی زندگی کا ذکر کیا ہے اور اس برائے نام رشتے کے ختم ہو جانے پر خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ خدا کا بڑا کرم اور احسان ہے کہ انھیں اپنی بد دماغ بیوی اور اس کے جاہل خاندان سے نجات حاصل ہوگئی وہ اس خط میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس رشتے کو چلانے کے لیے ان کو سخت ترین آزمائشوں اور ذہنی اذیتوں سے گذرنا پڑا اور اس برائے نام رشتے کو چلانے کی ان کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''خدا لگتی کہنا۔ مومن کا جہنم میں جا پڑنا خوشی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ گاؤں گاؤں ذلت وخواری اٹھا کر دنیا میں کوئی مشہور نہیں ہوتا۔ میں نے دو تین مہینے نادانی اور سادہ دلی سے نااہلوں کے ساتھ نباہنے کی غلطی کی تھی جس پر سب سے ملامت اور نفرین سنی پڑی اب جبکہ میں فارغ البال اور خوش حال ہوں خدا نہ کرے کہ پھر اپنے آپ کو مصیبت میں پھنساؤں اور نادانوں کی مجلس میں شریک ہوں... چونکہ میں نینابکار جاہلوں سے تکلیف اٹھائی ہے اور بداطوار گنواروں سے رشتہ کرنے میں مصیبتیں جھیلی ہیں اس لیے ارادہ ہے کہ کسی عالی خاندان سے قرابت کروں۔''[8]

مذکورہ بالا خطوط کے اقتباس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مومن کے یہاں متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے ان کی زندگی سے متعلق خاصی اہم اور بیش قیمت معلومات فراہم ہوتی ہیں جو تفہیم مومن میں ہماری بڑی مددگار ثابت ہوسکتی ہیں محض یہ کہہ کر گزر جانا کہ مومن کی ذاتی اور معاشرتی زندگی کے متعلق یہ خطوط ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے ہیں کسی بھی طور پر درست قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے خطوط کے مجموعے کے سرسری مطالعے سے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں اپنے عہد اور اپنی زندگی کے متعلق واضح نظریات موجود تھے لہٰذا ان کے بہت سے ایسے خطوط مل جاتے ہیں جو ان کی ذاتی زندگی کے متعلق بہت ہی اہم اور خاص

جانکاری فراہم کرتے ہیں اور جن کا ذکر ان کے عہد کی کسی بھی تاریخی کتاب اور تذکرے وغیرہ میں نہیں کیا گیا ہے لیکن طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے خطوطِ مومن کا مطالعہ کرنے والے لوگ ان کے ان خطوط سے ان کی ذاتی زندگی کے متعلق عمدہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں حالانکہ مومن خان کے خطوط کے مطالعے سے سے یہ اندازہ تو ضرور ہوجاتا ہے کہ ان خطوط سے ان کا مقصد آپ بیتی یا کوئی سرگذشت لکھنے کا ہرگز بھی نہیں تھا وہ صرف اپنے عزیز واحباب اور دوستوں وشاگردوں وغیرہ کو یہ خطوط لکھتے اور اپنے محسوسات وجذبات کو قلم وقرطاس کے سپرد کر دیتے تھے

حکیم مومن خان مومن نے بھلے ہی شعوری طور پر اپنے دور کے حالات پر خامہ فرسائی کرنے کی کوشش نہ کی ہو اس کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ان خطوط میں اپنے عہد کی سماجی اور ذاتی زندگی کے متعلق اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اس عہد کی تاریخ کو جاننے کے لیے خاصا اہم مواد ہماری دسترس میں آجاتا ہے اور یہ سب کچھ انھوں نے اس خوبصورت اور دلکش انداز سے لکھا ہے کہ اگر ان کے خطوط میں موجود مواد کو سلیقے اور سنجیدہ طریقے سے تشکیل وترتیب دیا جائے تو بلاشبہ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ان کے خطوط میں موجود بیش قیمت مواد کی مدد سے مومن خان مومن کی نہ صرف آپ بیتی تیار کی جاسکتی ہے بلکہ اس عہد کے سماجی حالات کو جاننے وسمجھنے کا بھی بڑا ذخیرہ فراہم ہونے میں ہماری خاصی مدد ہوسکتی ہے جو تفہیم مومن اور عہدِ مومن میں کلیدی اہمیت کی حامل ثابت ہوگی یہی سبب ہے کہ زیادہ تر دانشور اس بات پر متفق الرائے نظر بھی آتے ہیں کہ خطوطِ مومن کی مدد سے ان کے عہد اور خود ان کی زندگی کے بارے میں قدرے سودمند اور منفعت بخش اطلاعات فراہم کی جاسکتی ہیں میں یہاں صرف ایک دانشور آقائے کبیر احمد جائسی کی رائے کو نقل کر رہی ہوں اس دور اندیش اور ذی فہم دانشور نے مومن خان مومن کی فارسی نثر نویسی کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے عہد غالب کی تاریخ کو جاننے کا ایک اہم اور بڑا ماخذ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں:

''مومن کی فارسی نثر نگاری ہمارے عمیق مطالعے کی مستحق ہے یہ مطالعہ صرف مومن کی ادبی کاوشوں ہی کی تفہیم کے لیے مفید ومعاون نہ ہوگا بلکہ عصر غالب کے ادبی رجحان کا عرفان حاصل کرنے کا بھی وسیلہ بنے گا''[9]

جیسا کہ قبلاً بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ان کے یہاں بعض مواقع پر بہت زیادہ مشکل پسندی کو بروئے کار لایا گیا ہے جس کے سبب عام فہم فارسی داں طبقہ ان سے بھرپور طریقے سے مستفیض نہیں ہوسکا ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں آیات قرآنی کا خوب استعمال کیا ہے اور اتنے سلیقے وقرینے سے ان کو بروئے کار لایا گیا ہے کہ ان کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا حالانکہ بعض دانشوران ادب کا کہنا ہے کہ مومن نے اپنی نثر کو بہت مسجع ومقفیٰ اور عربی آمیز بنا کر یہ ثابت کرنے کی سعی تمام کی ہے کہ فارسی دانی میں ان کا مرتبہ معاصرین میں کسی سے بھی کم تر نہیں ہے جیسا کہ جناب رشید حسن خان نے خطوطِ مومن میں ان کے علم وفضل کے بے دریغ اظہار کے متعلق اپنی آرا کو قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس مشکل پسندی اور مغلق نویسی کے پیچھے جذبہ وہی کارفرما ہے یعنی فارسی دانی اور انشاپردازی کی نمود... وہ بار بار یہ جتانا چاہتے ہیں کہ طاہر وحید اور ظہوری ونعمت خان عالی کے انداز میں لکھنا تو مجھے بھی آتا ہے وہ ان خطوط کے واسطے سے اپنی علمیت اور کمال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں... اس زمانے میں فارسی کے باکمال کی حیثیت سے دہلی کے علمی حلقوں میں جو منزلت مرزا غالب اور مولانا صہبائی کو حاصل تھی وہ ان کے حصے میں نہیں آسکی تھی اس کا شدید احساس ان کی فارسی تحریروں میں نمایاں ہے اپنے آپ کو منوانے کا احساس ان کے یہاں مشکل پسندی اور غرابت پسندی کے عنصر کو بڑھاتا رہا''[10]

حکیم مومن خان مومن کے یہ فارسی خطوط صرف ہمارے محققین اور مورخین ہی کے لیے لائق توجہ قرار نہیں دیے جاسکتے ہیں بلکہ دیگر علوم سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے لیے بھی یہ خطوط یکساں اہمیت وافادیت کے حامل ہیں خاص طور پر سماجیات وغیرہ جیسے موضوعات سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کے لیے یہ خطوط خصوصی غور وفکر کے طالب ہیں آقائے کبیر احمد جائسی مکاتیب مومن کی اہمیت وارزش کے متعلق اظہار نظر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس سلسلے میں ان تقویموں کے وہ حصے خاص طور سے سماجیات کے طالب علموں کے لیے قابل مطالعہ ہیں جن میں مومن نے یہ حکم لگایا ہے کہ اس سال جنسی کج روی کا فلاں طریقہ ترقی کرے گا اور یہ کجروی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی مومن کا کوئی دیباچہ اس طرح کے احکام سے خالی نہیں اس طرح مومن کی فارسی نثر کا مطالعہ صرف ادب کے طالب علموں ہی کو نہیں بلکہ تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کو بھی دعوتِ نظر دیتا ہے''[11]

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطوطِ مومن انسانی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں انھوں نے اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو بیان کرنے میں جس انداز بیاں کو اختیار کیا ہے وہ ان کا بے پناہ علمی تبحر ہی ہے انھوں نے اپنے فارسی خطوط میں عبارت آرائی کا خاصا اہتمام کیا ہے جو بعض اوقات قاری کے ذہن کو بوجھل بھی بنا دیتی ہے بعض اوقات تو ان کی نثر حد سے زیادہ مسجع ومقفیٰ، پرتصنع وپرتکلف اور مصنوعی حسن کی چہار دیواری میں قید نظر آتی ہے جس میں سادگی وسلاست کا فقدان ہے بایں ہمہ ان کی ادبی، تاریخی اور سماجی اہمیت وارزش کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ابھی تک ان کے تمام فارسی خطوط منظر عام پر نہیں آسکے ہیں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اس سلسلے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان کے بعض اہم خطوط کا ہی ترجمہ کر کے منظر عام پر لایا گیا ہے اگر ان کے خطوط کی مزید دریافت وتحقیق کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان کی زندگی کے دیگر پہلو نمایاں ہوکر منظر عام پر آسکیں اور اس کی مدد سے مزید تلاش وتحقیق کے نئے باب وا ہوسکیں۔

ماخذ ومنابع

1 سخن شعرا، مولوی عبدالغفور نساخ، چاپ شدہ از منشی نولکشور، لکھنؤ، 1921، ص 141
2 مومن شخصیت اور فن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی، 1972، ص 31
3 دیباچہ انشائے مومن، مرتبہ ومترجمہ ظہیر احمد صدیقی، جمال پریس دہلی، 1977، ص 1
4 انشائے مومن، مرتبہ ومترجمہ ظہیر احمد صدیقی، ترجمہ از حکیم احسان اللہ خان، جمال پریس دہلی، 1977، ص 15
5 غالب نامہ، مدیر پروفیسر نذیر احمد، چمن آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 1985، ص 24
6 انشائے مومن، مرتبہ ومترجمہ ظہیر احمد صدیقی، ترجمہ از حکیم احسان اللہ خان، جمال پریس دہلی، 1977، ص 224
7 ایضاً، ص 45
8 ایضاً، ص 282
9 غالب نامہ، مدیر پروفیسر نذیر احمد، چمن آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 1985، ص 151
10 غالب نامہ، مدیر پروفیسر نذیر احمد، چمن آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 1985، ص 46
11 غالب نامہ، مدیر پروفیسر نذیر احمد، چمن آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 1985، ص 152

■

Dr.Neelofar Hafeez
Assistant Professor (Persian)
Department of Arabic & Persian,
University of Allahabad
Prayagraj- 211002 (UP)
Mob.: 7500984444

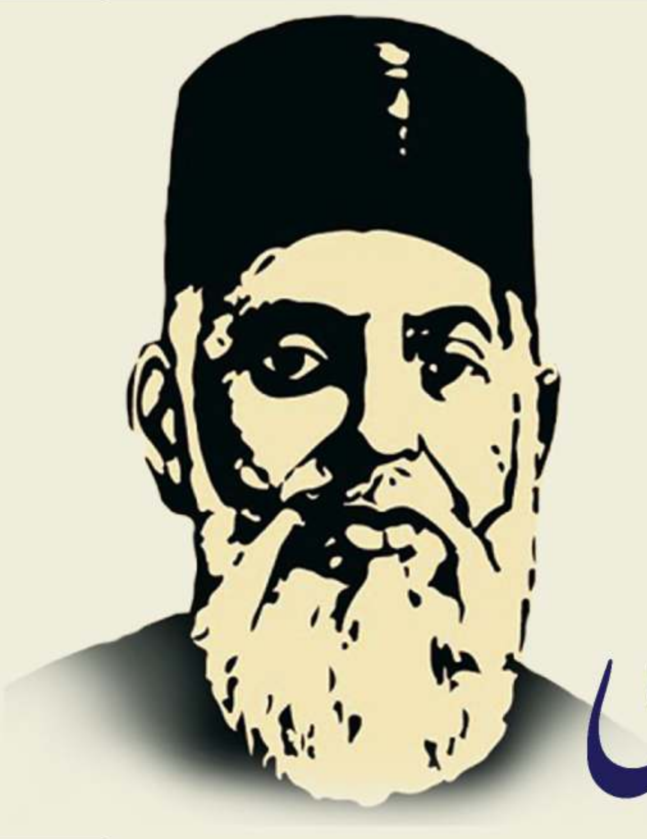

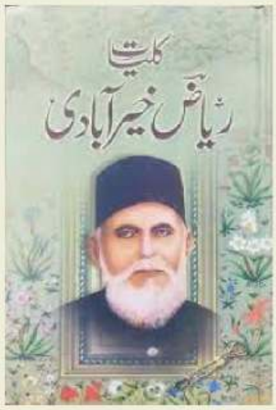

محمد یونس ٹھوکر

کوچۂ نرگسیت کا والہ وشیدا

ریاض خیرآبادی

ریاض خیرآبادی اردو ادب کے ایک ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اپنے منفرد اور مخصوص شاعرانہ خصائص اور کمالات سے اردو ادب میں اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت قائم کی۔ ناقدین ادب نے ان کے کلام کو سراہتے ہوئے انھیں کئی اہم القابات سے نوازا ہے۔ کہیں انھیں 'خیام الہند' کا خطاب دیا گیا تو کہیں 'خمریات کا امام'۔ ریاض خیرآبادی کی شاعری کو مجموعی طور پر تین اہم ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے دور میں ان کے یہاں مشکل پسندی کا رجحان اور سنگلاخ زمین میں غزلیں کہنے کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس دور میں وہ غالب کے نقش قدم کے شیدائی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تب کی بات ہے جب آپ آشفتہ تخلص رکھا کرتے تھے۔ تاہم وہ زیادہ دیر تک اس فضا میں سانسیں نہ لے سکے۔ دوسرے دور میں انھوں نے مشکل پسندی سے اعراض کرکے بلند خیالی کی طرف سفر کیا۔ اس دور میں ریاض اپنے استاد کی پیروی میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے مابین ایک پُل بننے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس دور کی شاعری کا مطالعہ کرکے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا تخیل بہت سرگرم عمل ہے۔ البتہ یہ بات بھی اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اس دور کی شاعری میں ان کے یہاں نشاطیہ رنگ غالب ہے۔

تیسرے دور کی شاعری میں ان کے یہاں صوفیانہ رنگ ملتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے حاجی علی شاہؒ (دیوہ شریف بارہ بنکی) کے مرید کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کیا۔ شاید اسی کے پیش نظر اس دور کی شاعری میں ان کے یہاں اخلاقی مضامین کا بھی عندیہ ملتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ریاض کی شاعری میں جس خمریات کا بار بار ذکر ملتا ہے وہ دراصل کچھ اسی صوفیانہ خیالات کی مرہون منت کہا جاسکتا ہے ورنہ یہ بات تحقیق سے ثابت شدہ ہے کہ ریاض خیرآبادی بادہ خواری کو کسی شجر ممنوعہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ عشق و مستی کے پروردہ ضرور تھے لیکن مے نوشی کے دلدادہ کبھی نہیں تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں جو خمریات کے جلوے دیدنی ہیں وہ یا تو رسمی اور روایتی ہیں یا اسی دورِ ثالث کے شاعرانہ رجحان اور مزاج کے طفیل ہیں۔ کیوں کہ صوفی شعرا نے خمریات کے پس پردہ عشق و مستی کے کئی متنوع رنگ بکھیرے ہیں۔

تنقیدی سطح پر ان کے کلام کا صوفیانہ، خمریاتی، حسن و عاشق، رومانوی وغیرہ سطحوں پر کافی کچھ مطالعہ ہوچکا ہے۔ تاہم ان سب پہلوؤں سے پرے ان کے کلام میں جو عنصر بار بار قارئین کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے اور جس کے ساتھ بہت محدود تنقیدی مکالمہ قائم کیا جاچکا ہے وہ ہے نرگسیت کا پہلو۔ سلام سندیلوی کی کتاب 'اردو شاعری میں نرگسیت' میں اس حوالے سے چند نگارشات کے سوا یہ پہلو ہنوز تشنہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس مقالے میں ریاض خیرآبادی کے کلام کے ساتھ نرگسیت کے تحت کچھ خامہ فرسائی کریں، یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نرگسیت کے بنیاد مبادیات سے آگاہی حاصل کرلیں۔

نرگسیت دراصل علم نفسیات کی ایک بسیار البحث اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال ماہر نفسیات معالج فرائڈ نے دوران پیشہ اپنے مریضوں کی تشخیص کے حوالے سے کیا۔ نرگسیت کے موضوع کے حوالے سے ان کی کتاب "Collected Papers" سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ابتدا میں یہ اصطلاح ان مریضوں کے لیے استعمال کی گئی جو ایک مخصوص ذہنی خلل کے نتیجے میں اپنے جسم سے جنسی محبت کے شکار ہوگئے تھے۔ ایسے اشخاص مختلف طریقوں سے اپنے جسم سے جنسی لذت حاصل کرتے تھے۔ فرائڈ کے بعد اس کے مقلدین نے بھی ہلکی سی معنوی توسیع کے ساتھ اس اصطلاح کو تقریباً ان ہی معنوں میں پیش کیا۔ نرگسیت کے موضوع کے تمام حدود کو چھونے والی جامع اور مدلل کتاب کیرن ہارنی کی "New Ways In Psychoanalysis" تسلیم کی جاتی ہے۔ تمام تر لغوی مباحث اور ماہرین فن کی آرا سے قطع نظر آیئے سیدھے طور پر اسی کتاب سے نرگسیت کی جامع اور مدلل تعریف پیش کرتے ہیں:

''ان کا قول ہے کہ نرگسیت کے دائرے میں خود ستائی (Vanity)، غرور (Conciet)، طلبِ جاہ (Craving for Prestige)، جذبۂ محبوبیت (Desire to be Loved)، دوسروں سے کنارہ کشی (Withdrawal from Others)، خودداری (Normal Self Esteam)، تصوریت (Ideal ion)، تخلیقی خواہشات (Creative desire)، شدید فکر صحت (Anxion Concern about Health)، شکل و

شباہت (Apperance)، اور ذہنی صلاحیت...... شامل ہیں''[1]

یہاں یہ بات واضح رہے کہ نرگسیت کی اصطلاح کے پیچھے ایک طویل تاریخی سیاق وسباق بھی کارفرما ہے ہم نے طوالت سے بچنے کے خاطر ان سب عوامل سے گریز کیا ہے۔

نرگسیت کی مذکورہ بالا توضیح کے تناظر میں اگر ہم ریاض خیر آبادی کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کریں گے تو صاف اور واضح طور پر ریاض نرگسیت کے شکار نظر آتے ہیں۔ نرگسیت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں انسان اپنے آپ سے والہانہ محبت کرنے لگتا ہے، وہ اپنی خامیوں سے بے نیاز ہوکر صرف اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا مدح خواں بن جاتا ہے۔ نرگسیت کا شکار انسان اپنی تمام تر غلطیوں سے صرف نظر کرکے اپنی عظمت کے ترانے گاتا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں اور عیبوں سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے، البتہ نرگسیت کے شکار انسان کو اپنے وجود سے بہت زیادہ پیار ہوتا ہے جس کا اظہار وہ کچھ اس سطح پر کرتا ہے کہ اس کی آواز کی گونج کے میں دیگر پہلو ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر ریاض خیر آبادی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بیسیوں مقامات ایسے ہیں جہاں شاعر نے اپنے آپ کو لاکھوں میں ایک قرار دیا ہے۔

لاکھوں ہی جوانوں میں ریاض ایک جواں ہے
کمبخت حسینو، اسے چاہو اسے چاہو

ان کی شاعری میں اسی طرح کے موضوعات پہلو بدل بدل کر سامنے آتے ہیں۔ شاید اسی قسم کی شاعری کا مطالعہ کرکے ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی نے ریاض خیر آبادی کو اردو شاعری کا نرگس قرار دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر خلیل اللہ خان کی کتاب ''ریاض خیر آبادی: حیات وخدمات'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''ریاض خیر آبادی کو ہم اردو شاعری کا نرگس قرار دے سکتے ہیں۔ یونان کے نرگس میں خود بینی اور خود پسندی کی جو خصوصیت موجود تھی اُس کا مکمل پرتو تو ریاض خیر آبادی کے یہاں رقصاں نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ ریاض بذات خود نہایت حسین وجمیل انسان تھے۔ اس لیے دوشیزگان گورکھپور خود ان پر جان چھڑکتی تھیں...... دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے مشہور ومعروف شاعر اور انشا پرداز تھے، اس لیے اہل ذوق، 'نازت بکشتم کہ نازنینی' کو مدِ نظر رکھ کر ان کی قدر کرتے تھے۔''[2]

مذکورہ بالا حوالے کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ نرگسیت کے دلدادہ گزرے ہیں۔ ریاض خیر آبادی کو اپنی شکل وصورت اور وضع قطع پر ناز تھا۔ انھیں اپنی جسمانی بناوٹ اور ساخت بہت محبوب تھی۔ وہ کسی دوشیزہ کے شباب کا گرویدہ ہونے کے بجائے اپنے شباب کو محبوب رکھتا ہے۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا آس پاس ان کے حسن وجوانی کو دیکھ کر رشک کرتا ہے۔

دنیا کی پڑرہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

اسی نرگسیت کی دین ہے کہ ریاض اپنے محبوب کی بے وفائی اور بے اعتنائی سے مایوس اور قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان کی خود پسندی انھیں ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ انھیں چھوڑ کر محبوب نے جس شخص کا پلو تھاما وہ شکل وصورت میں ان سے گیا گزرا ہے۔ سر پیٹنے کے بجائے انھیں ترس آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غم وغصے کا اظہار کرنے کے بجائے محبوب کے اس عمل کو اس کی نادانی اور بیوقوفی سے تعبیر کرکے ان پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار
صورت میں وہ ریاض سے اچھا تو کچھ نہ تھا

ریاض اچھی نہیں صورت تو کچھ پروا نہیں اس کی
ہماری وضع میں کیا ان سے کم کا فر ادائی ہے

اردو شاعری میں تصورِ عشق کا جو ماڈل فارسی شاعری کے زیر اثر سامنے آیا وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک معشوق ہے جس کی ادائیں بے مثال، جس کا حسن لازوال، جس کی وضع قطع توبہ شکن اور ایک قسمت کا مارا ہے جو اس پر فریفتہ ہوکر اپنی جان چھڑکتا ہے، اسے منانے کی ہمہ وقت بے مثال کوششیں کرتا ہے، اسے اپنا بنانے کے لیے اپنی دنیا بھی تیاگ سکتا ہے۔ لیکن ایک معشوق ہے جسے ان سب چیزوں کی کوئی پروا نہیں۔ عاشق واویلا کرتا ہے منتیں کرتا ہے، ہجر کا درد سہتا ہے۔ من جملہ طور پر اس روایتی تصور عشق میں محبوب سراپا ناز ہے اور عاشق سراپا نیاز ہوا کرتا تھا۔ لیکن ریاض کی نرگسی شاعری کے سامنے ہمیں روایتی تصورِ عشق کا یہ بت چکنا چور نظر آتا ہے۔ انھیں خود پسندی کا ایسا نشہ سوار ہے کہ جہاں انھیں اپنا سراپا اور اپنی ادائیں محبوب کے مقابلے ہر سطح پر عزیز ہیں۔ روایتی تصورِ عشق کے نمونے میں جہاں مرکزیت ایک عورت کو حاصل تھی وہیں ریاض کی نرگسیت کی وجہ سے یہاں عورت کے مقابلے میں ریاض کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ محبوب کی اداؤں کے مقابلے میں اپنی اداؤں کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔

چاہتے ہیں تجھے معشوق طرحدار ریاض
تجھ میں کم بخت کہاں سے یہ ادائیں آئیں

کمسنی پہ ترس آیا نہ شب وصل ریاض
اُف رے بیدرد حسینوں کے ستانے والے

روایتی تصورِ عشق کے برعکس یہاں ریاض ناز ہے اور ان پر جان فدا کرنے والی تمام حسینائیں نیاز ہی نیاز۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ نرگسیت کے شکار کسی انسان کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ غمخواری اور ہمدردی کے اظہار میں بہت بخیل ہوتا ہے اور دوسروں کے احساسات مجروح ہونے سے بالکل نابلد۔ ریاض خیر آبادی کے یہاں جو حسیناؤں کے تئیں بے التفاتی کا رویہ ملتا ہے وہ اسی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں سلام سندیلوی کا درجہ ذیل اقتباس اس حقیقت پر صداقت کی مہر ثبت کرتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ ریاض کے یہاں جذبۂ محبوبیت عروج پر نظر آتا ہے، وہ بذات خود حسین ہیں اس لیے حسیناں ومہوشاں ان کی نظر میں نہیں جچتے ہیں، اسی بنا پر وہ ان کے سامنے عشوہ وغمزہ کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ان کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں بلکہ ان کی تمنا ہے کہ دوشیزگان گورکھپور ان سے محبت کریں۔ دراصل ریاض خیر آبادی اردو شاعری کے یونانی نرگس ہیں۔''[3]

حسینوں اور دوشیزاؤں کے تئیں بے نیازی کا یہ رویہ اور برتاؤ رکھنا ایسے ہی نہیں بلکہ انھیں اپنے شباب پر بے انتہا اعتماد اور فخر ہے۔ ان کے یہاں اسی شباب کو اگر نرگسیت کی بنیادی دین قرار دیا جاسکتا ہے تو کوئی بے جا نہیں ہوگا۔ اپنے شباب اور اپنی جوانی پر انھیں اعتماد اور یقین ہے۔ انھیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی جوانی سے نوازا گیا ہے جو واقعی میں قابل رشک ہے۔

پیری میں ریاض اب بھی جوانی کے مزے ہیں
یہ ریش سفید اور مئے ہوش ربا سرخ

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

جوانی خود آتی ہے سو حسن لے کر
جواں کوئی ہو ہم حسین جانتے ہیں

اپنے شباب کا یہ نشہ اور اپنے شباب کا یہ غرور ان کے یہاں آخری عمر تک قائم رہا۔ بڑھاپے کی جھریوں نے ان کے خیالات کو پست اور ان کے جذبات کو سرد ہونے نہیں دیا۔ وہ اپنے تازہ تر اور نو آموز خیالات، کیفیات، احساسات کے بل بوتے سدا بہار کی طرح ہمیشہ جواں رہے۔ اپنی جوانی کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی خوش باش طبیعت اور

شخصیت سے بھی کافی زیادہ انسیت تھی ۔

خوش ہو کے ریاض سے بھی ملنا
کیا باغ و بہار آدمی ہے

اپنی اس باغ و بہار طبیعت اور دلکش و دلفریب شخصیت کی وجہ سے وہ کسی بھی عورت کو خاطر میں لاتے ہی نہیں۔ اس حوالے سے ان کی شاعری پر ڈاکٹر اعجاز حسین کا یہ نظریہ بالکل بجا معلوم ہوتا ہے:

''ریاض نے دنیائے عشق میں عاشق ستم رسیدہ بن کر رہنا پسند نہیں کیا۔ دل پر اگر کبھی گہری چوٹ لگی ہے تو اس کا اظہار آہ و فغاں سے نہیں کیا بلکہ ایک معنی خیز تبسم سے اور ایک ایسی ادا سے کہ معشوق کو خود پیار آجائے۔ وہ معشوق کی خوشامد بہت کم کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو خود روٹھ جاتے ہیں کہ کوئی گدگدا کے ہنسا کے منائے۔''4

اپنے جسمانی خدوخال کے علاوہ ریاض کا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا خود ہی شیدائی بن جانا بھی نرگسیت ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ اس تناظر سے بھی اگر ریاض کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو وہ نرگسیت کے صف اول میں کھڑے کیے جاسکتے ہیں۔انھیں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا نہ صرف ادراک و احساس ہے بلکہ وہ اس معاملے میں خود کو بلند قامت استاد سے کسی طرح کم تصور نہیں کرتے۔ وہ اپنی سخن دانی کو موتیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اسی خود پسندی کے جذبے کے تحت اپنے آپ کو شعر و سخن کے تناظر میں زمانے بھر میں اہل کمال وفن میں یکتا تصور کرتے ہیں۔

ہر شعر بلند کا یہ رتبہ ہے ریاض
چوٹی ہیں طور کی پڑا ہے موباف

قدرداں گو ہر سخن کے ریاض
منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

میرے سوا زمانے میں کوئی نہیں ریاض
اہل کمال شاعر یکتا کہیں جسے

شعر تو میرے چھلکتے ہوئے ساغر ہے ریاض
پھر بھی سب پوچھتے ہیں آپ نے مے پی کہ نہیں

اردو رباعی کا غالب موضوع اخلاقیات اور آفاقی قدریں رہا ہے۔ اس میں شاعرانہ تعلی اور اظہار خود پسندی کی گنجائش بہت محدود ہوتی ہے۔لیکن ریاض کا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی رباعیوں میں بھی نرگسیت کے واضح نقوش چھوڑ دیے ہیں۔کئی ایک رباعی میں اپنی فنکارانہ صلابت کی شان و شوکت یوں ظاہر کرتے ہیں۔

موزوں جو کیے ہیں شاہ دیں کے اوصاف
بندش ہے چست اور مضمون ہے صاف

سچ ہے اے حضرت ریاض یہ بات
کہ جدا سب سے ہے جناب کا رنگ

انھیں نہ صرف یہ کہ اپنی جوانی، شباب و شہرت اور حسن و جمال پر فخر ہے بلکہ بایں ہمہ انھیں اپنے فن اور اسلوب پر بھی ناز ہے۔ ان کی نرگسی صفت انھیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ بھی اپنے آپ میں ایک عظیم تخلیق کار ہے۔ وہ اس احساس سے اندر ہی اندر مچل اٹھتا ہے کہ ان کی شاعری کے چرچے نہ صرف خاص و عام میں ہیں بلکہ اس فن کے استاد بھی اس معاملے میں ان کی داد دہی کرتے ہیں۔

مری افسوں طرازی کی ریاض اتنی جو شہرت ہے
سبب یہ ہے کہ ساحر سا ملا ہے قدرداں مجھ کو

ان کے یہاں جابجا ایسے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں انھوں نے اپنی پاکدامنی اور اپنی تقوی شعاری کے گن گائے ہیں۔ وہ بزم میخانہ سے جام و سبو اٹھائے جانے کا ذکر جب کرتے ہیں تو اس کی علت یہ پیش کرتے ہیں کہ اب وہاں ریاض جیسے پاکباز بزرگ آنے والے ہیں۔ وہ اس معاملے میں اس قدر خودستائی کے مراحل سے گزرتے ہیں کہ انھیں زمانے بھر میں کسی اور کی پاکدامنی اپنے مقابل میں ایک آنکھ نہیں جچتی۔

بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

آنے کو ہے ریاض سا اک پارسا بزرگ
مینا و جام بزم سے اٹھوائے جاتے ہیں

مری بت پرستی بھی ہے حق پرستی
مرا مرتبہ اہل دیں جانتے ہیں

انھوں نے اپنی نظموں میں بھی اپنے تقدس اور بزرگی کے گیت گائے ہیں۔نظم چونکہ کسی ایک خاص موضوع کی پابند ہوتی ہے لیکن ریاض کی نرگسیت اس موضوع کے حدود کو چیرتی ہوئی اس کے بین السطور میں اپنا جلوہ کہیں نہ کہیں ضرور دکھاتی ہے۔ ریاض رضوان میں ایک نظم موسوم بہ 'عقد ثریا' کہی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے مغربی تہذیب و ثقافت کا خوب مذاق اڑایا ہے اور اس وقت کے سیاسی حالات پر بھی طنز کے زہر آلودہ تیر چلائے ہیں۔ لیکن اس موضوع کے پس پردہ بھی غیر ارادی طور پر اس کے آخری شعر میں اپنی نرگسیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

بڑھاپے میں ریاض افشا نہ کر راز سیہ کاری
مجھے ڈر ہے تقدس کو ترے رسوائیاں ہوں گی

وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حسن و جوانی کو کبھی زوال کی ہوا بھی نہ لگے۔ جو چیز انسان کو بہت پیاری ہوتی ہے وہ اس کے تئیں بہت فکرمند رہتا ہے۔ ریاض کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ انھیں اپنی جوانی اس قدر عزیز ہے کہ وہ اس پر بڑھاپے کی خزاں دیکھنا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ یہی نرگسیت انھیں اللہ کے حضور یوں دست سوال دراز کرنے کے لیے اکساتی ہے۔

جواں کردے الٰہی صحبتِ پیر مغاں مجھ کو
پرانے میکدے والے بھی جانے نوجواں مجھ کو

من جملہ طور پر یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ ریاض کے اندر نرگسیت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کے اندر کی یہ نرگسیت بعداز مرگ بھی زندہ رہی۔

انھیں اپنی خوبصورتی اور قاتلانہ ادا پر کچھ اس قدر ناز ہے کہ انھیں لگتا ہے کہ موت بھی اس کو مات نہیں دے سکتی۔ وہ تو حشر کے دن بھی اپنی رندانہ وضع ترک کرنے پر تیار نہیں۔

کفن سرکا کے حسن نوجوانی دیکھتے جاؤ
ذرا افتادِ مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

اہل محشر سے نہ الجھو تم ریاض
حشر میں دیوانگی اچھی نہیں

دہن گور میں جاتے ہوئے کہتے تھے ریاض
اے لبِ گور سمجھ موجِ تبسم مجھ کو

ہم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں
یہی ہوں گے وہاں بھی اہل دنیا دیکھنے والے

غرض ان کے کلام میں خود پسندی، خودستائی، انا پرستی، شاعرانہ تعلی، جیسے عناصر نرگسیت کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔

مراجع و مصادر

1 بحوالہ ڈاکٹر سلام سندیلوی، اردو شاعری میں نرگسیت، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنو 1974، ص 30-29

2 ڈاکٹر جلیل احمد خان، ریاض خیرآبادی: حیات اور ادبی خدمات، یونائیٹڈ پریس، لکھنؤ، 1974، ص 7

3 ایضاً

4 ڈاکٹر اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، جاوید پبلشرز، الہ آباد، ص 245

Dr. Mohd Younus Thokar
Asst Professor, (C), Dept of Urdu
Kashmir University
Kashmir (J&K)

نوشین حسن

انشائیہ کا فن

’انشائیہ دیگر اصناف ادب کے مقابلے آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے کہ وہ صرف ذہنی اپچ ہے اور وہ مشکل اس لیے کہ ہر ذہنی اپچ، انشائیہ نہیں بن سکتی، اس لیے محض فکر کافی نہیں بلکہ ذکر بھی درکار ہے اور یہ ذکر آسان نہیں۔ اس کی اولین شرط نفسیات کی مہارت ہے اور ادب میں آکر یہ خاص اسلوب اختیار کرلیتی ہے جس میں فلسفہ، تنقید اور ادب کے تمام شعبے (مع طنز و تعریض، مزاح) ایک دوسرے سے گتھے نظر آتے ہیں،‘

انشائیہ اردو ادب کی ایک اہم اور مقبول صنف ہے، جس کا شمار غیر افسانوی نثر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اردو انشایئے کے اولین نقوش کا آغاز اٹھارویں صدی سے ہوگیا تھا لیکن اس کو شہرت دوام بیسویں صدی میں نصیب ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ ننھا سا پودا بڑھ کر تناور درخت بن گیا۔ اس کے باوجود انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس کی کوئی ایک تعریف متعین نہیں ہوسکی ہے۔ تمام ناقدین ادب کی آرا مختلف فیہ رہی ہیں۔ ان میں کہیں اختلاف اور کہیں پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ مثلاً چند ناقدین کا ماننا ہے کہ یہ صنف انگریزی ادب سے اردو میں آئی اور چند کا کہنا ہے کہ یہ صنف ہماری مٹی کا وہ خود رو پودا ہے، جس کے نقوش ہماری ادبی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انشایئے کی تعریف کے ضمن میں چند مشہور نامور ناقدین ادب کی آرا مندرجہ ذیل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

’’انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور سے گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔‘‘[1]

سید محمد حسنین کی رائے میں:

’’داخلیتی طریق کاری (subjective way of treatment) انشائیہ نگار کا شعار و کردار ہے۔ اس فرض سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے وہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا بلکہ پرائے دل و دماغ پر بھی دستک دیتا ہے۔‘‘[2]

نیاز فتح پوری کے مطابق:

’’انشائیہ دیگر اصناف ادب کے مقابلے آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے کہ وہ صرف ذہنی اپج ہے اور وہ مشکل اس لیے کہ ہر ذہنی اپج، انشائیہ نہیں بن سکتی، اس لیے محض فکر کافی نہیں بلکہ ذکر بھی درکار ہے اور یہ ذکر آسان نہیں۔ اس کی اولین شرط نفسیات کی مہارت ہے اور ادب میں آکر یہ خاص اسلوب اختیار کرلیتی ہے جس میں فلسفہ، تنقید اور ادب کے تمام شعبے (مع طنز و تعریض، مزاح) ایک دوسرے سے گتھے نظر آتے ہیں۔‘‘[3]

مندرجہ بالا تمام تعریفوں کا اجمالاً جائزہ لینے کے بعد اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ یہ تمام تعریفیں ایک دوسرے سے کسی حد تک متضاد ہیں۔ ایک طرف جہاں ڈاکٹر سید محمد حسنین انشائیہ کے لیے داخلی طریق کار کو انشایئے کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں اور اس کو ایسا عنصر قرار دیتے ہیں، جس سے تحریر کی عظمت اور بھی برتر ہوجاتی ہے۔ یعنی دل سے نکلی ہوئی بات دوسرے دل تک اس طور سے پہنچے جو زیادہ پُر اثر ہو۔ دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو ایک نثری صنف قبول کرتے ہیں جس میں انشائیہ نگار اپنے اسلوب کی تازہ کاری کو ضروری مانتا ہے کیونکہ اسلوب اگر گھسا پٹا ہوگا تو اس کی تحریر میں کسی بھی قسم کا اثر برقرار نہیں ہوگا۔ یہ تمام تعریفیں ناقدین ادب کی اپنی خلاقانہ طبیعت اور تخلیقانہ مزاج کی دین ہیں جو لائق ستائش بھی ہیں اور ناقابل فراموش بھی۔ انشائیہ کے سلسلہ میں احتشام حسین درست فرماتے ہیں:

’’میرے ذہن میں انشائیہ کی کوئی منطقی اور علمی تعریف نہیں ہے تو یقیناً مجھ پر لاعلمی اور جہالت کا الزام نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ میں خود ان تمام مشرقی اور مغربی نقادوں کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں جنھوں نے

قطعیت کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اس کو صحیح اور مناسب ترین قرار دیا ہے۔"4

انشائیہ کی تعریف چند جملوں میں نہیں بیان کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں اتنی جہتیں اور پرتیں ہیں کہ اس کو ایک دھاگے میں پرونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس کا کام تو چلتے رہنا اور آگے بڑھتے رہنا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ انشائیہ کی جس قدر تعریفیں کی گئیں ہیں۔ وہ تمام باتیں برائے تعریف ہی ہیں۔ انشائیہ کی ساختیات اور شعریات پر ان سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مثال کے طور پر کسی شعری صنف کو قصیدہ کہنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ہیئت پر غور کیا جائے گا۔ تشبیب، گریز، مدح، دعا، جیسے عناصر ترکیبی قصیدہ کی پہچان ہیں۔ یہ بعد کی بات ہے کہ قصیدہ کس کی شان میں ہے۔ ممدوح کوئی بادشاہ ہے یا مذہبی ہستی یا کوئی موسم، پھول اور پھل یا کوئی جانور۔ پھر قصیدہ اظہار بیان کی حد تک کس قدر کامیاب ہے یا اس میں کون کون سے شعری محاسن پائے جاتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام تعریفیں ناقدین کے خلاقانہ ذہن کی اپج ہیں تو اس کا سیدھا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ تاثر ہے۔ یہ تاثر چند انشائیوں کو پڑھ کر قائم ہوا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے تمام تعریفیں مخصوص انشائیوں کو پڑھ کر مرتب ہونے والے اثرات ہیں کہ فلاں انشائیے میں فلاں خوبی ہے۔ یہ خوبی مختلف انشائیہ نگاروں کی منفرد طرز ادا ہے۔ انشائیہ کی ہیئتی پہچان ہنوز تشنہ ہے۔ موجودہ وسائل کی روشنی میں انشائیہ کے خدوخال اور اس کی تعریف کو سمجھنے کے لیے، مذکورہ بالا نکات سے مدلل سکتی ہے کہ انشائیہ ایک ایسی نثری صنف ہے، جس میں موضوع کا تنوع، جدت اسلوب، اختصار اور جامعیت کے ساتھ قوت انشا پوری فکر کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔

انشائیہ کی لغوی تحقیق

انشائیہ نہ صرف اردو میں بلکہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی میں بھی موجود ہے۔ عربی میں اسے لفظ 'انشا' سے تعبیر کرتے ہیں جو 'نشا' مادہ سے مشتق ہے۔ فارسی میں بھی اسے انشا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسے ہندی میں 'للت رچنا' کہتے ہیں۔ انگریزی میں 'Light Essay' کہا جاتا ہے جو فرانسیسی لفظ 'Essai' سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اس صنف کو اولاً لطیف پارہ، ادب لطیف، لائٹ اسے اور پھر انشائیہ کے نام سے شناخت حاصل ہوئی۔ نیز انشا اور انشائیہ میں ایک بہت ہی مہین سا فرق ہوتا ہے ان تمام زبانوں میں انشا کے معنی و مفہوم میں بھی تضاد نہیں پایا جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انشا لفظ سے بھی وہی مفاہیم فراہم ہوتے ہیں جو انشائیہ سے بھی عبارت کیے جاتے ہیں۔ نیز یہ بات انشائیہ کی لغوی تحقیق سے اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ بطور نمونہ فارسی، ہندی، انگریزی اور اردو سے چند مثالیں پیش ہیں۔

فارسی میں انشائیہ کی لغوی تحقیق

فرہنگ فارسی امروز میں لکھا ہے:

نویسندگی، منشیگری۔ مطلبی کے برائی ترین نویسندگی، نوشتہ شود، درس انشا۔"5

"تحریر کرنے والا، اپنے دل سے کسی بات کا پیدا کرنے والا، ایسی بات بیان کرنا جو پڑھنے میں خوگر (دلکش) ہو، چٹھی، خط، مکتوبات، روشن عبارت نویسی۔

ہندی للت رچنا کی لغوی تحقیق

ہندی میں انشائیہ کو 'للت رچنا' کے نام سے جانا جاتا ہے، جو دراصل دو منفرد الفاظ 'للت اور رچنا' کو جوڑ کر بنائی گئی ایک اصطلاح ہے۔ ان دو الفاظ کو یکجا کرنے پر معنی و مفاہیم ٹھیک وہی نکلتے ہیں جو اردو میں لفظ 'انشائیہ' میں پائے جاتے ہیں:

> **انشائیہ ایک زندہ اور تابندہ صنف ہے اور زندہ چیز میں تغیر اور تبدل کا عنصر چھپا رہتا ہے،اس میں توسیع کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے،ایک انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ فن کے دائرے میں رہ کر ایک کامیاب انشائیہ تخلیق کرے،اپنے اسلوب کی روانی اور اپنے ہمہ گیر تجربوں کو فطری سادگی اور تسلسل کے ساتھ تحریر کرے، ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے پرہیز کرے،اگر انشائیہ نگار بغیر احساسات اور تاثرات کے اپنی تخلیق کو پیش کرتا ہے تو گویا اس کی تحریر سپاٹ اور اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔**

Acording To New Hindustani English Dictionary..

(1) Lalit-A ragma or musical mode, beautiful, lovely.

(2) Rachna-Creation Nature composition .[6]

خوبصورت، پیار، اخلاق سے پُرکشش، ایسی نثر جس میں تمام فنی خوبیاں پائی جائیں، ایسی تحریر جس میں جاذبیت ہو۔

انگریزی light essay کی لغوی تحقیق

ہندی کی للت رچنا کی طرح انگریزی کے لائٹ اور ایسے کی مرکب اصطلاح نہیں پائی جاتی ہے بلکہ یہ جداگانہ مفہوم میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن اس اصطلاح کا کم و بیش وہی مفہوم ہے جو دیگر اصناف کے انشائیوں میں مضمر ہے۔ مثلاً آکسفورڈ انگریزی اردو لغت کے مطابق 'light اور essay' کے مفاہیم کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

(1) light. ایسی روشنی جس کے باعث اشیا نظر آتی ہیں، کسی شے پر نظر ڈالنے کا انداز، ذہنی بصیرت، فہمیدگی، آگہی، امید، بہجت فرحت مبارک، ایسی چمک جو چہرے پر اور خصوصاً آنکھوں میں نظر آئے۔"7

(2) Essay. کسی موضوع پر کوئی مضمون یا مقالہ عموماً مختصر تحریر، کوشش سعی، قسمت آزمائی، آزمانا وغیرہ۔8

اردو انشائیہ کی لغوی تحقیق

قاموس مترادفات میں لکھا ہے:

"مضمون، مضمون لطیف، نثر لطیف، ہلکا پھلکا مضمون، لائٹ اسے ادب لطیف وغیرہ۔"10

انشائیہ کی فنی خصوصیات:

یوں تو ہر اصناف کی فنی خصوصیات ہوا کرتی ہیں جو ایک دوسرے سے منفرد اور ممتاز ہوتی ہیں۔ جہاں تک انشائیہ کے فنی اختصاص کا تعلق ہے تو اس صنف میں بھی کچھ ایسے فنی امتیازات ہیں جو صرف اس صنف کے لیے مخصوص ہیں۔ انشائیہ میں چند ایسی فنی باریکیاں ہیں جو انشائیہ کے لیے لازم و ملزوم ہیں ڈاکٹر اختر اورینوی کے مطابق:

"انشائیہ طرازی نثر نگاری میں ایک خاص صنف ہے کیوں کہ اس میں ماضی حال اور مستقبل کی باتیں ہوتی ہیں۔"11

انشائیہ ایک زندہ اور تابندہ صنف ہے اور زندہ چیز میں تغیر اور تبدل کا عنصر چھپا رہتا ہے۔ اس میں توسیع کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ ایک انشائیہ نگار کے لیے

ضروری ہے کہ وہ فن کے دائرے میں رہ کر ایک کامیاب انشائیہ تخلیق کرے۔ اپنے اسلوب کی روانی اور اپنے ہمہ گیر تجربوں کو فطری سادگی اور تسلسل کے ساتھ تحریر کرے۔ ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے پرہیز کرے۔ اگر انشائیہ نگار بغیر احساسات اور تاثرات کے اپنی تخلیق کو پیش کرتا ہے تو گویا اس کی تحریر سپاٹ اور اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔ یعنی اس کی تخلیق دُھند میں چھپ جائے گی۔ اس لیے واضح نقطہ نظر کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے جو احساس اور جذبے کو توانائی اور رعنائی بخشتا ہے۔ انشائیے کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں ہر اہم اور غیر اہم موضوع کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ نثری تحریر میں بے ربطی کا ہونا طے ہے۔

انشائیے کا اولین وصف بات سے بات پیدا کرنا ہے جس کے بغیر انشائیہ کا تصور ممکن نہیں، انشائیے میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں اپنی ذات سے لے کر کائنات کے ہر ذرے پر بات کی جاسکتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مطالعہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام فنی وفکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ انشائیے میں اپنے تمام تجربات کو پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ انشائیہ نگار نیرنگ خیال سے اپنے موضوع میں ایک ایسا رنگ پیدا کرتا ہے جو انشائیے میں جان ڈال دیتا ہے۔

فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو انشائیہ کو پُر وقار بنانے والی خصوصیات اختصار اور جامعیت ہے۔ انشائیہ نگار کو مختصر مگر جامع انداز بیان پر جتنی قدرت ہوگی، تحریر اتنی ہی دلکش معلوم ہوگی۔ نیز ایک ممتاز انشائیہ نگار اپنی محاسبانہ اور محاکمانہ خوبیوں کی بدولت ایسے فن پاروں کی تخلیق کرتا ہے جس کا براہ راست اثر قاری پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ نگار اپنے مشاہدات کے ذریعے چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے موضوع میں پروتا ہے اور ایک خوبصورت موتیوں کی لڑی کی شکل میں نمایاں کرتا ہے۔ بقول آدم شیخ ''اختصار جامعیت اور عدم تکمیل (incompleteness) ایک انشائیہ کی نمایاں صفات ہیں۔''11 نیز اس میں اسلوب کا بہترین رکھ رکھاؤ ہونا چاہیے تاکہ موضوع میں روح پیدا ہو سکے۔ اسلوب میں تخلیق کا اثر ہونا ضروری ہے جو دراصل انشائیہ نگار کے طرز احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے قاری کے ذہن وقلب تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ نیز اسلوب وہ میڈیم ہے جس کی تازگی اور نئے پن کے بغیر انشائیہ؛ انشائیہ نہ رہ کر ایک سنجیدہ سی تحریر بن کر رہ سکتا ہے ہر چند کہ انشائیہ کا سارا حسن اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہوتا ہے جو اس کے موضوع اور فارم میں تقویت پہنچانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اسلوب کی اہمیت کے اعتراف میں سید محمد حسنین تحریر کرتے ہیں:

''یہ اس نثری تحریر کا کرشمہ ہے کہ خودرو اور خود مختار خیالات کی آوارہ گردیاں اس صنف ادب میں تربیت یافتہ خیالات کی نیرنگیاں بن جاتی ہیں، خیالات وافکار کی ابتدائی، بدشکلی ناتمامی اور خامی جنبش قلم سے وہ حسن بو قلموں ہو جاتی ہے جو کمال فن انشائیہ ہے۔''12

حقیقت تو یہ ہے کہ انشائیہ نگار تمام واقعوں اور تجربوں کو ایک فطری سادگی اور تسلسل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کے اسلوب میں مبالغہ آرائی نہ کے برابر ہوتی ہے اور نہ ہی جذبات کی فراوانی ہوتی ہے بلکہ اس کے یہاں تو داخلی کیفیتوں کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

انشائیہ اور غیر افسانوی نثر:

انشائیہ کی تخلیق میں آورد کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خیال کی آمد کے ذریعے ہی نازل ہوتا ہے کیونکہ یہ کوئی وقتی اور بناوٹی صنف نہیں ہے بلکہ اس میں پایۂ استقامت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کی سرشت صرف اس کی اپنی ہے۔ نیز انشائیہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں دوسری اصناف کا رنگ بھی صاف طور سے دیکھنے کو ملتا ہے، حالانکہ یہ رنگ کلی طور پر نہیں جزوی طور پر موجود ہوتا ہے۔ یعنی دیگر اصناف کی چند جھلکیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو انشائیے کے حسن کو اور بھی دوبالا کر دیتی ہیں۔

انشائیہ اور مضمون

مضمون دراصل انگریزی لفظ اسےّ (Essay) کا ترجمہ ہے اور لفظ 'اسےّ' فرانسیسی لفظ 'Essai' کے مترادف ہے۔ ناقدین کے مطابق 'Essai' لاطینی زبان سے ماخوذ ہونے کے بجائے، عربی لفظ 'اسعی' کی فرانسیسی شکل ہے کیونکہ صدیوں سے اہل عرب کا سکہ اندلس اور جنوبی فرانس پر چلتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان میں لاطینی زبان کے مقابلے میں عربی الفاظ زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمارے یہاں مضمون نگاری انگریزی سے اردو میں آئی۔ اس کے اولین نقوش دلی کالج اور بالخصوص ماسٹر رام چندر کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعد ازیں اس صنف کو فروغ دینے کا سہرا سر سید اور ان کے پیش روکے سر ہے۔ ان اکابرین نے ایک ہی وقت میں مختلف قسم کے مضامین تحریر کیے۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون کو وسیع معنی میں تلاش کیا جاتا رہا اور اس میں اتنی گنجائش پیدا ہوتی رہی تاکہ اس میں سماجی، سیاسی، ادبی، علمی، تاریخی، تحقیقی، تنقیدی موضوعات پر اظہار خیال کیا جاسکے نیز انھیں محرکات کی بنا پر مضمون میں منطقی استدلال، خیالات کا تسلسل، مقصد کی تبلیغ پر سیر حاصل بحث بھی خوب ملنے لگی اور یہی وجہ ہے کہ اس میں خارجی رنگ کا غلبہ زیادہ حاوی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں 'تہذیب الاخلاق' میں سر سید احمد خاں کے لکھے بیشتر مضامین انشائیے نہیں ہیں کیونکہ انشائیہ میں خارجیت سے زیادہ داخلیت پر زور دیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں سنجیدگی نہیں بلکہ نشاطیہ رنگ زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے، جب کہ مضمون میں مضمون نگار سیر حاصل بحث کرتا ہے اور مختلف دلائل و براہین کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ بقول سید محمد حسنین:

''... کسی موضوع پر سنجیدہ فکر آرائی، کسی داخلی کیفیت کا حزن آگیں تمثیلی اظہار، کسی اہم شخصیت کے حالات زندگی، روز ناموں یا رسالوں کے ایڈیٹوریل، جلسوں کی رپورٹ، ڈائری کا ایک ورق، کسی اہم شخصیت کی قلمی تصویر، کسی معروف یا اہم شخصیت کا تعارف و تعاریف۔''13

یہاں پر اعادہ کرنا ضروری ہے کہ مضمون میں سنجیدگی کا پایا جانا ضروری ہے۔ نیز ایک مضمون نگار میں

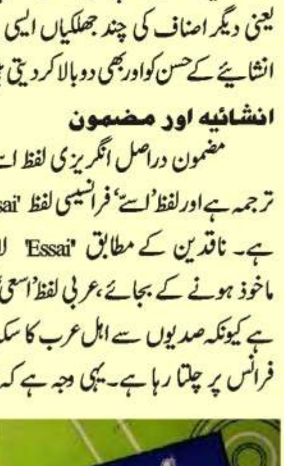

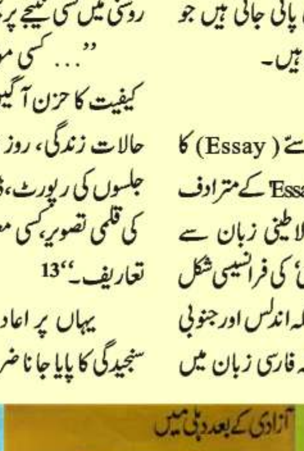

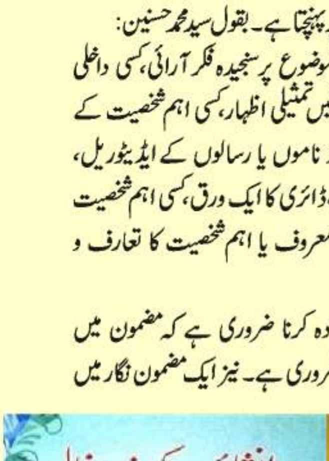

تنوع مزاج کا ہونا بے حد ضروری ہے۔اسے زندگی اور ادب کا پارکھ ہونا چاہیے، ساتھ ہی سچی تصویر کشی پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہو۔ ماضی حال اور مستقبل سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔لہٰذا وہ واحد متکلم بن کر اپنے مضمون کی تخلیق کرے، جس میں تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کارفرما ہو۔ بہرحال یہ تمام اوصاف اگر ایک مضمون نگار میں پیوست ہیں تو وہ کامیاب مضمون نگار کہلانے کا حق دار ہے، جب کہ انشائیہ میں منطقی استدلال کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ یہ ایک آزاد اور خود مختار صنف ہے۔اس میں ایک ایسا (Flow) بہاؤ ہوتا ہے، جس میں انشائیہ نگار بہتا چلا جاتا ہے، لیکن !وہ اس بہاؤ میں حواس باختہ نہیں ہوتا ہے بلکہ ہوشیاری سے اپنی بات کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ آخر میں اپنی بات یا خیالات کو ایسے موڑ پر چھوڑتا ہے، جس سے کہ قاری نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ وہ اس موضوع کے حوالے سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نرم و شیریں لطیف اور نشاطیہ اسلوب انشائیہ کے حسین جوہر ہیں۔ کیا مضمون اور انشائیہ ایک ہی صنف کے دو مختلف روپ ہیں؟ یہ سوال ناقدین ادب میں موضوع بحث بنا رہا ہے۔ دراصل انشائیہ کو مضمون یعنی اسےّ (Essay) اس لیے بھی کہا جاتا رہا کیوں کہ اردو ادب میں ایک طویل وقت تک انشائیہ کی اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی اور اس کو مضمون اور اسےّ کے تحت ہی شمار کیا جاتا رہا تھا۔ بعد میں جب انشائیہ کی پہچان کی گئی اور اس کے خدوخال کو مضمون نگاری سے الگ پایا تو اسے ایک الگ صنف کا درجہ دیا گیا۔

اردو مضمون نگاری اور انگریزی مضمون کی ایک جیسی قسمت رہی ہے کیونکہ جس طرح سے انگریزی میں Essay کو وسیع معنوں میں تلاش کیا جاتا ہے اور یہاں تک کہ ما نٹین (Montaigne) کے لائٹ اسےّ بھی اسی زمرے میں شمار کیے جاتے رہے تھے، لیکن ایک ایسا وقت آیا کہ اسےّ (Essay) کی پہچان کی گئی اور مانٹین کی تحریروں کو اسےّ نہ کہہ کر'لائٹ اسےّ' کہا گیا، کیونکہ اس کی تحریریں سنجیدہ مضمون سے کافی مختلف تھیں۔ یہی حال اردو میں انشائیہ کے ساتھ رہا اور ایک طویل وقت تک 'اسےّ' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ حالاں کہ چند ناقدین ادب کی کوششوں سے اس کو مضمون کی جگہ لطیف پارہ اور نمک پارہ، اسےّ اور انشائیہ جیسی اصطلاحوں سے پکارا گیا۔ بعدازیں انشائیہ کو اس کی تحریری امتیازات کی روشنی میں پرکھا گیا اور آخر کار یہ طے پایا کہ انشائیہ اور مضمون اردو ادب کی آزاد اور خود مختار اصناف ہیں۔

انشائیہ اور طنز

طنز کی ماہیت توصیفی ہے۔اسے ادب میں صنف کا درجہ نہیں دیا گیا۔ پھر بھی اس کا استعمال ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے۔ وہ خواہ شاعری ہو یا نثر طنز نے ادب میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں طنز کا وقیع سرمایا موجود ہے۔ انشائیہ میں طنز کی موجودگی گویا اس کے معنی و مفہوم میں چار چاند لگانے کے برابر ہے۔ دراصل طنز کے معنی میں انتہائی وسعت پائی جاتی ہے اور اُسے بہت سے ناموں سے جانا جاتا ہے۔انشائیہ میں طنز کس معنی میں بولا جاتا ہے، اس کی وضاحت ضروری ہے۔ مثلاً طنز۔ ہجو، ہزل، پھبتی، نوک، جھونک، مذمت، مضحکات، تعریض، تنقید وغیرہ کے لیے مستعمل ہے چونکہ طنز کا متبادل انگریزی میں Satire ہے تو یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقدین ادب نے اس لفظ کو انگریزی سے تعبیر کیا۔ دراصل satire لاطینی زبان سے نکلا ہے جس کے معنی پھلوں سے بھری طشتری کے ہیں۔ یعنی ایک ایسی صنف شاعری جس سے مختلف معاشرتی برائیوں کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے اگر ہم دیگر زبانوں پر نظر ڈالیں تو چند جداگانہ مفاہیم نظر آئیں گے۔ مثلاً فارسی زبان میں طنز کے لفظی معنی افسوس کرنا، مذاق اڑانا، طعنہ دینا، ہنسی اڑانا، وغیرہ کے ہیں لیکن اس زبان میں طنز کا مفہوم 'ہجو' کے معنی میں ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی فارسی زبان وادب میں یہ دونوں لفظ ہجو+طنز'' عموماً ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔

طنز ایک ایسا اسلوب ہے جو کائنات میں پائی جانے والی ہر ناہمواری پر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ ناراضگی کا ایک ایسا حربہ ہے جو طنز نگار کے ذریعے کسی نہ کسی شکل میں وارد ہوتا ہے۔ البتہ طنز کے ذریعے سے ایسے تمام معاملات کی نقاب کشائی کی جاتی ہے جو بے ہنگم ہونے کے ساتھ قبیح بھی ہوتے ہیں۔ طنز ایک ذریعہ ہے جس کے توسل سے ان تمام زخموں کو کریدا جاتا ہے جو ہماری سماجی زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ نیز انشائیہ نگار اکثر و بیشتر انشائیہ تخلیق کرتے وقت اتنی باریک بینی سے طنزیہ جملے کہہ جاتا ہے کہ بظاہر اس طنز کا پتا ہی نہیں چلتا ہے جو غور کرنے پر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انشائیہ میں طنز کا استعمال کم ہی کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ طنز کی زیادتی سے انشائیہ کا حسن زائل ہو جائے گا اور انشائیہ، انشائیہ نہ رہ کر طنزیہ مضمون ہو کر رہ جائے گا۔ نیز طنز ایک تیر کی مانند ہے جسے انشائیہ نگار بڑے احتیاط کے ساتھ برتتا ہے تا کہ اس میں سختی کی جگہ نرمی بھی برقرار رہے۔

انشائیہ میں تقریباً سبھی انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں میں طنز آمیز اسلوب کو متواتر برتا ہے جو کبھی لفظوں کی شکل میں، کبھی جملوں کی شکل میں اور کبھی کبھی پوری عبارتیں طنز کے رنگ میں ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دراصل یہ ایسی تحریریں ہیں جنھیں انشائیہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انشائیہ نگاری میں طنز نگاری کے تمام آداب کا جاننا ضروری ہے۔ انشائیہ میں طنز کی تخلیقی اپج کے ساتھ فکر و خیال کی گہرائی، ادبی حسن کاری، ژرف نگاہی اور نظم وضبط کا سلیقہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ انشائیہ میں طنز کی فراوانی سے پرہیز ہونا چاہیے۔ اس سے انشائیہ کا حسن بھی برقرار رہے گا اور طنز کی آمیزش بھی برقرار رہے گی۔

انشائیہ اور مزاح

طنز کے ساتھ مزاح لازم وملزوم ہے کیونکہ خالص طنز بہت تیکھا اور خلش پہچانے والا ہوتا ہے۔ مزاح کی چاشنی اس کی تیزی کو زائل کر دیتی ہے۔ طنز سے قطع نظر جب ہم مزاح کی تعریف پر نظر ڈالتے ہیں تو مزاح میں دور حسی اور ظریفانہ مزاج کا دخل پاتے ہیں جو سماج کی سطح کی ناہمواریوں کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ مزاح کا انگریزی مترادف Humour ہے اور یہ لفظ لاطینی زبان کے Homour سے مشتق ہے، جس کے معنی مرطوب ہونا ہیں۔ لیکن! یہ لفظ رفتہ رفتہ مضحکہ خیز یا ظرافت کے مترادف ہوتا گیا۔ عربی میں مزاح کے لغوی معنی 'مذاق کرنا' کے ملتے ہیں۔ فارسی میں مزاح کے لفظی معنی دانائی اور خوش طبعی کے ہیں۔ ہندی میں اس لفظ کو 'پریہاس' یا 'ونود' کہتے ہیں۔

مزاح میں وقار اور متانت کا ہونا ضروری ہے، جس میں ذہن وقلب کی پاکیزگی کے ساتھ نیک پہلوؤں کو استعمال کیا گیا ہو اور اس کی جانب سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ دراصل انشائیہ نگار کے لیے مزاح سے ابلاغ کا کام اس لیے لیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے انشائیہ نگاران پیچیدہ ذہنی تاثر کو پیش کرتا ہے، جس کو براہ راست پیش نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہی تاثرات کبھی کبھی قہقہے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مزاح انسان کو ہنسنے ہنسانے پر مجبور کرتا ہے۔ اگرچہ انشائیہ میں نشاطیہ لب و لہجے کا رنگ پہلے ہی سے پایا جاتا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں مزاح کا استعمال طنز کی طرح سے ہلکے پھلکے انداز میں کیا جائے، کیونکہ ضرورت سے زیادہ مزاح سے بھی انشائیہ کا حسن غارت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایسی خالص تحریریں جو صرف مزاح پر مبنی ہوتی ہیں ان کو انشائیہ کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے لیکن وہ دراصل انشائیہ نہیں ہوتی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انشائیہ میں مزاح کا استعمال اتنا ہی ہوتا ہے کہ اس کا حسن برقرار رہے۔ مزاح

انشائیے میں خاکہ نگاری کے نقوش کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انشائیہ نگار انشائیہ کو تخلیق کرتے وقت ایک ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے جس سے عبارت زندہ اور متحرک معلوم ہوتی ہے۔

ایک ایسی تخلیق ہے جس میں بہت سے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان ہی میں سے کسی ایک پہلو کو انشائیہ نگار اپنی بات کی وضاحت کے لیے استعمال کرتا ہے اور زندگی کی نا ہمواریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہے جو تلخ تجربہ ہوتی ہیں۔

انشائیہ میں پائے جانے والے مزاح میں سپاٹ پن اور پھکڑ پن نہیں ہوتا ہے۔ مزاح کی خوبی کسی عمل خیال میں واقع لفظ اور جملے کے خندہ آور پہلوؤں کو دریافت کرنا اور ان سے محظوظ ہونا ہے، چنانچہ اس خوبی سے انشائیہ نگار فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہر قسم کی بے اعتدالی اور بے تکے پن کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ان کے عیوب کی طرف توجہ دلاتا ہے جو سامنے تو ہوتی ہیں لیکن قابل توجہ نہیں سمجھی جاتی ہیں۔

انشائیے کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس کے لب و لہجہ میں مختلف نثری اسلوب کا دخل سبک اور سنجیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش، اسلوب کا زاویہ ہے اور اس سے اکثر و بیشتر تحریر میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے بیشتر انشائیوں میں مزاح بھی ہے اور طنز بھی ہے لیکن اس کی فراوانی کے ساتھ نہیں کہ انشائیہ دب کر رہ جائے گا۔''14

انشائیہ میں طنز و مزاح کا استعمال صرف تحریر کو تقویت پہنچانے کے لیے کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے تحریر میں لذت، خوشی اور چیزوں کو سوچنے کا ایک نیا انداز فراہم ہوتا ہے اور اس سے ایک طرف انشائیے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے دوسری طرف قارئین تک وہ بات پہنچ جاتی ہے جو انشائیہ نگار پہنچانا چاہتا ہے۔ مثلاً رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں طنز و مزاح کا رنگ اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

انشائیہ اور خاکہ

انشائیہ کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک ایسی صنف ہے جس کے اپنے اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ایک ایسا فن ہے جو مشکل ہونے کے ساتھ حد درجہ دلچسپ بھی ہے۔ اس صنف کے ذریعے انشائیہ نگار ایسی کئی اہم شخصیات اور غیر اہم شخصیات کو ان کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ متعارف کرواتا ہے جس تک ہماری رسائی کا ہونا ممکن نہیں کیونکہ ان میں سے بہت سے اسلاف راہی عدم ہو چکے ہیں اور جو حیات ہیں ان سے پل بھر یا چند گھنٹوں کی ملاقات میں جانا نہیں جا سکتا ہے۔ خاکہ ہمارے ادب کا ایک ایسا نایاب ورثہ ہے جس کی عظمت و اہمیت کا زمانے کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ نیز دوسری اصناف کی طرح خاکہ نگاری بھی انگریزی سے اردو میں آئی۔ انگریزی میں اس صنف کو اسکیچ پورٹریٹ کہتے ہیں۔ اردو میں اسے خاکے کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ خاکہ میں خاکہ نگار اپنی تمام فنی اور فکری خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا دلکش اور خوبصورت خاکہ پیش کرتا ہے، جس سے اس کی شخصیت کے تمام اوصاف ایک ایک کر کے قاری کے سامنے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ خاکہ نگار صفحہ قرطاس پر اپنی نوک قلم سے ایسی تصویریں دکھاتا ہے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی اثر انگیز ہوتی ہیں۔

انشائیے میں خاکہ نگاری کے نقوش کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انشائیہ نگار انشائیہ کو تخلیق کرتے وقت ایک ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے جس سے عبارت زندہ اور متحرک معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے انشائیہ نگار مختلف زاویوں کی روشنی میں اپنی بات کو پیش کرتا ہے جس سے انشائیہ کو زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل ہو۔ دراصل انشائیہ میں خاکہ نگاری کا استعمال جزوی طور پر کیا جاتا ہے اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی خصوصیت کو فن کارانہ طور پر برتا جاتا ہے تاکہ انشائیہ کا حسن برقرار رہے اور اس میں کسی قسم کی قباحت یا جھول پیدا نہ ہو۔ بطور نمونہ ایک مثال پیش ہے:

''دفتر سے واپسی پر بابو کا حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بغل میں بستہ اور چھتری سر پر کسی بے ڈھنگے زاویے سے رکھی ہوئی ٹوپی، ہاتھ میں رومال، باچھوں سے بہا ہوا پان اور چہرہ پر دن بھر کی خستگی کے تمام نقوش نمایاں مگر دماغ پر زور دے دے کر یہی سوچتے جاتے ہیں کہ بوائن نے دو پیسہ کے چقندروں اور ایک پیسے پانوں کے علاوہ اور کیا کہا تھا کہ لیتے آنا۔''15

ایسے کتنے ہی انشائیے ہیں جس میں خاکہ نگاری کے نقوش در آئے ہیں۔ یہاں طوالت کے سبب ایک ہی اقتباس پر اکتفا کیا گیا ہے تاکہ قاری کو اس بات سے آگاہی ہو سکے کہ انشائیہ اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے کس خوبصورتی کے ساتھ دوسری اصناف کی خصوصیات کو اپنے اندر ضم کر لیتی ہے۔

مختصراً ان تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں جتنے بھی انشائیہ لکھے گئے ہیں۔ اس کے تمام منفرد امتیازات نے اردو انشائیے کی فنی قدر و قیمت کو نمایاں کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔ انشائیہ کے ان سب فنی اور فکری عناصر کو ان کی تمام، داخلی و خارجی کیفیتوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کرنا ہی اس کی اصل کامیابی ہے۔ فن اور فکر کی یہ امتزاجی روش اختیار کی جاتی رہی تو مستقبل میں اس کے ارتقا کے امکانات واضح ہوں گے اور انشائیہ فطری طور پر وسیع ہو جائے گا، جس میں وہ زمانے کے سارے رنگ دکھاتا ہے۔

حواشی:

1. انشائیہ کے خدو خال، ڈاکٹر وزیر آغا، جامعہ نگر دہلی، 1991، ص50
2. انشائیہ اور انشائیے، سید محمد حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص30
3. اردو انشائیہ، آدم شیخ، برہانی کالج کامرس اینڈ آرٹس، مجگاؤں، ص17
4. صنف انشائیہ، سید محمد حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص237
5. فرہنگ فارسی امروز، ڈاکٹر محشید مشیری، جلد اول، تہران نشر پیکا ن، 1377، ص180
6. New Hindustani English Dictionary,SW Fellon,p.1050
7. آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، مرتب مترجم، شان الحق، ص922
8. ایضاً، ص531
9. قاموس مترادفات، وارث سرہندی، اردو سائنس بورڈ لاہور، ص55
10. ماہنامہ میر نیم روز (کراچی)، 1977، ص187
11. اردو انشائیہ، آدم شیخ، برہانی کالج کامرس اینڈ آرٹس، مجگاؤں، بمبئی، ص30
12. انشائیہ اور انشائیے، سید محمد حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص43
13. ایضاً، ص20
14. انشائیہ کے خدو خال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ جامعہ نگر نئی دہلی، ص: 43
15. انشائیہ اور انشائیے، سید محمد حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص120

■

Dr. Nausheen Hasan
D/O, Ahmad Hassan,
supari merchant, BazarQila Rampur
(UP) 244091

عدیلہ جبیم

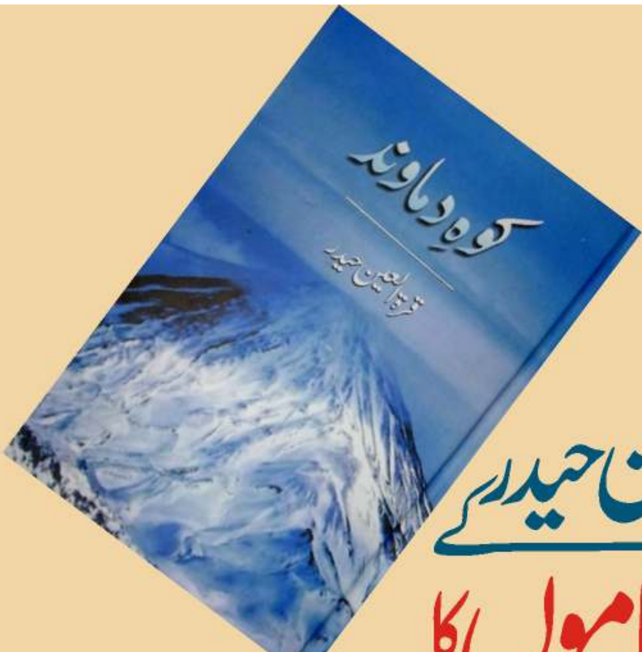

قرۃ العین حیدر کے سفرناموں کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ

(کوہ دماوند اور جہانِ دیگر کے حوالے سے)

قرۃ العین حیدر ایک معروف ناول نگار اور افسانہ نگار تھیں۔ ان کے مشہور ناول میں آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر۔ میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم اور کار جہاں دراز قابل ذکر ہیں اور افسانوں میں پت جھڑ کی آواز، فوٹو گرافر، گردش رنگ چمن، چائے کے باغ، دلربا، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے ناولوں کی اہم خصوصیت شعور کی رو کی تکنیک ہے، جس کو اردو ناولوں میں بحسن وخوبی برتا ہے۔ ان کی تحریر کا اہم موضوع تقسیم ہند کا درد ہے۔

سیر و تفریح کا شوق ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ انھوں نے اندرون ملک اور بیرون ممالک کئی اسفار کیے۔ ان کے سیاحتی شوق اور بے پناہ تحریری صلاحیت کی وجہ سے کئی رپورتاژ وجود میں آئیں۔ ان رپورتاژ کو سفرنامہ کے زمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان تمام رپورتاژ کو دوران سفر ہی تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں ان ملکوں کے تجربات و مشاہدات کو رقم کیا گیا ہے۔ ان رپورتاژ میں کوہ دماوند، جہان دیگر، لندن لیٹر، دکھلایئے لے جا کر انھیں مصر کا بازار وغیرہ اہم ہیں۔

قرۃ العین حیدر کوہ دماوند کا تذکرہ چھیڑ کر یہ تو صاف کر دیتی ہیں کہ ان کا ارادہ ایران کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ بیان کرنے کا ہے اور وہ بھی آنکھوں دیکھا۔

کوہ دماوند سلسلۂ کوہ البرز میں واقع ممکنہ طور پر فعال آتش فشاں ہے جو ایران اور مشرق وسطیٰ کی بلند ترین چوٹی ہے۔ فارسی دیو مالا، لوک کہانیوں اور ادب میں اس کا خاص مقام ہے۔ یہ بحر کیسپین کے جنوب ساحل کے قریب تہران سے چھیاسٹھ کلومیٹر شمال مشرق میں آمل صوبہ مازندران میں موجود ہے۔ وہ ایران کے اس وقت کا قصہ سنانے چلی ہیں جب یہ فارس تھا اور وہ بھی نانی دادی والے انداز میں، اس ملک میں ایک بادشاہ تھا نام اس کا کاکوس تھا بے حد رحم دل رعایا پرور پوری سلطنت میں امن و چین تھا۔ پوری عوام سکھ چین سے زندگی گزار رہی تھی۔ ظالم سفید دیو قوی ہیکل جو انتہائی جسمانی طاقت اور شیطانی دماغ کا مالک تھا۔ ساتھ ہی جادو ٹونے کے اسلحے سے بھی لیس تھا اس کو ایک آنکھ نہ بھایا سلطنت پر حملہ آور ہو گیا۔ اپنے شیطانی جادو اور جسمانی قوت کے زور پر ایسا طوفان برپا کیا کہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ بادشاہ کاکوس کو شکست ہوئی اس کو اور اس کے سپاہ سالار اور دیگر لوگوں کو بندی بنا لیا۔ سبھی کی آنکھیں پھوڑ دی۔ سبھی کو زمین دوز خفیہ غار میں لے گیا جہاں وہ اپنے

اہل وعیال کے ساتھ رہتا تھا۔رعایا بے حال پریشان اپنے راجا کے غم میں نڈھال ایسے میں رستم اپنے سات رفقا کے ساتھ مسیحا کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔وہ سفید دیو کے خفیہ مسکن کا پتہ لگاتا ہے۔پھر جنگ ہوتی ہے سفید دیو مارا جاتا ہے۔اس کا سینہ چاک کر اس کے کلیجے اور خون سے راجا اور سارے لوگوں کا علاج کرتا ہے سبھی صحت مند اور بینا ہو جاتے ہیں۔قصہ کوتاہ ہفت خاں مرحلہ طے ہو جاتا ہے بادشاہ کو اپنا تخت اور رعایا کو اس کا من چاہا بادشاہ مل جاتا ہے۔

''البرز کی گونجتی ہوئی چٹانوں پر سیمرغ پروں میں چونچ چھپائے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔اور باخبر ہے کہ چند فرسنگ پر کاہ طالقان اور کیسپین کے درمیان پر اسرار جنگلوں، چراگاہوں میں وراجنے والا لال دیو بغلیں بجاتا ہے کہ ہفت خاں طے ہوئی اور سفید دیو بالا خرمات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیر اسپ، گشتہ سپ، جامہ سپ، مہراسپ، ارجاسپ، اسفندیار رستم رہاز مین پہ نہ بہرام رہ گیا۔بڑی سخت نیند آرہی ہے۔''

(کوہ دماوند،قرۃ العین حیدر،ایجوکیشنل پبلی سنگ ہاؤس 2000،ص 45)

وہ دنیا کی بے ثباتی پر آنسو بہاتی ہیں اور علامتی طور پر عالم فانی سے عالم باقی تک پہونچنے کا نسخہ بتاتی ہیں اور تب وہ ایک ادیب سے ایک دم صوفی کا روپ دھار لیتی ہیں۔دلوں کا حال جاننے والا سیمرغ اور اپنے درمیان ایک چڑیا کو پھدکتی ہوئی دکھاتی ہیں اور یہ سیمرغ ہفت وادیوں کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے بعد ملنے کا تصور کیا جاتا ہے۔پہلی طلب دجستجو دوسری عشق تیسری معرفت چوتھی استغنا پانچویں توحید چھٹی حیرت اور ساتویں فنا اور جب یہ ساری وادیاں طے ہو جاتی ہیں تو اس کی اپنی شکل اس منزل پہ موجود سیمرغ سے ملتی جلتی ہے۔ 'من عرف نفسہ فقد عرف ربہ' کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔

طہران جسے اب اہل ایران تہران لکھتے ہیں۔سطح سمندر سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر البرز کے دامن میں واقع ہے۔ناصری کے مطابق تہران اور شمران دو گاؤں تھے۔منگولوں کے ہاتھ 'رے' کی تباہی کے بعد وہاں کے باشندوں کو ان گاؤں والوں نے خوش آمدید کہا۔سولہویں صدی میں تہماسپ سفوی روضۂ حضرت شاہ عبد العزیز کی زیارت کے لیے جاتے ہوئے تہران کو پسند کر لیا اور یہاں قلعے بنوائے۔ان کی دیواروں پر قرآنی آیات نقش کروایا اور فصیل میں چودہ پھاٹک لگوائے۔ 1788 میں شاہان قاچار نے تہران کو اپنا دار الحکومت بنایا۔کاخ سعد اسی قلعے میں ہے اس کو رضا شاہ کبیر نے بنوایا تھا اور وہیں پر تخت طاؤس موجود ہے جس پر اب تک شہنشاہ ایران نشیں ہوتے ہیں۔ انھوں نے تخت طاؤس کو آنکھ پھاڑ پھاڑ کے حیرت سے دیکھا جس کی سنہری پشت اور ہتھوں اور پایوں پر فارسی اشعار کندہ تھے۔وہ اپنے تصور میں اس بات کو لانے کی کوشش کرتی ہیں کہ مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلے اس پر آخری بار جب بیٹھ کر اٹھے ہوں گے تو ان کو کیسا محسوس ہوا ہوگا۔جب وہ اس پر نقش فارسی کے اشعار اپنے روز وشب میں اتار رہی تھیں تو کسی نے ان سے کہا کہ اصل تخت طاؤس بانک ملی میں محفوظ ہے یہ اس کی نقل ہے واللہ عالم بالصواب۔

جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ جب وہ تفریح میں حافظ شیرازی کے شہر پہنچتی ہیں تو ان کے ہمراہ پتر کار وہاں چائے خانے کی کثرت دیکھ کر بڑے پتے کی بات بولتا ہے کہ یہاں تو شراب خانہ کی کثرت ہونی چاہیے۔وہ سہم جاتی ہیں کہ وہ جو شغل شراب بھی کرتے ہیں کس شراب خانے کی بات کر رہا ہے۔حافظ شیرازی تو اس شراب عشق حقیقی کی بات کر رہا ہے جس کا پیالہ پی کر منصور انا الحق کہتا ہوا دار پر ہنستے ہنستے جھول گیا۔اس نے بڑا پیارا جواب دیا:

''دیدی ہم کو معلوم ہے حافظ ہمیشہ پرماتما کے گیان کی بات بولتا تھا۔کچھ سناؤ نہ؟''(ص 60)

وہ اس جواب سے بے حد مسرور نظر آتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

''ہوٹل شیراز کے برآمدے میں لوگ باگ آرام کر رہے ہیں۔سارے گورے اور میمیں آرام کرسیوں پر نیم دراز سرد وشیریں تربوز نوش کرنے میں مصروف ہیں اور بیئر پی رہے ہیں۔''(ص 62)

اور وہ محسوس کرتی ہیں کہ ہوٹل کے باغ میں بلبل ہزار داستاں نغمہ سرا ہے۔

خون کرد در دلم اثر آواز عندلیب
گشتم چناں کہ ہیچ نماندم تحملے

''بلبل کی آواز نے جب میرے دل پر اثر کیا میں ایسا ہو گیا کہ میرے اندر قوت برداشت نہ رہی''

نوٹ:(دیوان حافظ میں اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے: چوں کرد در دلم اثر آواز عندلیب)

وہ ایک دن شہر اصفہان بھی جاتی ہیں۔ اصفہان میں شاہ عباس کی شخصیت کی جھلک ہر جگہ موجود ہے۔اس کا دور صفوی خاندان کا عہد زریں کہلاتا ہے۔اس نے اپنے دار الحکومت اصفہان کو اتنی ترقی دی کہ لوگ اس کو اصفہان نصف جہان کہنے لگے۔اس کے وقت میں فنون لطیفہ خاص کر فن تعمیر اور فن مصوری کو بہت ترقی ملی۔ شاندار عمارتیں تعمیر کی گئیں جامع مسجد، چہل ستون، زندہ رود، ندی کے اوپر دو پل اور چہار باغ بہت مشہور ہیں۔ چہل ستون اور مسجد لطف اللہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

قصر چہل ستون میں اطالوی کاریگر فریسکو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا۔ایک فریسکو میں شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں ہمارا ہمایوں بے چارہ سانولا اور چھوٹا سا، ایرانی بادشاہ کے سامنے دوزانو بیٹھا ہے۔اس کے مغل امرا بھی سانولے چھوٹے سے۔سامنے رقاصہ ناچ رہی ہے۔ملٹری ایڈ لینے آیا تھا۔مل گئی۔''(ص 67-66)

سیر وتفریح تاریخ وجغرافیہ آپ کے سفر کا مقصد قطعی نہیں تھا مگر یہ تو آپ کا وصف خاص تھا جو آپ کو ایران کی جہاں تہاں کی خاک چھنوا رہا تھا۔آپ ان جگہوں سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھیں۔حسین مناظر کو آنکھوں میں سمیٹ رہی تھیں اور عہد رفتہ کو آواز بھی دے رہی تھیں۔ حاصل شدہ نتائج اور معلومات کے موتی کو علم کے خزانے میں جمع بھی کر رہی تھیں جو اردو ادب کے شہ پاروں میں ایک اضافہ ثابت ہوا۔ویسے وہ اپنے مقصد اولین سے غافل بھی نہیں تھیں۔ملکہ فرح دیبا کی سوانح حیات کے لیے مواد بھی اکٹھا کر رہی تھیں۔لوگوں سے مل رہی تھیں۔ شاہی خاندان کے افراد سے گفتگو کر رہی تھیں۔اس سلسلے کی کتابیں بھی زیر مطالعہ تھیں، خود ملکہ علیا سے گھنٹوں گفت وشنید اور غور وفکر بھی ہو رہی تھی۔کبھی خلوت میں کبھی جلوت میں کبھی کھلے میدان میں تو کبھی بند کمرے میں کبھی دفتر میں تو کبھی یتیم خانہ کے انتظامیہ آفس میں۔ان کے چلنے کا ڈھنگ ان کے رہنے کا انداز زندگی گزارنے کا سلیقہ شاہ کے ساتھ تعلق، عوام کے ساتھ سلوک، بزرگوں سے احترام، حسب مراتب ادب وقت کی پابندی، ایفائے وعدہ اور بچوں سے شفقت سبھی کچھ جو ایک ملکہ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور سوانح حیات مرتب کرنے میں معاون ہو۔

ان کی یہ سوانح حیات انگریزی میں 'دی ایم پریس' کے نام لکھی گئی تھی اور یورپ کی چھ زبانوں میں شائع کی جانے والی تھی۔مسودہ انھوں نے رمیش سنگھوی کو لندن بھیج دیا۔اسی درمیان مارچ میں بے چارے رمیش سنگھوی ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر فوت کر گئے اور مسودہ بھی گم ہو گیا۔اس کی کوئی دوسری کاپی مصنفہ قرۃ العین حیدر نے نہیں رکھی تھی۔یہ تو وہی ہوا کہ کہاں گئے تھے کہیں نہیں۔کیا لائے کچھ نہیں۔لیکن ایک رپورتاژ یا سفرنامہ ضرور وجود میں آ گیا۔

جہان دیگر

اس سفرنامہ میں امریکہ کے سفر کی روداد ہے۔اس سفر کو انھوں نے 18 عنوانات کے تحت اپنے مخصوص علامتی انداز میں تحریر کیا ہے۔اڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور منجانب

”اکثر سفر ناموں میں امریکہ کی اس تہذیب کو بڑے ھی مثبت انداز میں پیش کیا جاتا رھا ھے لیکن قرۃ العین حیدر سکے کا دوسرا رخ دکھاتی ھیں کہ ان تفریح گاھوں میں موجود زیادہ تر بوڑھی عورتیں ھوتی ھیں جو تنہا وھیل چیئر استعمال کرتی ھیں اور اکیلا پن امریکی تہذیب کا حصہ بن چکا ھے۔ ان کی اولایں ان کے ساتھ زندگی نھیں گزارتیں۔ ساتھ ھی اس بابت بھی توجہ دلاتی ھیں کہ انھوں نے بھی اپنی جوانی میں کچھ کنسٹرکٹو کام نھیں کیا تھا نہ جذباتی رشتوں کی قدر ھی کی تھی۔“

یوحنا عارف، مور کی آخری آہ، گل آفتاب، صور اسرافیل، کوہرے میں جزیرے، خیاباں خیاباں ارم، نادیہ لیلیٰ فاطمہ، ہواؤں کا شہر، دور کی بانسری سر، بانسری کے مختلف سر، سوپ اور اوپیرا، شن شائن اسٹیٹ، فرشتوں کی ملکہ مریم کا شہر، کاؤ بوائے اور ریڈ انڈین، تین ستارہ، ڈکسی مون اور الفا اور اومیگا۔

جہان دیگر اس سفرنامہ کا پہلا مضمون ہے۔ اس مضمون کے ذریعے انھوں نے اپنی سوانح وکوائف کو واضح کیا ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف ان کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اس دو صفحے کے مضمون میں انھوں نے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے۔ ان کی زندگی میں ان کے اپنوں کی اہمیت، ان کے لکھنے کا انداز، ان کے لکھنے کی شروعات، ان کی تحریروں کی تحسین ان کی تحریروں کا موضوع تقسیم ہند کا درد، ایک خوشگوار بچپن اور اس کی یادیں، گڈا گڑیوں کا گھر اور سہیلیاں، بھائی بہنوں سے محبت اور ان سے جدائی، اپنی پسند و ناپسند، اپنی پہلی کہانی لکھنے کی داستان، باتوں باتوں میں تاریخ وتہذیب کا بیان، محترم شخصیتوں سے اختلاف رائے رکھنے کا حسین سلیقہ سبھی کچھ تو انھوں نے مختصر میں بیان کر دیا ہے اور ان کی شگفتہ مزاجی کا عالم ملاحظہ فرمایئے:

”موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوس قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے الفت ہے۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا آبی ہے۔ پردے چمپئی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے مہکتے ہیں۔“

(قرۃ العین حیدر، مرتب جمیل اختر، آئینہ جہاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ص 103)

امریکہ کا شہر شکاگو انھیں تعلیم کا گہوارہ نظر آتا ہے۔ اکیلے اس شہر میں چھ یونیورسٹیاں ہیں۔ وہ یونیورسٹی آف شکاگو کے صدر شعبہ اردو چودھری محمد نعیم کی دعوت پر آئی تھیں۔ اس دوران انھوں نے شہر شکاگو دیکھا۔ شکاگو ان کی نظر میں امریکہ کا اہم ادبی اور تہذیبی مرکز ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ تفریح گاہ بھی ہے اور فن پرستوں اور ڈاکوؤں کا اڈہ بھی ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کس کو کون سی ہوا راس آتی ہے۔ شکاگو شہر کا تعارف انھیں کی زبان میں دیکھیے۔

”شکاگو میں ان گنت تھیٹر بھی ہیں، اوپیرا، بیلے، میوزیم۔ امریکہ کا اہم ادبی اور تہذیبی مرکز ہے۔ مشہور زمانہ میوزیم کے سامنے طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ پیرس سے تولوس لاترک نمائش آئی ہوئی تھی۔ یہی فن پرست شہر ڈاکوؤں کا اڈہ بھی ہے۔“(ص 166)

اکثر سفرناموں میں امریکہ کی اس تہذیب کو بڑے ہی مثبت انداز میں پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن قرۃ العین حیدر سکے کا دوسرا رخ دکھاتی ہیں کہ ان تفریح گاہوں میں موجود زیادہ تر بوڑھی عورتیں ہوتی ہیں جو تنہا وہیل چیئر استعمال کرتی ہیں اور اکیلا پن امریکی تہذیب کا حصہ بن چکا ہے۔ ان کی اولایں ان کے ساتھ زندگی نہیں گزارتیں۔ ساتھ ہی اس بابت بھی توجہ دلاتی ہیں کہ انھوں نے بھی اپنی جوانی میں کچھ کنسٹرکٹو کام نہیں کیا تھا نہ جذباتی رشتوں کی قدر ہی کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ مشرقی عورتوں کے حالات کا مقابلہ جب مغربی عورتوں سے کرتی ہیں تو مشرقی عورتوں کے حالات ان سے بہتر پاتی ہیں:

”یہ تنہا اداس بڑھیاں آج سے نصف صدی قبل جوان لڑکیاں رہی ہوں گی۔ اپنے شوہروں یا دوستوں کے ساتھ لگژری لائنرز پر یورپ کی سیاحت کے لیے جاتی ہوں گی آج کوئی بات کرنے کو روادار نہیں تفریح گاہوں میں ان کی جگہ اوروں نے لے لی ہے۔“(ص 166)

شہر فلوریڈہ کو شن شائن سٹیٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی کی مناسبت سے انھوں نے اس کا عنوان شن شائن سٹیٹ رکھا ہے۔ یہ شہر تیوہاروں اور قدرتی مناظر کے لیے مشہور ہے۔ اس شہر کو وہ رومانس اور لجنڈ کا شہر کہتی ہیں۔ یہاں ان کا قیام سان فرانسسکو اور کیلیفوریا شہر میں رہا۔ امریکہ کی تعلیمی صورت حال سے وہ بہت متاثر تھیں۔ امریکہ میں اس وقت یونیورسٹیوں کی تعداد 2000 تھی جب ہندوستان میں اس کا دس فیصد بھی نہیں تھا۔ سن شائن سٹیٹ کی خصوصیات کا بیان ان کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

”امریکہ میں دو ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔ ہر ریاست میں سرکاری یونیورسٹیوں کا ایک Complex ہے۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا اس ریاست کے چھ شہروں میں اسی نام سے موجود ہے۔ مشہور عالم ’لبرل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے‘ کا حسین اور پر فضا کیمپس۔ خود شہر سان فرانسسکو دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ایک سرسبز پہاڑیاں، اونچے نیچے بل کھاتے راستے مورش ہسپانوی طرز کے مکانات، عظیم الشان ڈاؤن ٹاؤن، تیز نیلا بحرالکاہل۔“(ص 192)

ایری زونا یہ امریکہ کے دوسرے صوبے کے مقابلے گرم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کیلیفورنیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور سرخ صحرائی حسن کی وجہ سے اس علاقے کو” Painted Desert کہا جاتا ہے۔ یہاں دیو قامت کیکٹس پائے جاتے ہیں اور چاروں طرف خشک پہاڑ ہیں۔ اس پر ہسپانوی مکزیکن تہذیب کی چھاپ بھی ہے۔ اپاش قبیلے سے بیس سال تک چلی جنگ 1886 میں ختم ہوگئی۔ امریکی گوروں کے قبضے کے بعد گایوں کے ریوڑ پالنے والوں نے اپنے مویشیوں اور گلوں کی حفاظت کے لیے جن لوگوں کو رکھا وہ ”کاؤ بوائے کہلائے۔ یہ مخصوص لباس اور ہتھیار بند گھوڑوں پر سوار ہوکر ان پتھریلے اور صحرائی علاقوں میں مویشیوں کی حفاظت کرتے تھے۔ اس طرح ایک مخلوط آبادی کا جنم ہوا۔

”اس دکان میں گھوڑوں کی مرصع زین چمڑے کے ملبوسات، ٹوپیاں، ایڑی والے مرصع جوتے، مرصع پیٹیاں کٹار۔ غرض یہ کہ پورا کاؤبوائے ساز وسامان بک رہا تھا۔ برآمدے کے باہر گھوڑا باندھنے کی کھونٹیں بھی موجود تھیں۔ جب گلہ بانی کمپیوٹر اور راڈر اور Remote Control سے شروع ہو جائیں گے۔“(ص 223)

’ریڈ انڈین‘ سے گورے مہاجروں کی لڑائی تو ختم ہو گئی لیکن اصل باشندہ ہونے کے باوجود ان کی حیثیت ایک پسماندہ طبقے کی ہے اور اپنے وجود اور بقا کی لڑائی وہ جس انداز سے لڑ رہے ہیں انھیں مزید پسماندگی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ وہاں کے ریڈ انڈین کی حالت زار دیکھ کر متعجب ہوتی ہیں کہ کیا وجہ ہے آج بھی اپنا مقام حاصل کرنے سے قاصر ہیں جب کہ یہاں کالوں نے ہمت دکھائی لڑ بھڑ کر زندگی کے ہر شعبے میں اپنا مقام حاصل کیا۔ حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں تھا لیکن انھوں نے زندگی کی یہ جنگ لڑی اور جیتی بھی۔ اس طبقے کو بھی معاشرے میں اپنے حق کی آواز بلند کرنی چاہیے۔

■

Dr. Adeela Jaseem
Asst. Professor
K.S College (LNMU)
Darbhanga- 846003 (Bihar)

الطاف احمد

منشی محمد الدین فوق

مورخ، ادیب، صحافی، سوانح نگار، شاعر و فکشن نگار منشی محمد الدین فوق بیسویں صدی کے نصف اول میں ادب وصحافت کے شعبے میں ایک اہم اور ممتاز شخصیت کے بطور معروف ہوئے علمی وادبی مصروفیات کے علاوہ کئی تحریکوں میں سرگرمی سے شریک رہے۔

فوق نے اپنی پوری زندگی علمی و ادبی کاموں میں گزار دی۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن بلکہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مورخ، شاعر، ناول نگار، معتبر صحافی، ناشر اور مصلح قوم اور ایک تحریکی آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے عہد میں بڑے فعال اور سرگرم عمل رہے ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔

فوق چونکہ اصلاً ونسلاً کشمیری تھے جن کے دل میں محبت کشمیر کوٹ کوٹ کر رچی بسی تھی اگر خطہ کشمیر کو ان کے فنی سفر کا مرکز ومحور بنا کر دیکھا جائے تو اردو ادب کی تاریخ میں ان کو جو اولیت اور اہمیت حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں۔

فوق کی تحریروں کی خصوصیت اصلیت اور سادگی ہے جو حالی کے بقول شاعر کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں سادگی فوق کی زبان میں بھی ہے اور فکر میں بھی ہے زبان کی سطح پر سادگی شاعر کی قادرالکلامی کی دلیل ہوا کرتی ہے۔

فوق کا نام کشمیر میں ایک درخشندہ ستارے کی مانند ہے وہ ہرفن مولا تھے۔ انھوں نے ہر میدان میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔ صحافت اور تاریخ نویسی ان کا خاص میدان رہا ہے۔ فوق نے اپنی تخلیقات کے ذریعے کشمیر اور اہل کشمیر کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور سوتی ہوئی روح کو جھنجوڑا۔ اپنے اخبارات، رسائل اور دیگر تخلیقات کے ذریعے کشمیر اور اہل کشمیر کی خدمت کرنے میں سرگرداں رہے۔

فوق اور اقبال فصیح الملک میرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ فوق نے لاہور میں علامہ اقبال کے ساتھ کئی مشاعروں میں اپنا کلام پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ شاعری میں بھی ان کا بنیادی و اہم موضوع کشمیر ہی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ شاعری کے ذریعے پیغام امن و آشتی، یکجہتی ومحبت اور محنت وریاضت بھی دیتے ہیں۔ ان کا شعری کلام شعری محاسن وخوبیوں کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں کلام فوق اور نغمہ گلزار۔

فوق نے جو غزل اصلاح کے لیے داغ دہلوی کو بھیجی تھی اسکا ایک شعر ہے۔

اے صبا تجھ سے کھلے گی نہ میرے دل کی کلی
میں ہوں اس گل پہ تصدق جو گلستاں میں نہیں

داغ نے جواب میں مرحمت فرمایا "فوق صاحب میں تمھاری طبیعت سے بہت خوش ہوا اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو"

داغ کی اس سند استادی سے اپنے ذوق سلیم پر فوق کا اعتماد پختہ ہو گیا ان کا یہ شعر اس کی تصدیق کرتا ہے۔

داغ کا فیض اگر یونہی رہے گا اے فوق
مان جائیں گے سخنور بھی فصاحت میری

فوق فطری شاعر تھے اور غزل، نظم، قصیدہ، رباعی اور مرثیہ وغیرہ تمام اصناف سخن پر خوب دسترس رکھتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے 'کلام فوق' کے محاسن کا تذکرہ اکبر الہ آبادی کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

کلام فوق بلاشبہ قابل داد ہے جب خیالات اچھے ہوں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں شوخی کا اظہار بھی ہے۔ نیچرل کیفیتوں کا اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کے شان نزول نے تو آپ کی جدت آفرینی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔" (نقوش، شخصیات نمبر، حصہ دوم)

فوق جموں وکشمیر کے صف اول کے مایہ ناز فکشن نگار تھے۔ آپ بلاشبہ جموں و کشمیر کے اولین افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا اولین مجموعہ 1928 میں منصۂ شہود پر آیا۔ فوق کی فکشن نگاری مشرقی مزاج سے ہم آہنگ ہے فوق نے اپنے افسانوں کو 'حکایات' کا نام اس لیے دیا ہے کہ ہماری تہذیبی، جمالیاتی اور ثقافتی زندگی میں قصہ و حکایات کی اہمیت، اظہر من الشمس ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا نقطہ آغاز کہاں اور کیا ہے؟ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کشمیر کے مشہور مورخ، محقق، صحافی، شاعر اور فکشن نگار محمد الدین فوق نے اہل کشمیر میں حب الوطنی، انسان دوستی، اعلی اخلاقیات اور سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کرنے کے لئے 'حکایات' (افسانچہ یا منی افسانہ) کی ہیئت میں جو افسانے لکھے اور ریاست جموں وکشمیر کے ابتدائی برسوں میں مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو رہے تھے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'حکایات کشمیر' کے نام سے 1928 میں شائع ہوا۔ راشد الخیری' جوش اور پریم چند کی ابتدائی کہانیوں کے طرز پر فوق کی کہانیاں بھی مقصدی، اخلاقی اور اصلاحی نوعیت کی ہیں۔ فوق کے مختصر افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں 'حکایات کشمیر' 'سبق آموز کہانیاں' اور 'دلبستان اخلاق' مگر ان تینوں میں 'حکایات کشمیر' دستیاب ہے۔

فوق نے ناول بھی لکھے ہیں پہلا ناول 'انارکلی' 1900 میں شائع ہوا اس کے علاوہ 'اکبر' 'ناکام' 'نیم حکیم خطرہ جان' 'غریب الدیار اور 'عصمت آرا' قابل ذکر ہیں۔ ناولوں کے موضوعات بھی اصلاحی' سماجی ومعاشرتی طرز پر ہیں۔

فوق برصغیر کی پرانی علمی' ادبی وصحافتی محفلوں کے آخری چراغ تھے آپ نے صبح طفلی سے شام پیری تک گیسوئے اردو کو سنوارنے میں حصہ لیا۔ اخبار نویسی کے علاوہ بے شمار کتابیں تصنیف کیں جو مقبول ومحبوب ہیں اور آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

آپ کے قریبی ساتھی عبداللہ قریشی اپنے مضمون 'منشی محمد الدین فوق' میں لکھتے ہیں "فوق صاحب ہنگامہ خیزیوں سے الگ گوشہ عافیت میں رہ کر خاموشی سے کام کرنے کے علاوہ خلوص ومحبت وہمت، شوخی وظرافت، جذبہ ایثار اور ذوق خدمت سے سرشار تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، خوش اخلاقی، خوش مزاجی اور خوش مذاقی کی وجہ سے ان کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

فوق میں ایک اچھے صحافی کے خصائص کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی خداداد تخلیقی صلاحیت سے صحافت کا عمدہ اور دلکش نمونہ پیش کیا ہے۔ صحافت کا آغاز

فوق نے 'پیسہ اخبار' سے کیا اس کے یکے بعد دیگرے چھ رسالے جاری کیے جو کشمیر اور اہل کشمیر کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی خدمات کے لیے وقف تھے فوق اپنے صحافتی وسائل سے دل و جان سے ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ 1901 میں اپنا پہلا اخبار 'پنجہ فولاد' جاری کیا۔ 1906 میں 'کشمیری میگزین' اور 1912 میں 'اخبار کشمیر' جاری کیا۔ پہلے اخبار 'پنجہ فولاد' کے جاری ہونے پر علامہ اقبال نے لکھا تھا۔

پنجہ فولاد اک اخبار ہے
جس سے سارا ہند واقف کار ہے
ہے روش اس کی پسند خاص و عام
واہ واہ کیا معتدل اخبار ہے

بقول عبداللہ قریشی ''فوق صاحب نے ایک ثقہ انسان کی زندگی بسر کی ساری عمر اخبار نویسی کی یا پھر تاریخ نویسی پر بیش بہا کتابیں لکھیں حوالہ نقوش نمبر (1897)

انھوں نے مولوی محبوب عالم سے اخبار نویسی سیکھی اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ تمام بڑے بڑے صحافی ان کو مان گئے۔

'کوہ نور' کے ایڈیٹر بھی رہے اپنا اخبار 'پنجہ فولاد' جاری کیا جو 1960 میں بند ہو گیا۔ 'کشمیری میگزین' جسے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے 'تہذیب الاخلاق' کے انداز کا رسالہ قرار دیا ہے۔ 'گلزار ہند' 1901 میں فوق صاحب کے ہاتھوں جاری ہوا 'کشمیر گزٹ' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ 1933 میں سری نگر سے ہفتہ وار اخبار 'کشمیر جدید' جاری کیا۔ فوق کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کی درسگاہ بنا رہا تھا۔ فوق کو جنون کی حد تک پیشہ صحافت سے لگن تھی اسی لیے انھوں نے سرکاری ملازمت ترک کر کے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔

علامہ اقبال ایک خط میں فوق کو لکھتے ہیں:

ڈیر فوق... 'کشمیری میگزین' دیکھتا ہوں تو اس میں جو کامیابی آپ کو ہوئی اور ہو رہی ہے اس لیے مبارک باد دیتا ہوں۔''

جگن ناتھ آزاد اپنی تصنیف 'اقبال اور کشمیر' میں رقمطراز ہیں:

''ماہنامہ 'کشمیری میگزین' 1935 میں کشمیر کی خدمت کے لیے وقف تھا علامہ اقبال کو اس کے مدیر محمد الدین فوق سے ایک خاص تعلق خاطر تھا اور اس میں اقبال کی بعض ایسی نادر تحریریں شائع ہوئی جن کا مطالعہ آج بھی فکر اقبال کے مطالعے کے لیے اشد ضروری ہے۔

منشی محمد الدین فوق کو یہ بھی اولیت حاصل ہے کہ آپ نے علامہ اقبال کے حالات زندگی لکھے:

علامہ اقبال 23 اگست 1915 کو ایک خط میں فوق صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

مولوی محمد الدین فوق ایک صاحب ذوق آدمی ہیں ان کی جدت پسند طبیعت ہمیشہ انوکھی باتوں کی تلاش میں رہتی ہے... وہ محنت سے گھبرانے والے نہیں۔ فوق کی تلاش (تحقیق) قابل داد ہے اور انسانی قلب کی گونا گوں کیفیات پر نظر ڈالتی ہے۔'' منشی محمد الدین فوق کی علامہ اقبال سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں جن میں عموماً شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ دونوں کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی۔ فوق کا نام کشمیر کی ادبی تاریخ اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے گا۔

بقول عبداللہ قریشی ''منشی محمد الدین فوق نے ایک صحافی، ایک ادیب، ایک مورخ اور ایک شاعر و نثر نگار کی حیثیت سے اردو زبان کی قابل قدر خدمات انجام دیں وہ اپنے پیچھے اتنے کارنامے چھوڑ گئے ہیں کہ دنیا انھیں مدتوں نہیں بھلا سکتی۔''

منشی محمد الدین فوق نے ادبی کام کے علاوہ کشمیری مزدوروں کو بھی منظم کرنے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کے سلسلے میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی انہی بے لوث خدمات سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے انھیں 'مجدد کشامرہ' کا خطاب عطا کیا اور کہا ''اگر آپ کے قلم سے کشمیر کے باشندوں اور پسماندہ مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو گی تو یہی خدمت آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔''

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی تصنیف 'کشمیر میں اردو' میں رقمطراز ہیں:

''فوق اچھے شاعر بھی تھے لیکن کشمیر کے اردو ادب میں ان کا بڑا کارنامہ ان کی تاریخی اور سوانحی تصانیف ہیں ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ بعض وقت گنتی مشکل ہو جاتی ہے خود فوق نے اپنی تصانیف کی تعداد 70 بتائی ہے۔''

فوق نے سرسید' شبلی' حالی اور شرر کی اپنے اپنے میدان میں تقلید کی اور ان کے ساتھ فوق کی فنی مماثلتیں رواں ہیں۔ بقول کلیم اختر ''فوق ناول نویسی میں مولانا عبدالحلیم شرر سے متاثر ہیں۔''

فوق علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ عملی طور پر بھی مختلف تنظیموں اور تحریکوں میں شامل رہے۔

تاریخ نویسی، سوانح نگاری، شاعری اور صحافت کے علاوہ فوق نے ناول اور حکایات (افسانے) لکھے اور ایک غیر مطبوعہ ڈرامہ 'زمیندار کی سرگذشت' بھی لکھا۔

تاریخ نویسی فوق کے رگ و ریشے میں پیوست ہے وہ کسی بھی صنف پر قلم اٹھاتے ہوئے تاریخی پہلو کو کبھی نہیں بھول پاتے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ بلکہ عظیم المرتبت مورخ ہیں جس ادبی کارنامے نے انھیں شہرت عام و بقاء دوام بخشی وہ تاریخ نویسی تھی تاریخ نویسی فوق کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ بحیثیت مورخ وہ برصغیر میں شہرت حاصل کر چکے ہیں اور مورخین کشمیر کی فہرست میں صف اول کے مورخین میں شمار ہوتے ہیں۔ جموں و کشمیر میں انھیں بحیثیت مورخ، افسانہ نگار، صحافی، خودنوشت اور ناول نگار کے اولیت حاصل ہے۔ فوق نے سب سے پہلے اردو میں 'تاریخ کشمیر' لکھی اس کے بعد انھوں نے کشمیر اور کشمیر کی تاریخ کے متعلق دو درجن سے زائد کتابیں تالیف کیں جن میں 'تاریخ اقوام کشمیر' تاریخ پونچھ' تاریخ بڈشاہی' تاریخ شالامار' تاریخ کا روشن پہلو' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بقول عبدالاحد'' محمد الدین فوق نے کئی کتابوں کو ترتیب دے کر کشمیر کے تاریخی مواد میں اضافہ کیا ہے اور کئی کشمیری مورخوں کو یہاں کے حالات قلم بند کرنے کے لیے متحرک کیا ہے۔''

اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمد الدین فوق کا شمار بیسویں صدی کے صف اول کے مورخوں میں ہوتا ہے اور ان کی تاریخی عظمت مسلم ہے۔

فوق کے نام اقبال کے 22 خطوط ملتے ہیں جو 'روح اقبال' میں شامل ہیں۔

فوق نے 100 سے زائد کتابیں لکھیں چھ سات رسالے جاری کیے اپنے زمانے کی کئی تحریکوں میں حصہ لیا۔ اس طرح وہ کامیاب صحافی' ادیب تاریخ کے جید عالم اور اصلاح معاشرہ کے بہت بڑے داعی تھے۔

فوق کا مطالعہ تحقیقی نقطہ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً یہ بات تحقیقی نقطہ نظر سے تعجب خیز ہے کہ اردو ادب کی تاریخوں اور ناولوں کے جائزوں میں فوق کا ناول نویسی پر کوئی مواد نہیں ملتا جبکہ فوق کے دو ناول 'اکبر' اور 'انارکلی' 1900 تاریخی ناول ہیں جو معاشرتی مسائل کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ فوق کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے جن کے بند دریچوں کو وا کر کے اردو ادب کے خزانے کو مزید مزین کرنے کی ضرورت ہے۔

مراجع ومصادر

1. شیرازہ فوق نمبر، کلچرل اکیڈمی سرینگر
2. ڈاکٹر صابر آفاقی
3. محمد عبداللہ قریشی: حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں
4. پروفیسر عبدالقادر سروری: کشمیر میں اردو
5. نقوش آپ بیتی نمبر لاہور جون 1964
6. محمد الدین فوق تاریخ اقوام کشمیر مکمل

Altaf Ahmad
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Kashmir
Srinagar- 190006 (J&K)
Email.: altafnizami96@gmail.com

محمد اسماعیل

زبانیں ہی ثقافت کی محافظ ہیں

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورت حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجہ کیا ہے؟

جواب: بہت سی ایسی زبانیں جو معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں، کہانیوں، گیتوں اور تاریخی روایات سے بھرپور ثقافت کے خزانوں سے مالا مال ہیں، لیکن ان کا اگلی نسل تک منتقل ہونا دشوار ہوچکا ہے، کیونکہ ان کے پاس تحریری صورت میں کچھ بھی نہیں۔ اگر یہ زبانیں مٹ گئیں تو یہ انمول خزانہ بھی معدوم ہوجائے گا۔ زبانیں ہی ثقافت کی محافظ ہیں، زبانوں کے بولنے والے اپنے احساسات وجذبات کا اظہار ان ہی زبانوں کے ذریعے کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی خاص ثقافتی رنگ یا خیال کو کسی دوسری زبان میں اسی کیفیت کے ساتھ ترجمہ کرکے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے کسی بھی زبان کو اپنی شناخت کو باقی رکھنے کے لیے زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہوگا۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا نیا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: انسان ابتدا ہی سے ترسیل و ابلاغ کا عادی رہا ہے خیالات کی ترسیل اور جذبات کے اظہار کے لیے انسان نے زبان کی ایجاد کی اور زندہ زبان سے مراد وہ زبان ہے جسے لوگ ترسیلِ خیالات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ترسیل و ابلاغ کا موثر ذریعہ سوشل میڈیا ہے۔ آج سوشل میڈیا سے ہر فرد جڑا ہوا ہے۔ کسی بھی زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رسائی عام انسانوں تک ہو تب کہیں جا کر اس کی بقا اور ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ ساتھ ہی زبان کی آبیاری کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی لازمی ہے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

ج: زبان ایک ایسا درخت ہے جس کے سائے میں تہذیب وثقافت پروان چڑھتی ہے تہذیب وثقافت کا عمدہ وسیلہ زبان ہے اور ہر زبان کا ادب جب تخلیق کیا گیا اس وقت کی تہذیب وثقافت کی وہ موثر عکاسی پیش کرتا ہے۔ ہندوستان وہ واحد ملک ہے جہاں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں شاید ہی کسی دوسرے ملک میں بولی جاتی ہوں گی۔ ملک ایک لیکن ریاستیں الگ الگ یہ علیحدہ ریاستیں اپنی علیحدہ علیحدہ تہذیب وثقافت کو اپنی علیحدہ زبانوں کے ذریعے پیش کرتی ہیں، لیکن اردو زبان کے حصے میں کوئی ریاست نہ آنے کے باوجود وہ پورے ہندوستان کے تہذیبی وثقافتی ورثے کی علمبردار ہے۔

س: کیا زبان کی موت سے انسانی ورثے کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہے؟

ج: یہ بات صدفی صد صحیح ہے کہ زبانیں اپنے آپ میں ایک خزانہ ہوتی ہیں اور اگر وہ ختم ہوجائے تو انسانی بقا کے

لیے کافی مسائل درپیش ہوں گے کیونکہ نئی نسلوں کو ادب، اخلاق، اقدار، زندگی کے نشیب و فراز وغیرہ کا علم حاصل کرنے کا زبان سے مؤثر کوئی دوسرا وسیلہ نہیں۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: سماج مختلف علوم وفنون اور زبانوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی زبان میں خواندگی، سیاسی، سماجی مواد کی کمی سے اگر چہ زبان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ہے لیکن اگر شرح خواندگی، سائنسی، سماجی علوم میں اضافہ کیا جائے تو زبان اور سماج کو فروغ حاصل ہوگا۔

س: موجودہ دور میں اردو زبان کو خطرہ کس طرح لاحق ہے؟

ج: جدید دور میں نئی نسل اردو زبان کو شدت سے ترک کر کے دیگر زبانوں کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی اور مغربی تہذیب وثقافت کے سیلاب کی وجہ سے دنیا کے بیشتر ممالک میں تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کے نقصانات اور فوائد بھی ہیں اسی ٹیکنالوجی سے قدم سے قدم ملا کر چلنے، یا اردو زبان کو ذریعہ معاش بنانے والے اردو کا دم بھرنے والے اپنی اولاد کو اردو کے بجائے انگریزی زبان وعلوم کو سیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اس طرح کے اور بھی کئی نکات ہیں۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: موجودہ دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے جس طرح مختلف دستی فنکاروں کو زوال آگیا۔ کتب خانوں کی اہمیت میں کمی، قاری کی تعداد میں کمی، یہ تمام چیزیں اردو زبان کو زوال کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ دوسری جانب جہاں سوشل میڈیا تشہیر کا بہترین ذریعہ ہے لیکن یہاں جو اردو زبان لکھی جا رہی ہے اس میں اغلاط کی بھرمار دیکھی جا سکتی ہے جو اردو زبان کے زوال کا سبب بن سکتی ہے برخلاف اس کے سوشل میڈیا کا استعمال اردو زبان کے فروغ کے لیے کیا جائے تو ممکن ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کیا ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہے؟

ج: ماحول عمومی طور پر اکتسابی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان جہاں اردو زبان کی ابتدا ہوئی۔ یہاں کے موجودہ ماحول پر ہندی اور انگریزی زبان کا دبدبہ نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے طالب علم میں انگریزی، ہندی اور اردو الفاظ میں کسی بھی قسم کے فرق کا احساس نہیں ہے ہمارے علاقے کی صورت حال یہ ہے کہ مراٹھی، ہندی انگریزی کا ماحول اردو کے مقابلے میں زیادہ دکھائی دیتا ہے ساتھ ہی ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے پروگرام اور موبائل پر مختلف اپلیکیشن وغیرہ پر آنے والے اشتہارات میں کثرت سے ہندی اور انگریزی کے استعمال سے نئے طالب علم اور اردو زبان کے طالب علم دونوں میں ایک طویل فاصلہ بنتا جا رہا ہے دوسری جانب اساتذہ بھی اس تبدیلی کو محسوس کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں زبان کے فروغ کے لیے اردو کے سوشل میڈیا کے ذریعے صحیح املا اور تلفظ کی تشہیر ہو، اسکول کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر اردو زبان کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں عمل میں لائی جائیں۔

س: کیا اردو کی تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہی ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریبا رُک سی گئی ہے؟

ج: اردو زبان کی کتابوں کی اشاعت کے متعلق کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ان کی اشاعت رک سی گئی ہے اردو کے لکھنے والے اپنی زیادہ توجہ ادب پر مرکوز کرتے ہیں کیونکہ زبان سے متعلق جہاں پڑھنے پڑھانے کا رجحان کم ہوگیا ہے اگر زبان سے متعلق عنوانات نصاب میں شامل رہنے کے باوجود اس کو تقریباً جگہوں پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: یقیناً کلاسیکیت ہی وہ شے ہے جو زبان کو زندہ رکھنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے کسی بھی تہذیب وثقافت کو منعکس ہونے کے لیے کسی نہ کسی زبان کا وسیلہ درکار ہوتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی علمبردار زبانوں میں اردو زبان اپنا ایک مقام رکھتی ہے یا یوں کہیے کہ مشرقی تہذیب وثقافت کی علمبردار اردو زبان ہے۔ جدیدیت پر گفتگو بھی زبان کے لیے واقعی نفع بخش ثابت ہوگی کیونکہ جدیدیت کے ذریعے حال اور مستقبل میں رونما ہونے والے مسائل کا حل اور جدید وسائل سے استفادہ کر کے زبان اپنی نئی منازل طے کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے علاقے میں انگریزی میڈیم اسکولوں کی بڑھتی تعداد کے باوجود اردو میڈیم اسکولوں میں طلبا کی تعداد پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ شہر میں تقریبا 25 اردو میڈیم اسکول ہیں، جن میں ضلع پریشد، سرکاری و نیم سرکاری بلدیہ (مونسپل کارپوریشن) اداروں کا شمار ہوتا ہے ان میں اساتذہ کی تعداد 250 سے 300 کے درمیان ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ویسے تو شہر کے کالجوں میں قومی وعلاقائی اخبارات اور رسائل پابندی سے طالب علموں کے مطالعے کے لیے آتے ہیں۔ لیکن عام شہریوں کے مطالعے کے ذوق کی آبیاری کے لیے بلدیہ (مونسپل کارپوریشن) کی شہر کے مختلف علاقوں میں چار لائبریریاں موجود ہیں، اور ریاست مہاراشٹرا کا پہلا 'اردو گھر' شہر میں ہونے کی وجہ سے یہاں کی لائبریری میں بھی اردو کے مختلف اخبارات پابندی سے آتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو تنظیمی ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں؟

زبان ایک ایسا درخت ہے جس کے سائے میں تہذیب و ثقافت پروان چڑھتی ہے تہذیب و ثقافت کا عمدہ وسیلہ زبان ہے اور ہر زبان کا ادب جب تخلیق کیا گیا اس وقت کی تہذیب و ثقافت کی وہ موثر عکاسی پیش کرتا ہے۔ ہندوستان وہ واحد ملک ہے جہاں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں شاید ہی کسی دوسرے ملک میں بولی جاتی ہوں گی۔ ملک ایک لیکن ریاستیں الگ الگ یہ علیحدہ ریاستیں اپنی علیحدہ علیحدہ تہذیب و ثقافت کو اپنی علیحدہ زبانوں کے ذریعے پیش کرتی ہیں، لیکن اردو زبان کے حصے میں کوئی ریاست نہ آنے کے باوجود وہ پورے ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کی علمبردار ہے۔

ہندوستان میں ہر علاقے کی اپنی اپنی زبان ہی اس کی پہچان ہے ان علاقائی زبانوں کے بعد اگر کوئی زبان ہندوستان میں رائج ہے تو وہ اردو ہی ہے اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے جدید دور کے تمام وسائل کو بروئے کار لانا ہوں گا مثلاً مشاعرے، بیت بازی، اخبارات کی اشاعت، اسکولی سطح پر طرحی مشاعرے ان مشاعروں میں علاقائی زبان کی طلبا و اساتذہ کی شرکت کو بڑھانا ہوگا غیر اردو داں طبقے کے ساتھ اردو زبان میں گفتگو اردو زبان کے فروغ کے لیے سود مند ثابت ہوسکتی ہے۔

ج: شہر میں مختلف تنظیمیں اردو کے فروغ کے لیے اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں جن میں 'فروغ اردو فورم' بڑے فعال انداز میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں شہر کے 'اردو گھر' کا افتتاح 2021 میں عمل میں آیا محبانِ کو امید ہے کہ یہاں سے اردو زبان کے فروغ کے اقدامات انجام دیے جائیں گے۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوشش کر رہے ہیں؟

ج: اردو زبان کے طالب علم کی حیثیت سے پچھلے چودہ برسوں سے شہر میں اردو درس و تدریس کے کام سے وابستہ رہا ہوں۔ میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہوں کہ اپنے طالب علموں میں اردو ادب کے متعلق بیداری پیدا ہو۔ انھیں اردو زبان و ادب کی طرف مائل کر کے اردو کے فروغ میں میں اپنا حصہ درج کراوں۔

س: آپ کے ذہن میں اردو کے فروغ کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جدید تہذیب یا مغربی تہذیب کے غلبے نے ساری دنیا میں ایک بے چینی کی کیفیت پیدا کر دی جس کی وجہ سے انسانیت آج بھی سکون و راحت کی متلاشی نظر آتی ہے۔ یہ راحت و سکون انھیں مشرقی تہذیب میں ہی مل سکتا ہے۔ مشرقی تہذیب و ثقافت کی زندہ جاوید مثال اردو زبان و ادب ہمیں ہمارے ادبی ورثے کو آنے والی نسلوں تک عمدہ طریقے سے پہچانا ہوگا جو جدید وسائل کے استعمال سے ممکن ہوسکتا ہے اور وہ آنے والی زندگیوں میں سکون و راحت کا باعث بنے گا۔ یہی کوشش اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کافی معاون ثابت ہوگی۔ علاقائی سطح پر اردو میں عمدہ خدمات انجام دینے والے شاعر، ادیب، صحافی وغیرہ کے لیے سرکاری اعزازات کا نظم رکھا جائے۔ سوشل میڈیا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے مضر اثرات کا خیال بھی رکھا جائے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد سے دنیا میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ 1980 میں دنیا کی اکثر زبانوں کو کمپیوٹر میں استعمال کیا جانے لگا تھا لیکن اردو زبان کے لیے بہت ساری دشواریاں پیدا ہوئیں اور یہ احساس پیدا ہوا کہ اردو زبان اس تیز رفتار ٹیکنالوجی کی زد میں آ کر ختم ہو جائے گی۔ 1981 میں 'احمد مرزا جمیل' نے 'جمیل نوری نستعلیق' فونٹ کی ایجاد کی۔ اس ایجاد نے اردو زبان کی ترقی میں پر لگا دیے اردو رسم الخط کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ جدید برقیاتی دور کا ساتھ نہیں دے سکتی لیکن 'جمیل نوری نستعلیق' کی ایجاد نے اردو کی اس خامی کو دور کیا۔ اردو زبان کا معارف سافٹ ویئر 'ان پیج اردو' اسی نوری نستعلیق کا مرہون منت ہے۔ لیکن آج تقریباً 40 برس گزر جانے کے بعد ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود اردو کے فروغ میں رسم الخط اہم رول ادا کرتا ہے" MSWord "میں ہم بہ آسانی اردو رسم الخط تحریر کر سکتے ہیں لیکن" Google "اور دیگر پلیٹ فارم اور موبائل اپلیکیشنو ں پر اردو رسم الخط آسانی سے استعمال کرنے کی سہولت فراہم کرنی ہوگی۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورت ہوسکتی ہیں؟

ج: ہندوستان میں ہر علاقے کی اپنی اپنی زبان ہی اس کی پہچان ہے ان علاقائی زبانوں کے بعد اگر کوئی زبان ہندوستان میں رائج ہے تو وہ اردو ہی ہے اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے جدید دور کے تمام وسائل کو بروئے کار لانا ہوں گا مثلاً مشاعرے، بیت بازی، اخبارات کی اشاعت، اسکولی سطح پر طرحی مشاعرے ان مشاعروں میں علاقائی زبان کی طلبا و اساتذہ کی شرکت کو بڑھانا ہوگا غیر اردو داں طبقے کے ساتھ اردو زبان میں گفتگو اردو زبان کے فروغ کے لیے سود مند ثابت ہوسکتی ہے۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان میں لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: میرے والد نے علاقائی زبان مراٹھی میڈیم سے اپنی تعلیم مکمل کی لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ وہ اردو زبان لکھ، پڑھ، بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ میری والدہ میرے، دو بھائی دو بہنیں اور اہلیہ نے بھی اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔ میری دختر 'مائرہ فاطمہ' فرزند 'محمد ذہیب' کو اردو میڈیم اسکول میں داخل کیا گیا۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: ان شاء اللہ! ضرور اور میں اپنی اولاد کو اس عظیم زبان کی بقا کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنے کی ترغیب دوں گا۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کو موازناتی طور پر پیش کیا جائے۔ اردو پروگرام میں غیر اردو داں طبقے کو مدعو کر کے اس پروگرام کی نظامت کو اردو و علاقائی زبان میں انجام دیا جائے غیر اردو داں طبقے کو اردو زبان سکھانے کے لیے مختلف قسم کے پروگرام علاقائی سطح پر چلائے جائیں اور علاقائی زبانوں کے اساتذہ کو اردو زبان سکھائی جائے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز، یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے شہر میں ایک یونیورسٹی 'سوامی راما نند تیرتھ مراٹھواڑاہ یونیورسٹی ناندیڑ' ہے لیکن افسوس کی بات یہ کہ مختلف کوششوں کے باوجود شعبہ اردو کا قیام عمل میں نہیں آسکا، لیکن اس سے منسلک ڈگری کالجوں میں طلبا و اساتذہ کی تعداد اطمینان بخش ہے۔ جونیئر کالجز کی تعداد 10 ہے لیکن کچھ مراٹھی میڈیم کالجوں میں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: غیر سرکاری تنظیموں کو اردو زباں کے ورثے سے واقف کرایا جائے۔ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی اہمیت کا احساس دلایا جائے جو ملک میں امن و سلامتی کے لیے کافی مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

■

Mohammed Ismail
Assistant Profassor, Dept. of Urdu
Vasantrao Kale Senior College
Nanded- 431604 (Maharashtra)

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

منظور احمد گنائی

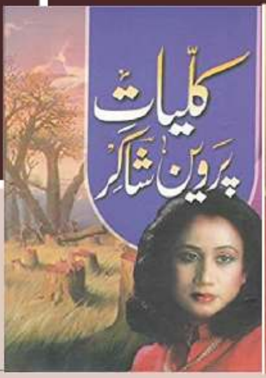

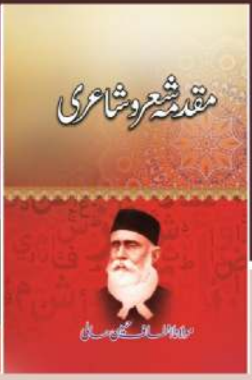

زندگی میں کتابوں سے عشق ہونا ایک فطری عمل بن گیا ہے لیکن کتاب کا عشق ایک حسین اور انمول جوہر ہے جس سے انسان کو ظاہری و باطنی طور پر فرحت وانبساط حاصل ہوتی ہے۔ کتابیں انسانی فکروشعور میں بالیدگی، اندازِ تکلم میں وقار، افکار وخیالات میں وسعت ورنگارنگی، پروازِ تخیل کو عروج، اندازِ نگارش میں پختہ خیالی اور علمی دنیا میں عظیم الشان مرتبہ عطا کرتی ہیں۔ کتابوں کا عاشق کسی بھی حال میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا کیوں کہ وہ ہمیشہ مطالعے میں ہی شب وروز بسر کرتا رہتا ہے۔ کتابوں سے اخذ کیے ہوئے بلند خیالات اور تاثرات کی ترویج واشاعت کو ممکن بنانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'اردو دنیا' نے منتخب کتابوں سے متاثر ہونے پر اپنی آرا بیان کرنے کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زندگی میں آپ کو جن کتابوں نے متاثر کیا ہے ان کی اہمیت ومعنویت کو اردو کے عام قارئین سے شیئر کریں۔ اسی کڑی کو مدِ نظر رکھ کر راقم الحروف نے بھی کچھ منتخب کتابوں سے متاثر ہوکر اردو کے قارئین کو متعارف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اگرچہ کتابوں کا مطالعہ بچپن ہی سے میں نے جاری وساری رکھا تھا لیکن جس کتاب نے سب سے پہلے میرے دل کے اندر مطالعے کی کیفیت پیدا کی وہ مولانا حالی کی 'مسدس مدوجزر اسلام' ہے جسے 'مسدسِ حالی' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ حالی کا عہد آفریں کارنامہ سمجھا جاتا ہے جس میں اسلام کے عروج وزوال پر کافی موثر انداز میں حالی نے گفتگو کی ہے۔ حالی کی نظم کافی مشہور ہے اس کے اشعار ہمیں بچپن ہی سے وردِ زبان رہا کرتے تھے۔ نظم کی زبان سیدھی سادی ہی سہی لیکن اسلوب نگارش اس قدر پراثر ہے کہ ہر کوئی اس کتاب کے مطالعے کا گرویدہ نظر آرہا ہے۔

اردو تنقید پر مولانا حالی کی مایہ ناز کتاب 'مقدمہ شعروشاعری' کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اردو تنقید میں اس کی اہمیت خشت اول کی مانند ہے۔ اردو میں تنقید کا آغاز 'مقدمہ شعروشاعری' کی اسی خشتِ اول سے ہوتا ہے۔ حالانکہ انجمن پنجاب کے جلسوں میں محمد حسین آزاد نے جو مضامین پڑھے ہیں اس میں آزاد ایک سلجھے ہوئے نقاد کے طور پر اُبھرے تھے۔ بلاشبہ اُسی نقاد کی 'آبِ حیات' ایک عہد آفریں کتاب ہے لیکن آزاد نے اس میں تنقید کے اصول وضوابط مرتب نہیں کیے اور اسی لیے حالی کی 'مقدمہ شعروشاعری' اردو تنقید کی بوطیقا قرار دی گئی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حالی سے پہلے اگرچہ تنقید کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا لیکن اردو کے قدیم تذکروں میں تنقید کے ابتدائی نقوش جو ہمیں ملتے تھے انھیں مستقل طور پر تنقید کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ حالی کی کتاب کا موضوع اگرچہ تنقید ہے لیکن انھوں نے اپنی تصنیف کے حصہ اول میں شاعری کیا ہے اس کی تاثیر وافادیت اور الفاظ ومعنی کی اہمیت پر بحث اور دوسرے حصے میں عملی تنقید یعنی مختلف اصنافِ سخن پر تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں سلجھے ہوئے انداز میں اردو شاعری کے لیے کچھ بنیادی اصول اور شرائط مرتب کیے ہیں۔ سب سے پہلے وہ شاعری کے لیے قوتِ متخیلہ، تفحص الفاظ، کائنات کا مطالعہ، سادگی، جوش اور اصلیت کو لازم وملزوم قرار دیتے ہیں۔ ان کے تنقیدی نظریات میں قدیم وجدید روایات دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ مشرقی تنقید میں عربی شعروادب، محمد حسین آزاد اور سرسید کے خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ مغربی شاعروں اور نقادوں سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ خاص کر لارڈ میکالے اور ملٹن سے وہ خاصا متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب شگفتہ وسادہ، بیان دلکش اور ان کی زندگی کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی ان کے ساتھ ہیں اور ان حالات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہرحال اردو تنقید پر ان کی یہ کتاب بے حد اہم ہے لہٰذا تنقید کے معاملے میں حالی کی ''بوطیقا' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ ضروری بھی بنتا ہے کہ قارئین کے لیے ایسی کتابوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ تنقید کے اعلیٰ معیار تک نہیں پہنچ سکتے۔

اسلامی کتب میں اگرچہ مستند کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن مجھے سب سے زیادہ سیرت پر مبنی قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی کتاب 'رحمۃ للعالمین' نے دل کے اندر برانگیختگی پیدا کر کے بے انتہا متاثر کیا جس کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ میں نے دس دن کے عرصے میں ہی ایک پوری جلد مکمل کرلی۔ یہ کتاب تین ضخیم

جلدوں پر مشتمل ہے لیکن میرے خیال میں سیرت کے موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب شاید وباید نہیں ہوسکتی۔ 'رحمۃ للعالمین' منصور پوری کی اردو زبان میں سیرت کی بہترین، مقبول ترین اور منفرد انداز بیان کی حامل کتاب ہے

اردو شاعرات میں کلیات پروین شاکر اور شہزادی کلثوم کے شعری مجموعے 'یادگار کلثوم' سے بے حد متاثر ہوا۔کلیات پروین میں ان کی نظمیں جن میں 'اندیشہ ہائے دور دراز'، 'شرط'، 'بس اتنا یاد ہے' اور 'خوشبو کی زبان' وغیرہ بہت اہم ہیں۔پروین شاکر نے جس ماحول اور معاشرے میں زندگی کے شب وروز گزارے، انھوں نے ان سارے معاشرتی مسائل اور قلبی جذبات واحساسات کی عکاسی دلِ مجروح لیے ہوئے لمحۂ گزراں کے ساتھ خوبصورت اور دلکش انداز میں کی۔ان کا مطالعہ کرکے ایک قاری حیرت واستعجاب میں مبتلا ضرور ہوتا ہے۔پروین شاکر جوں ہی عشق ومحبت کی خوبصورت وادی میں قدم رکھتی ہیں تو محبوب کی نزاکتوں کا نقشہ ایسے کھینچتی ہیں، کہ امیجری کی بادشاہ معلوم ہوتی ہیں۔ان کا اسلوب نرم، تازگی اور شگفتگی سے مملو ہے لہذا ان کا کلام پڑھنے سے معاشرتی مسائل اور مرد اساس معاشرے کا ظلم وجبر اور عورت کے ساتھ استحصال کے خلاف احتجاج ہے۔ ان کے کلام میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب شاعرہ کے یہاں نظر آتی ہیں۔ان کی کلیات کا مطالعہ بھی میرے نظریے کے مطابق ایک عام قاری کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ سانس۔

شہزادی کلثوم بیس سال کی عمر میں انتقال کرگئیں لیکن اپنے پیچھے جو شعری سرمایہ 'یادگار کلثوم' کے نام سے چھوڑا ہے وہ چیزے دیگر نظر آتی ہے۔اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ بیس سال کی عمر میں اُنھوں نے جن خیالات اور محسوسات کو موزوں کلام میں بالارادہ کہا ہے انسانی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہوا وہ بے حد حساس محسوس ہوسکتا ہے۔شہزادی غزل کی شاعرہ تھی لیکن ان غزلوں کے اندر جو فکر وشعور ملتا ہے وہ چونکانے والا ہے۔اُنھوں نے زندگی کے تمام مسائل کی عکاسی کی لیکن ان کے موضوعات روایت کے مطابق عشق وعاشقی پر ہی منحصر ہیں لیکن غزل میں اُن کا انداز بڑا نکھرا نکھرا ہے۔زبان کے معاملے میں بے حد سادگی ہے، نہ 'ادب برائے ادب' اور نہ 'ادب برائے زندگی' کی قائل ہے ایسا لگتا ہے جیسے ان کی غزلیں ان کی داخلی کیفیات اور اُن کے اپنے مسائل کی ترجمان ہیں۔ان کی غزلیں جدید اندازِ بیان لیے ہوئے ہیں ان کے کلام کو ٹھہری ہوئی کیفیت نہیں کہا جاسکتا بلکہ تلاطم امواج کی طرح رواں دواں ہے۔کلاسیکی تجربوں کے تصادم میں شدتِ احساس اور جذباتی فکر کا معاملہ خلاقانہ توانائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ان کی شاعری کو اگر 'گل وبلبل' کی شاعری سے تعبیر کیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔'یادگارِ کلثوم' اپنی تمام ترفنی وجمالیاتی خوبیوں سے مزین ہے اُن کے کلام کو پڑھ کر اُن کی ذہنی کیفیت اور قلبی جذبات وواردات سے آگہی حاصل ہوسکتی ہے۔

اردو نثر میں خطوط، سفرناموں اور خاکوں نے بہت متاثر کیا ہے۔اردو کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب اردو کے عظیم شاعر اور نثر نگار گزرے ہیں اگرچہ مجھے ان کے کلام کے ساتھ ابتدا ہی سے دلی وابستگی تھی لیکن انھوں نے اردو کے لیے جو قیمتی جواہر پارے اردو خطوط کی شکل میں خلق کیے وہ کافی اہم ہیں۔اردو نثر میں ان کے جو خطوط ملتے ہیں ان کی اہمیت مسلم ہے۔آج تک ان کے خطوط کے جتنے بھی مجموعے شائع ہوچکے ہیں ان سے خطوطِ غالب کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا حالی نے ان کی جو سوانح عمری 'یادگارِ غالب' کے نام سے لکھی تھی وہ خطوطِ غالب اور نثر غالب کے محاسن پر گفتگو کے لیے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔غالب نے اپنے دوستوں، شاگردوں اور دیگر عزیز واقارب کو وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے اس میں جہاں انھوں نے زندگی کی پوری داستان رقم کردی لیکن دوسری طرف اپنے دوستوں کی احوال پُرسی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پُرانے زمانے سے خطوط لکھنے کا جو رواج اردو خطوط میں رائج تھا وہ کسی بھی حال میں تسلی بخش نہیں تھا بلکہ انھوں نے وہ نیا اندازِ تحریر ایجاد کیا کہ اُن کی زبانی 'مراسلے کو مکالمہ' بنادیا۔ ان کے خطوط کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ غدر کے حالات، غالب کی زندگی کی شکست وریخت اور دیگر احوال مکتوباتِ غالب میں بکھرے پڑے ہیں۔حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مکتوبات میں شراب نوشی اور اُس ڈومنی کا تذکرہ بھی کھُلم کھُلا کیا ہے جسے وہ ایک زمانے میں بے حد پسند کرتے تھے۔غرض اپنی زندگی کی پوری داستان ان کے خطوط میں محفوظ ہے۔ غالب کا جگر دیکھیے انھوں نے خود اپنے خطوط میں اپنے معائب بیان کیے۔مکتوبات غالب اسلوب کے لحاظ سے اگرچہ سادہ اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں لیکن ایسے مکتوبات اردو میں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں ایسی زبان اور ایسے دلکش واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہو۔

اردو کی مکتوب نگاری میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مایہ ناز تصنیف 'غبارِ خاطر' سے شناسائی ہوئی جو انھوں نے

اردو کی مکتوب نگاری میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مایہ ناز تصنیف 'غبارِ خاطر' سے شناسائی ہوئی جو انھوں نے قلعہ احمد نگر میں قید وبند کی صعوبت میں بظاہر کچھ خطوط اپنے عزیز دوست حبیب الرحمن شروانی کو لکھے تھے لیکن اصل میں انھوں نے اپنے خیالات کو خطوط کی شکل دے دی ہے۔خطوط میں اگرچہ قید وبند کی مشکلات اور روزمرہ کے حالات کا بیان کرنا تھا لیکن مولانا نے اپنی زندگی کے تجربوں اور ذاتی حالات وواقعات کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط میں مولانا نے علم وفن کے موتی بکھیرے ہیں۔ جس میں سب سے اہم 'چڑے چڑیا کی کہانی' اور 'حکایتِ زاغ وبلبل' جیسے موضوعات کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

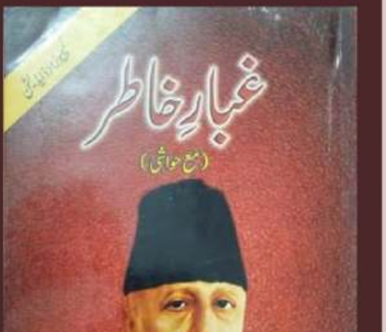

قلعہ احمد نگر میں قید وبند کی صعوبت میں بظاہر کچھ خطوط اپنے عزیز دوست حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے تھے لیکن اصل میں انھوں نے اپنے خیالات کو خطوط کی شکل دے دی ہے۔خطوط میں اگرچہ قید وبند کی مشکلات اور روزمرہ کے حالات کا بیان کرنا تھا لیکن مولانا نے اپنی زندگی کے تجربوں اور ذاتی حالات وواقعات کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط میں مولانا نے علم وفن کے موتی بکھیرے ہیں۔جس میں سب سے اہم

'چڑے چڑیا کی کہانی' اور 'حکایت زاغ وبلبل' جیسے موضوعات کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ مولانا اپنے عہد کے سب سے ممتاز نثر نگار شمار کیے جاتے ہیں۔اُن کی نثر نگاری کے قیمتی جوہر 'غبار خاطر' میں دیکھے جاسکتے ہیں کیونکہ موضوعات کے لحاظ سے اس میں علمی وادبی موضوعات پر سیر حاصل بحث ملتی ہے،جس کی وجہ سے اس کی مسلم حقیقت سامنے آتی ہے۔'غبارِ خاطر' کا اسلوب مولانا کی تمام تحریرات سے مختلف ہے اس میں وہی اندازِ نگارش اپنانے کی کوشش کی گئی ہے جو بہت پہلے 'الہلال' اور'البلاغ' میں جس قسم کی گھن گرج، خطابت کا نرالا انداز اور عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ کا استعمال کر کے پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کی نثر میں بے تکلفی، شگفتہ و دل نشین، پُرتکلف اندازِ بیان، مزاحیہ مزاج اور مولانا کی زبان وبیان پر قدرت نے خوبصورت اور دلکش نثر کی روایت قائم کی ہے۔غرض غبارِ خاطر کے خطوط اردو نثر کا بیش بہا خزانہ ہیں لہٰذا ایسی تحریرات کو پڑھ کر مولانا کے علمی وادبی محاسن کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے گویا ایسی تحریرات کا مطالعہ ایک قاری کے لیے ازحد ضروری ہے۔ اردو میں اگر چہ بہت سے سفر نامے لکھے گئے ہیں لیکن مجھے جس سفر نامہ نے بے انتہا متاثر کیا وہ علامہ شبلی کا سفر نامہ 'روم،مصروشام' کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس سفر نامے کو پڑھ کر ذہن کو وسعت اور نظر میں کشادگی پیدا ہوجاتی ہے۔اس سفر نامے کو پڑھ کر دنیا کے مختلف ممالک میں ایک تو خوب سیر کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے اور دوسرا ان ممالک کے علمی،ادبی،تہذیبی، معاشی اور سیاسی حالات سے بھی معلومات حاصل ہوجاتی ہے۔علامہ شبلی کا سفر بحری اور بے حد طویل تھا اور رودادِ سفر کئی واقعات پر مشتمل ہے جنھیں بڑے پُر لطف انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔سفر نامہ میں اسلوبِ نگارش کی شائستگی اور برجستگی نے بے حد معلوماتی اور حد درجہ اثر انداز بنایا ہے۔شبلی کی نثر میں تو جادو کا اثر بھرا پڑا ہے اس لیے ایسے حالات وسرگزشت سفر کا مطالعہ ایک عام قاری کے لیے بے حد فرحت بخش اور معلوماتی ثابت ہوسکتا ہے لہٰذا سفرنامہ کا مطالعہ ہر حال میں کرنا چاہیے۔سرسید کا سفر نامہ 'مسافرانِ لندن' کو بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔اس سفر نامہ میں سرسید کا سفرِ لندن تقریباً ڈیڑھ سال 1869 تا اکتوبر 1870 تک کے عرصے پر محیط ہے۔سرسید دراصل ایک تو وہاں کے تعلیمی معیار،تربیت،نصاب اور تدریس کے طریقہ کار کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ اس سفر نامے کا مقصد ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا نہ صرف حوالوں کے ساتھ دندان شکن جواب دینا تھا بلکہ اسے غلط بھی ثابت کرنا تھا۔سرسید اس سفر نامہ میں اپنی قوم کی تعلیمی پسماندگی، افلاس کو دیکھ کر مایوس ہوتے تھے جبکہ لندن کا تعلیمی معیار اور علوم وفنون کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔

ہندوستان میں بھی ایسے اداروں کی ترویج واشاعت کے خواب دیکھ رہے تھے جو انھوں نے سچ ثابت کردیے جس کی مثال آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے روپ میں موجود ہے۔سفر نامے کی زبان بہت ہی پُر اثر اور عام فہم ہے لیکن جس طرح سرسید نے ولیم میور کو مستند حوالوں سے قائل کردیا ہے اس کی مثال اردو میں شاید نہیں مل سکتی ہے۔ایسے سفرناموں کا مطالعہ اور اس زمانے کے حالات سے اطمینان بخش معلومات حاصل کرنے کے لیے 'مسافرانِ لندن' کا مطالعہ قارئین کرام کے لیے ایک معیاری رودادِ سفر ثابت ہوسکتا ہے۔

اردو میں ان گنت خاکے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں لیکن خال خال ہی ایسے ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر ان کا نقش ذہن پر ہمیشہ ثبت رہتا ہے۔ایسے خاکوں میں سب سے زیادہ مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ 'چند ہم عصر' ہے جس میں بیشتر خاکے مختلف ادبی شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ان خاکوں میں خصوصاً مولوی عبدالحق کا سب سے کامیاب خاکہ 'گدڑی کا لال نور خان' کافی اہم خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اردو خاکوں میں رشید احمد صدیقی کا خاکہ 'کندن' بہت اہم ہے جنھوں نے بے حد متاثر کیا۔مولوی عبدالحق کے خاکے کی درس وتدریس جب پہلی مرتبہ ہائر اسکنڈری اسکول اننت ناگ کشمیر میں کرنے لگا تو نور خان کی ایمانداری اور حق پسندی کو پڑھ کر دل کے اندر اتنی خوشی وانبساط محسوس ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔غریب باپ کا بیٹا جب ایک سپاہی کے فرائض انجام دینے پر آتا ہے تو ایمانداری اور راست گوئی سے انجام دینے میں مستعدی اور نیک نیتی کی وہ تاریخ رقم کردی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ایسے خاکے پڑھنے سے یہی ایمانداری اور مستعدی دل کے اندر جنم لینے لگتی ہے اور مولوی عبدالحق بھی اپنے خاکے میں ان ہی لوگوں کے اوصافِ حمیدہ سے اردو ادب کے قارئین کو متعارف کرانا چاہتے ہیں۔خاکے کو عام اور سادہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسے خاکوں کا مطالعہ زندگی کو سنوارنے کے لیے سونے پہ سُہاگا کا کام کرتا ہیں۔رشید احمد صدیقی جو طویل وقت تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے منسلک رہے لیکن کندن جیسے اسکول کے چپراسی نے انہیں اپنا خاکہ لکھنے کے لیے مجبور کردیا۔اسکول کا چپراسی 'کندن' جو ہمیشہ اپنی گھنٹی وقت پر بجایا کرتا تھا اور کبھی بھی کسی قسم کی بے احتیاطی برتتے نہیں دی۔رشید صاحب اسکول میں چپراسی کے کام اور ایمانداری سے اتنے متاثر ہوئے کہ خاکہ لکھنے کے لیے ان کو اپنے ذہن کے تہہ خانوں میں رکھ کر ان کے لیے ناقابل فراموش خاکہ تیار کیا۔موضوعاتی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مذکورہ دونوں خاکوں میں ایمانداری اور راست مزاجی کو ہی بحث میں لاکر ایسے خاکوں کو قلمبند کیا گیا ہے لیکن اصل میں خاکہ نگار ایسے انسانوں کی مثالیں پیش کر کے ہمیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ایمانداری اور نیک نیتی ہی زندگی میں کامیابی کا سند نامہ عطا کرسکتی ہے۔خاکوں کا اسلوب بے حد سادہ ہے۔خیالات کی درستگی اور اظہارِ بیان میں پختگی ان خاکوں میں بدرجہ اتم موجود ہے لہٰذا ایسے خاکوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیوں کہ ایسے خاکوں کو پڑھ کر دل کی دنیا بدل جاتی ہے اور انسان کے قلب میں ایسی باتیں رچ بس جاتی ہیں جو ایک انسان کو نیک اور ایماندار بننے میں مددگار رہوں۔

ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں ہر موضوع پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔بہرحال ایسی کتابوں کا مطالعہ ازحد ضروری ہے کیوں کہ ایسی کتابوں سے انسان کے اندر ایک نئی تحریک اور ایک نیا آرٹسٹ جنم لینے لگتا ہے۔علاوہ ازیں اردو رسائل وجرائد میں بھی کچھ رسائل ہیں، ایسے رسائل کا غائر مطالعہ واقعی ایک انسانی ذہن کی فکر آسمان کی نئی بلندیوں کو چھوتی ہے ایسے رسائل میں مجھے ماہنامہ 'اردو دنیا'، 'ادب وثقافت'، 'ایوانِ اردو' اور 'خواتین دنیا' نے بے انتہا متاثر کیا۔ان رسائل کی زبان اگرچہ سلیس، سادہ اور عام فہم ہے لیکن موضوعات کے لحاظ سے اچھوتے، نئے اور سائنسی موضوعات پر مبنی نگارشات کو ہی اشاعت کی منظوری ملتی ہے۔ایسے رسائل کا مطالعہ ضروری ہے جن میں نئے اور عصری مطالبات کے تحت مضامین کو شائع کیا جائے۔لہٰذا ادبی دنیا سے منسلک حضرات کے لیے لازم ہے کہ ایسے رسائل کا باریک بینی سے مطالعہ کریں کیوں کہ ایسے رسائل وجرائد سے علم وادب کی ایک نئی دنیا میں غوطہ زن ہونے کا موقع فراہم ہورہا ہے۔

■

Manzoor Ahmad Ganie
R/o Hussan Pora Bagh
Councellor IGNOU Govt Womens Degree College Anantnag
Teh/Bijbehara-192124 (J&K)
Dist.: Anantnag
Mob:6005903959
Email:mganie283@gmail.com

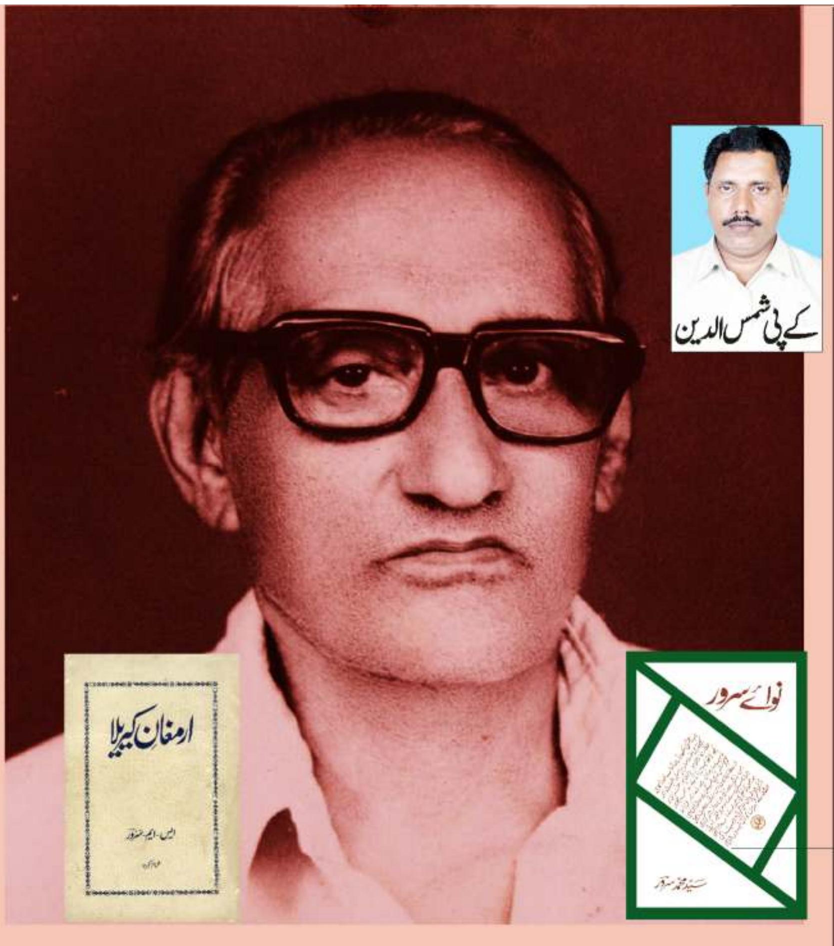

کے پی شمس الدین

ایس ایم سرور کی شاعری میں مشترکہ ہندوستانی تہذیبی عناصر

سید محمد سرور ریاست کیرلہ کا واحد ملیالی اردو شاعر ہے جس کے باقاعدہ اردو رسم الخط میں دو شعری مجموعے 'ارمغان کیرالا اور 'نوائے سرور' شائع ہوئے۔ ایس ایم سرور کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ گمان قطعی نہیں ہوتا کہ یہ کیرالا کا ملیالی مایلا اردو شاعر ہے۔ بلکہ اپنی فکری اکتسابی صلاحیتوں اور شاعری کے فنی وعروضی لوازمات، نیز ان کی ضروریات کا علم رکھتے ہوئے، اسلوب کی خوبیوں اور زبانِ اردو پر دسترس رکھنے کی بدولت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرور شمالی ہند کا شاعر ہے۔ سرور نے اپنی لسانی ذہانت و اکتسابی صلاحیتوں اور اپنے اندر موجود شاعر کو جب دنیا کے سامنے پیش کیا تو اردو ادب کی دنیا میں تعجب خیز کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

کیرلہ کے تہذیبی وثقافتی مقامات میں اولین نام ترشور کا آتا ہے۔ اسی ترشور کے کاٹور نامی قصبے میں 13 جون 1916 کو ایس ایم سرور کی پیدائش ہوئی۔ اردو زبان سے ناآشنا جہاں کی عوام ہو، اس ریاست کیرالا میں سرور کی اردو سے محبت ودلچسپی نے کیرالا میں اردو زبان وادب کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔

سرور نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے ہی گاؤں سے کیا۔ بعد میں شورنور جہاں پر ان کے ماموں کا گھر تھا وہیں رہ کر ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اردو زبان سیکھنے کی طلب نے ان کو بنگلور اور مدراس کا رخ کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح اردو زبان اور شعر وادب کی طلب نے انھیں اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ خوشی خوشی جائے پیدائش سے دور رہ کر وقت گزارتے گئے۔

مدراس میں ان دنوں مقیم مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک محوی صدیقی کی شاگردی میں سید محمد سرور نامور شاعر بن گئے۔ ایس ایم سرور کو سرور لقب محوی صدیقی نے ہی عطا کیا تھا۔ مدراس یونیورسٹی سے ادیب فاضل کورس میں داخلہ لے کر اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے بعد سرور کیرلہ پہنچے اور اردو معلم کی حیثیت سے گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول میں اردو زبان وادب کا درس دیا، اپنے تدریسی فرائض منصبی سے 1971 میں سبکدوش ہونے تک مدرسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان دنوں ایس ایم سرور ادبی ماہنامے، اخبار ورسائل میں مسلسل اپنی تخلیقات کی صورت میں نظمیہ شاعری شائع کرایا کرتے تھے۔

1971 میں باضابطہ سرور کا پہلا شعری مجموعہ 'ارمغان کیرالا' منظر عام پر آیا۔ یہ کیرلہ سے شائع ہونے والا ملیالی اردو شاعر کا پہلا شعری مجموعہ تھا جسے اردو شاعری کے لیے علاقائی طول وعرض سے ہٹ کر سارے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی پذیرائی نصیب ہوئی۔ اس مجموعے کی جتنی ستائش ہوئی وہ ایک مثال بن گئی، علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال نے بھی پاکستان سے شعری مجموعے کی ستائش کرتے ہوئے سرور کو تہنیت نامہ ارسال کیا تھا۔ 'ارمغان کیرالا' کی شروعاتی نظم بچوں کی دعا کے بعد 'کیرالا' کے عنوان سے جو طویل نظم سرور کے ذریعے لکھی گئی ہے وہ پورے ہندوستان میں مشہور ہوئی۔ دل کو چھو لینے والی اس نظم میں مشترکہ ہندوستانی تہذیبی عناصر نظر آتے ہیں، نظم کے ابتدائی اشعار کچھ اس طرح سے ہیں۔

ہند کی انگشتری کا ہے نگینہ کیرالا
ہے کئی اشیائے نادر کا خزینہ کیرالا

بطور شاعر ایس ایم سرور خزانے کی چابی اپنے ہاتھ میں لے کر ہمیں سرزمین کیرالا کے شجر وحجر اور ندی نالے سمندر وساحل کی ایک الگ مخصوص دنیا کی طرف لے جاتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے یہ خطہ غیر ممالک کے تاجروں کی کشش کا مرکز بنا ہے۔ سرور نے اپنی شاعری میں یہاں کی خصوصی پیداوار، کاشت کے لحاظ سے زراعت کاری کے میدان میں اپنی بے مثال خوبیوں کی معرفت شناخت رکھنے والی سیاہ مرچ، زنجبیل، ادرک، سپاری، جیسی اشیا کی انوکھے طور پر تعریف کرتا ہے۔ نظم کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہے یہاں کی گول مرچی کی ثنا خواں ہر زباں
جس کے ہر خوشے سے ہوں شرمندہ اعناب جناں
خوشہ فلفل کا ہر دانہ ہے ہیرے کی کنی
ہر گدا محتاج جس کا، جس پہ شیدا ہر غنی

نظم میں ایک شعر کے ذریعے سرور کوثر وتسنیم سے رودِ بھارت، بھارتھا پوژہ سے تشبیہ دے رہے ہیں، رودِ بھارت یعنی یہاں کی مشہور ندی بھارت 'بھارتھا پوزہ' ہے کیرالا کے آلوا کی نہر رودِ گنگا سے تشبیہ دے کر اس نہر کو

اعلیٰ مقام تک پہنچایا ہے۔ ملاحظہ کریں یہ اشعار۔

رودِ بھارت کوثر و تسنیم سے کمتر نہیں
رودِ گنگا آلوا کی نہر سے بڑھ کر نہیں

سرور کے دل میں سرزمین کیرالا سے گہری وابستگی ہے، یہ آپ نے ان اشعار میں جان بھی لیا اور دیکھ بھی لیا۔ سرور کو اپنے وطن کی ہر چیز سے جذباتی لگاؤ ہے اور مذکورہ نظم کے ان اشعار سے بیاں بھی ہو رہا ہے، مثلاً

تم کہو کشمیر کو ''فردوس بر روئے زمیں''
میں کہوں ہے کیرالا فردوس سے بڑھ کر کہیں

ساری دنیا کشمیر کو دنیا کی جنت کہتی ہے، تو سرور ملیالی ہونے کے ناطے اپنے پیدائشی وطن کیرلہ پر فخر محسوس کرتے ہوئے کیرلہ کو فردوس سے بڑھ کر کہتے ہیں۔ سرور ملیالی ہونے پر ناز کیا کرتے تھے۔ یہاں کی تہذیب وتمدن سے بھی انھیں بے انتہا لگاؤ تھا۔ سرور نے اپنی شعریات کے ذریعے کیرلہ کو مشترکہ تہذیب سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کا ہر خاص وعام شہری جانتا ہے کہ کیرلہ کی مستحکم ومضبوط اور بڑی شناخت 'ناریل' سے ہے۔ اسی لیے نظم 'کیرالا' میں سرور نے کس طرح سے اردو شاعری میں مقامی رنگ سموئے ہیں اس کی ایک ادنیٰ سی مثال اس شعر میں دیکھیں۔

ناریل کے پیڑ صف باندھے کھڑے ہیں اس طرح
عید گاہوں میں ہوں صف بستہ نمازی جس طرح

شمالی ہند کی اعلیٰ شاعری میں جس طرح گنگ وجمن، جہلم اور گومتی، کوہ ہمالہ، صبح بنارس، اودھ کی شام، مخصوص پھل اور پھول، اشجار کا ذکر آتا ہے اور ان سے جس طرح پیکر تراشی، مصوری جذبہ وخیال کے اظہار اور زمان ومکاں کے تعین میں مدد لی جاتی ہے، بالکل اسی طرح سرور کی شاعری مقامی اور علاقائی حوالوں، اشاروں، کنایوں، استعاروں، اور تشبیہات سے مزین نظر آتی ہے۔

ان کی شاعری میں کیرالا کے کوہ، بیاباں، قدرتی مناظر، ساحل وسمندر، سیاہ مرچ، اور الائچی کا تذکرہ اس طرح موجود ہے، جس سے ذہنی اور جذباتی وابستگی کے علاوہ مخصوص تہذیبی تمدنی فضا کا سراغ ملتا ہے۔ جنوبی ہند کی مشہور تیرتھ گاہ ہے کنیا کماری، یہاں کا طلوع آفتاب وغروب کا نظارہ سرور نے نظم 'کنیا کماری' میں بہت ہی دلکش ودلآویز انداز میں دل کو چھو لینے والی طرز میں پیش کیا ہے۔ سرور کہتے ہیں۔

طفل حور کے بطن گیتی سے نکلنے کا سماں
دیکھ لے کنیا کماری جاکے کوئی خود عیاں
بحرِ کنیا! تو ہی کیا'' بحرین یلتقیان ہے
خضر و موسیٰ کا وہ مجمع تیرا ہی دامان ہے

سرور کو اگرچہ اپنے آبائی وطن کیرالا سے بے پناہ محبت تھی، لیکن ان کی یہ محبت محدود نہیں رہی، بلکہ اپنے وطن اور ملک دونوں کی محبت ان کی رگ وپے میں اس طرح سرائیت کر گئی ہے اور اس طرح ایک دوسرے کا حصہ بن گئی ہے کہ جب بھی وہ ملک پر خطرات کے بادل چھائے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کا دل مضطرب و بے چین ہو جاتا ہے۔ جس سے ان کی شاعرانہ حسیت اور عصری زندگی سے آگہی کا ثبوت ملتا ہے، وہ بنیادی طور پر ماضی پرست یا بنیاد پرست نہیں ہیں، انھیں اپنی زندہ تاریخ سے شدید لگاؤ ہے۔

سرور ایک ملیالی ہوتے ہوئے بھی اردو زبان سے اپنی حقیقی محبت کا اظہار اس کی لفظیات استعمال کرتے ہوئے ہیں اس سے کیرلہ میں اردو زبان کی توسیع کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ سرور کا اردو زبان سے والہانہ لگاؤ تھا، انھوں نے اردو کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی۔

7 نومبر 1943 کو کالی کٹ کے ٹاؤن ہال میں منعقد ملابار اردو کانفرنس میں 'انجمن ترقی اردو ملابار شاخ' قائم کرنے کے لیے آئے ہوئے بابائے اردو مولوی عبد الحق اور ان کے ساتھ آئے ہوئے اردو کے ادیب وشعرا کی خدمت میں خوش آمدید کرتے ہوئے ایس ایم سرور نے ایک طویل استقبالیہ نظم پڑھی۔ اس نظم کے چند اشعار پیش کر کے صرف یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہوں کہ صنف نظم گوئی پر سرور کو کس قدر عبور تھا۔ ملاحظہ کیجیے نمونے کے اشعار۔

ہند کے ہر فرد کو باہم ملانے کے لیے
گلشنِ اردو کے محسن باغباں آہی گئے
دونوں حق محوی واسرار اور شبرآئے ہیں
یعنی اردو کے یہ سب روح ورواں آہی گئے
گردشِ گردوں ہلاسکتی نہیں جس کو کبھی
اس زباں کا قصر اب ایسا بنانا چاہیے
کار آمد ہے جو ہندو، ومسلم کے لیے
وہ زباں اس ملک میں سب کو سکھانا چاہیے

سرور کو اپنے ملک کی ہر شے، باشندوں، ان کی تہذیب وتمدن اور زبانوں سے بھی محبت اور لگاؤ تھا۔ اپنی مادری زبان ملیالم سے جس قدر پیار کیا کرتے تھے اردو زبان سے بھی وہ عشق اسی طرز کا کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کی کسی زبان کو وہ کمتر نہیں سمجھتے تھے، اور نا ہی کبھی دوسری زبانوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہاں مگر سرور کل ہند سطح پر رابطے کی زبان اردو ہی کو سمجھتے تھے، اسی لیے اپنے ملک کے ساتھ ساتھ ملک کی سب سے بڑی زبان اردو سے بھی گہرا لگاؤ اور انھیں دلچسپی تھی۔ اردو زبان پر کسی طرح کی آفت آتی ہے تو ان کا دردِ دل بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

ہندو فدا ہیں تجھ پہ تو مسلم ہیں جاں نثار
نو مید اپنی قوم سے اردو زباں نہ ہو
گل ہے جو خاک ہند تو اردو ہے بوئے گل
دیکھو گِلہ کوئی اسے اے باغباں نہ ہو

سرور ایک جمہوریت پسند ذہنیت والے انسان تھے، ان کے سب سے قریبی دوستوں میں اوّل نام گوپالن نائر (پرنسپل گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج، ملاپرم) کا آتا ہے۔ گوپالن نائر کے دنیا سے گزرنے کی خبر نے سرور کو بے حد رنجیدہ کر دیا تھا۔ سرور کے قلم سے بے جاہ ایک نظم 'آہ! میرے یار، تخلیق کی صورت میں وارد ہوئی، یہ نظم ان دنوں اطراف واکناف میں بہت مشہور ہوئی تھی، نظم کا محور وہ صدمہ تھا، اس نظم کے چند اشعار آپ کی نذر کرتے ہوئے سرور کی صنف نظم گوئی کی ایک اور نظیر پیش کرتا ہوں۔

بزم جہاں سے آہ میرا یار اٹھ گیا
کے وی جی یعنی زیست کا غمخوار اٹھ گیا
اُف! جم کے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا اٹھ گیا
جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پایا تھا اٹھ گیا

سرور بیرون کیرلہ کے اردو ادیب وقلمکار اور شعرا میں کالی داس گپتا رضا، شارب ردولوی، عظیم الشان صدیقی، صفدر آہ، شمیم حنفی، مخمور سعیدی، ساغر مہدی، سلیمان اطہر جاوید، عبد الماجد دریابادی، جیسے معروف شخصیات سے قریبی مراسم رکھتے تھے، خط وکتابت سے ان کے روابط کی تصدیق ہوتی ہے۔ سرور کی شاعری، مضامین اور کہانیوں میں ہمیں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے عناصر ضرور نظر آتے ہیں۔ خصوصا کیرالا کے تعلق سے انھوں نے جو بھی لکھا ہے وہ اس طرح ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گویا کہہ رہے ہوں کیرالا کا دورہ کرنے والو اس منظوم دعوت نامہ پر بھی ایک نظر ڈالو۔

ایک گہوارہ ہے نظاروں کا باغِ کیرالا
بادۂ مستی ہے نظاروں کا باغِ کیرالا
جوکوئی آتا ہے سرور کیرالا میں ایک بار
وہ بھلا سکتا نہیں اس کی فضائے خوشگوار

■

Dr.K.P.Shamsuddin Tirurkad
Urdu Teacher,A.M.High School
P.O.Tirurkad(Via)Angadipuram
Malappuram(Dist)- 679321 (Kerala)
Mob.: 9847422682,9562434964
Email.: shamsurdutkd@gmail.com

عتیق الرحمن

اثر انصاری بحیثیت غزل گو شاعر

اثر انصاری صاحب کا پورا نام ابوبکر انصاری ہے اور ادبی دنیا میں اثر انصاری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اثر انصاری کی پیدائش یکم جنوری 1923 کو مئو ناتھ بھنجن کے ایک علمی گھرانے میں ہوئی اور یہ شہر ایک عرصے سے صنعت پارچہ بافی میں ہندوستان اور بین الاقوامی سطح پر اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ ان کے والد محمد مصطفیٰ صفا اس وقت کے جید عالم اور مشہور شاعر تھے۔ گویا کہ اثر صاحب کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اثر صاحب نے ہائی اسکول 44-1943 میں جیون رام انٹر کالج سے پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک تعلیمی سلسلہ منقطع رہا، پھر کسی طرح 46-1945 میں گوورنمنٹ کالج الہ آباد سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس کے بعد نامساعد حالات نے ان کے آگے کی تعلیم مسدود کردی۔ علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی کاموں سے انھیں خاصی دلچسپی تھی۔

اثر صاحب کا کاروباری مشغلہ تجارت ہے، ان کا فارم 'فائن ٹیکس' ادبا و شعرا کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ یہاں پر مئو کے نامور شعرا اکٹھا ہوتے تھے اور محفلیں سجتی تھیں۔ دانشکدہ اردو لائبریری کے صدر اور بزم ادب مئو ناتھ بھنجن کے سکریٹری بھی رہے۔ 'نوائے دارالعلوم' اور نکھار میگزین کے مدیر اعزازی بھی رہے۔ مشاعروں میں کم شامل ہوتے تھے۔، والد بزرگوار سے چھپ کر شاعری کرتے تھے لیکن بعد میں ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

اثر انصاری کی ادبی خدمات: اثر انصاری کا تخلیقی اور ادبی سفر تقریباً ساٹھ سالوں پر مشتمل ہے ان ساٹھ سالوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں بہت سا کلام ضائع ہو گیا لیکن جو کچھ محفوظ رہ گیا وہ درجہ ذیل تصنیفات وتالیفات میں شامل ہے ان کا پہلا شعری مجموعہ 'کم و کیف' اور آخری مجموعہ 'نوائے سروش' ہے۔ اسی طرح نثر میں ان کی پہلی کتاب 'سفر حج کے شب و روز' اور آخری کتاب 'اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی' ہے۔

کم و کیف: یہ اثر انصاری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1974 میں شائع ہوا اور جس میں 1962 سے 1972 تک کی غزلیں شامل ہیں اس مجموعے میں کل 78 غزلیں اور سترہ قطعات شامل ہیں۔

افکار پریشاں: یہ اثر انصاری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے، یہ 1980 میں شائع ہوا آپ کی غزلیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے اس مجموعے میں 1955 سے 1960 تک کی غزلیں اور کتاب کے ابتدائی صفحات میں 1974 سے 1980 تک کی کچھ غزلیں شامل ہیں یہ مجموعہ کل ایک سو گیارہ غزلوں پر مشتمل ہے۔

زبان غزل: یہ اثر انصاری کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو 1987 میں شائع ہوا اس میں کل اکسٹھ غزلیں ہیں اس مجموعے میں شامل غزلیں 'کم و کیف' اور 'افکار پریشاں' میں شامل غزلوں کے مقابلے زیادہ پختگی اور فنی بالیدگی سے پر ہیں جو اثر انصاری کے تخلیقی ارتقا کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہے۔

آئینہ در آئینہ: یہ اثر انصاری کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو صرف نظموں پر مشتمل ہے یہ مجموعہ 1992 میں شائع ہوا جس میں 1942 سے 1992 تک کی نظموں کا انتخاب شامل ہے جس میں ایک نعت اور مختلف موضوعات پر لکھی گئیں 48 نظمیں ہیں مختلف علمی اور ادبی و سیاسی شخصیات پر لکھی گئی بارہ اور چھ نظمیں ایسی ہیں جو مختلف اداروں پر لکھی گئی ہیں۔

پیراہن گل: یہ اثر انصاری کا پانچواں شعری مجموعہ ہے جو 1997 میں شائع ہوا اس مجوعہ کلام میں ایک حمد پاک ایک عدد نعت شریف کے علاوہ کل 59 غزلیں شامل ہیں اس مجموعے کی غزلوں میں عصری حسیت اور فکر وفن کی

پختگی پچھلے مجموعوں کے مقابلے میں کافی توانا ہے۔

سفر حج کے شب و روز: یہ اثر انصاری کی پہلی نثری تصنیف ہے جو 1980 میں شائع ہوئی یہ دراصل ان کے پہلے سفرحج (1979) کی ڈائری ہے جس میں انہوں نے ایام حج کے حالات وواقعات کو بڑے دلکش انداز میں قلم بند کیا ہے۔

تذکرہ سخنوران مئو: یہ اثر انصاری کی دوسری نثری تصنیف ہے جو لکھی تو بہت پہلے گئی تھی لیکن 1980 میں شائع ہوئی اس میں کل اکیاون شعرا کے تذکرے ہیں یہ کتاب مئو ناتھ بھنجن کی علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز: یہ اثر انصاری کی تیسری نثری تصنیف ہے جو 1990 میں شائع ہوئی اور جس میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ بعض علمی ادبی شخصیات کے تصنیفی اور تالیفی کارناموں کا تعارف اوران پر سیر حاصل بحث کے ساتھ ان کے ادبی و تنقیدی مقام ومرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب اثر انصاری کی نثری اور ان کے تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر کا عمدہ نمونہ ہے۔

اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی: یہ اثر انصاری کی اہم ترین تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے جو 2001 میں شائع ہوئی اس کتاب میں اثر انصاری نے بڑی دیدہ ریزی سے اردو کی ان شعری تخلیقات کا انتخاب اور ان کا تجزیہ پیش کیا ہے جس میں ہندو تہذیب اور مذہب وعقائد اور شخصیات کا بیان پایا جاتا ہے۔

نوائے سروش: یہ اثر انصاری کی حمد ونعت کا مختصر ترین انتخاب ہے اور اس کو ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب کل پانچ حمد اور چودہ نعت شریف وسلام پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب نے اثر انصاری کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری پر ایک مختصر دیباچہ بھی قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب 2001 میں شائع ہوئی ہے۔

(اثر انصاری: حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ص 47-145)

اثر انصاری بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں کہ ان کا بیشتر شعری سرمایہ غزل کی ہیئت میں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جس تہذیبی ماحول کے پروردہ ہیں۔ ان کی شخصیت کا بہترین اظہار غزل کے ہی پیرایے میں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ غزل کی صنف ان کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق ہے۔

اثر انصاری کی غزلوں کے تنقیدی جائزے کے لیے اردو غزل کے ارتقا پر بھی نظر ڈالنی ہوگی تا کہ اس کے تناظر میں اثر انصاری کی غزلیہ شاعری کی اہمیت اور اس کے شعری وفنی مقام ومرتبے کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ اور ایسا کرنے کے لیے اردو غزل کی تاریخ کا اجمالی جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(اثر انصاری: حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ص 153)

'کم وکیف' گوطباعت کے لحاظ سے نقش اول ہے تا ہم یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے اس میں 1962 سے 1972 تک کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اس مجموعے سے اثر صاحب کی غزل گوئی کی تمام خوبیاں سامنے آجاتی ہیں، فنی لحاظ سے جہاں یہ ان کا بہترین مجموعہ ہے وہیں فکری لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، موضوعات میں تنوع ہے فکر میں بلندی ہے، روایت کے ساتھ جدت کے عناصر بھی جلوہ گر ہیں، خود اعتمادی اور بلند آہنگی سے تخیل کو شعر کا جامہ پہنانہ اور فنکارانہ بصیرت کے جلوے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس مجموعے میں موجود ہیں۔

اثر انصاری کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ان کا تغزل ہے وہ ہر قیمت پر اسے برتتے اور عزیز رکھتے ہیں، یہی تغزل ان کی غزلوں میں ذوق وجدان کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، سوز وگداز اور سلیقۂ اظہار قاری کے وجدان میں تحریک پیدا کر دیتے ہیں کسی شاعر کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس کا کلام سامع کے دل ودماغ میں ارتعاش پیدا کر دے، اثر صاحب کے کلام میں یہ قوت بدرجہ اتم موجود ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تاج داری کی تمنا شہر یاری کی بات
آدمی کو کھا گئی سرمایہ داری کی ہوس

بتاؤ کچھ غم دوراں کی تلخیوں کا علاج
میں باز آیا مئے خوشگوار پینے سے

مجھ کو دیکھو، مجھے سمجھو، مری فریاد سنو
نقش ہوں صفحۂ ہستی پہ گواہی کی طرح

'کم وکیف' اور 'افکار پریشاں' کے بعد اثر صاحب کا تیسرا شعری مجموعہ 'زبان غزل' شائع ہوا، پہلے کی شاعری کے مقابلے میں ان کے بعد کے کلام میں زیادہ پختگی، زیادہ فنی شعور، زیادہ حسن و لطافت، زیادہ دلکشی، زیادہ تنوع اور زیادہ رعنائی وزیبائی ہے، اصلاً یہ مجموعہ اثر صاحب کی شاعری کے دور شباب کا نمونہ ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خود اپنی ذات سے انسان بے خبر کیوں ہے
شعور دیدہ وری ہے تو کم نظر کیوں ہے

مصلحت اندیشیوں میں دب گئی آواز حق
کون میری جرات شعلہ بیانی لے گیا

زمانہ ہو گیا بچھڑے ہوئے مگر اب تک
تمھاری یاد دعائے سحر میں رکھتا ہوں

صلہ ملے نہ ملے اپنی خوش بیانی کا
کھلاؤ پھول مگر حکمت و معانی کا

یوں تو اثر انصاری صاحب کے مختلف شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، انھوں نے خاص طور پر صنف غزل میں خوب زور آزمائی کی ہے اور ان کی بہترین غزلوں کا مجموعہ 'زبان غزل' ہے' جو 1987 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر مجموعے 'کم وکیف' 1974، 'افکار پریشاں' 1980، 'آئینہ در آئینہ' 1992 'اور پیراہن گل' 1997 میں شائع ہو چکے ہیں۔ حمد اور نعت کا مجموعہ 'نوائے سروش' کے نام سے داد سخن حاصل کر چکا ہے۔ نثری کتب میں 'سفرحج کے شب وروز' (سفرنامہ) 1979، 'تذکرۂ سخنوران مئو' (مئو کے شعرا کا تذکرہ) 1981، 'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' 1990 اور 'اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی' 2001 میں شائع ہونے والی نثری کتب میں شامل ہے۔

انصاری صاحب کی ہمہ گیر شخصیت اور ادبی خدمات پر اب تک مختلف اعزازات وانعامات سے انھیں نوازا جا چکا ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی سے ان کی تصانیف پر متعدد ایوارڈ ملے ہیں۔ آل انڈیا میر اکادمی نے 'امتیاز میر' سے دانشکدہ اردو لائبریری نے 'ہلال دانش' کے اعزاز سے سرفراز کیا اور نکھار پبلیکیشن نے انھیں ان کی خدمات پر نکھار ادبی ایوارڈ (گولڈ میڈل) سے سرفراز کیا ہے۔

اثر صاحب کی پسندیدہ صنف غزل ہے۔ غزل گو شاعروں میں انھیں اصغر گونڈوی اور حسرت موہانی بہت زیادہ پسند ہیں اور نظموں میں جوش اور اقبال نے انھیں

زیادہ متاثر کیا ہے۔ جب ہم اثر انصاری کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو روایت اور جدت پسندی کا خوبصورت امتزاج پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی غزل 'زبان غزل' سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

غزل ثقافت و تہذیب کا حسیں سنگم
روایتوں میں بھی جدت ضرور چھاہے ہے
بیان حسن و عزت کے ساتھ ساتھ غزل
نزاکت غم ہستی ضرور چاہے ہے

(زبان غزل، ص8)

اثر انصاری کے یہاں بھی حسن و عشق اور حسن و شباب کے متعلق کوائف سے بھرپور اشعار پائے جاتے ہیں۔

اندازۂ شباب کہاں تھا شباب میں
خالی رہی فریب نظر انتخاب میں

(اثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں، ص59)

غزل کا وسیلہ اظہار ان کے تخلیقی تجربوں کو راس آتا ہے۔ وہ شعر غزل یا تخلیقی اکائی میں اپنے فکر و فن کے جوہر دکھاتے ہیں اور اسی پیمانہ صفات میں اپنی مجروح اناؤں، نا آسودہ خوابوں اور نیم جاں ارادوں کے جلوے بکھیرتے ہیں۔ زندگی کی آہنی دیواروں سے ٹکرانے اور چلچلاتی دھوپ میں سفر کرنے سے انساں کی جو نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا اظہار بھی زبان غزل میں کرتے ہیں۔ اثر کی شاعری کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے اندر اور باہر کا موسم ایک سا ہے، یہی وجہ ہے کہ 'زبان غزل' میں روایت بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یہ بولتی ہوئی روایت نئی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے بے قرار نظر آتی ہے۔

ان کے یہاں عرفان و تصوف کی ایک ہلکی سی لہر بین السطور میں پڑھی جا سکتی ہے۔ وہ ظاہر و باطن کے فرق کو جانتے ہیں اور اخلاق و اوصاف باطن کے ادراک کے باوجود حقائق سے آنکھ بند نہیں کرتے۔

آدمی کوئی ہو چہرے سے نہ پرکھا جائے
کیا ضروری ہے کہ اندر بھی ہو باہر جیسا

(زبان غزل، ص23)

اثر انصاری صاحب نے حسن و عشق کی بھی بات کہی ہے، اس کے بغیر تغزل کا سفر ممکن کب ہے لیکن وہ قریب رہ کر بھی کچھ دور دور رہنے کی لذت کے شناسا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوری اور قربت کا رشتہ عرفان کے رشتے کی پہچان ہے اور یہی محبت کا درد بنتا ہے اور مسرت کی حسی کیفیات میں غم کی آمیزش و ذوق نظر پیدا کرتا ہے اور اسی غم کی آنچ میں گھل کر جذبہ عمل اور عشرت وجد و جہد کا ظہور ہوتا ہے۔

ساتھ رہ کر بھی نہ احساس ہوا قربت کا
فاصلہ باقی ہے لب تک مہ و اختر جیسا
ذہن پر یادوں کا اک دھندلا سا سایہ چھوڑ کر
وقت اپنے ساتھ ماضی کی کہانی لے گیا

اثر انصاری صاحب نے اپنی غزلوں کے ذریعے تاثر اور طنز کا کام بھی کیا ہے۔ انھوں نے اچھوتے خیال اور موثر تجربے سے سجا کر بعض پیکر ایسے تراشے ہیں جو حقیقی اور علامتی شاعری کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ اثر صاحب نے وقت کے تقاضوں کا بہت خیال رکھا ہے اور زندگی کی تابنا کی کو بھی دیکھا ہے اور عمل و یقین کی بھی بات کی ہے۔

سورج کی روشنی کو مقید تو کرلیا
دل کا سیاہ خانہ منور نہ کر سکے
تم کسے الزام دو گے آدمی کی بھیڑ میں
آلگا سر پر کوئی پتھر اگر پھینکا ہوا

زبان غزل کے مطالعے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اثر صاحب ایک کلاسیکی شاعر ہیں۔ آپ کی تمام تر شاعری فیشن پرستانہ نقالی سے پاک ہے، بلکہ اس میں احساس و جذبات کی صداقت اور عصری آگہی کے عناصر ملتے ہیں اور صحیح معنوں میں آپ کی تمام تر غزلیں اس پر استوار ہیں اور آپ کا شعر حیات انسانی کی ترجمانی کرتا ہے۔

ان کی غزلیں روایات کی لطیف ترجمانی کرتی ہیں اور جدید رنگ و آہنگ میں قوس و قزح کے خوبصورت رنگ بھی بکھیرتی ہیں۔ اثر انصاری کی غزلیں سوز و گداز، عصری حسیت اور خیالات کی رعنائیوں کے ساتھ فنی تنوع سے آراستہ ہیں۔ 'افکار پریشاں' سے 'پیراہن گل' تک کا ان کا شعری سفر تقریباً نصف صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ 'پیراہن گل' کی منزل تک آتے آتے ان کے اشعار میں فنی شعور کی پختگی، مہارت حسن بیان کی خوبی، اور اس کی دلکش فکر و نظر کے پھول کھلاتی ہیں۔ کلاسکی رچاؤ جذبے اور احساس کے ساتھ اظہار بیان کی لطافتوں اور ندرتوں سے مزین ان کی غزلیں ذہن و دل کے دریچے وا کر دیتی ہیں۔

کیا چمن میں کوئی پیراہن گل چاک ہوا
عطر میں ڈوبی ہوئی باد صبا لگتی ہے
ہم بھول نے والے کو بہت یاد کریں گے
ایک خاص تعلق تھا محبت کے سبب کا
تیری نظروں سے بھی ملتا ہے بہاروں کا سراغ
کیا ضروری ہے نسیم سحری کے ساتھ رہے

(اثر انصاری پر چند تحریریں، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ص106-7)

غرض اثر صاحب نے اپنی شاعری میں مختلف فکر و انداز کو برتا ہے جو ان کی وسعت نظری اور ذات و کائنات کے

اثر انصاری کی غزلیں سوز و گداز، عصری حسیت اور خیالات کی رعنائیوں کے ساتھ فنی تنوع سے آراستہ ہیں۔ 'افکار پریشاں' سے 'پیراہن گل' تک کا ان کا شعری سفر تقریباً نصف صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ 'پیراہن گل' کی منزل تک آتے آتے ان کے اشعار میں فنی شعور کی پختگی، مہارت حسن بیان کی خوبی، اور اس کی دلکش فکر و نظر کے پھول کھلاتی ہیں۔

گہرے مطالعے و مشاہدے کی وجہ سے ممکن ہو سکا، ان کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم ان کی شاعری اور کلام سے ان کے عہد کی ایسی تصویریں بنا سکتے ہیں جو یقیناً سچی اور جیتی جاگتی ہوں گی اور یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ماخذ

1 اثر انصاری: حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی، 2007

1 اثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نکھار پبلی کیشنز، ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن، یوپی، 1998

3 اثر انصاری پر چند تحریریں، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی، 2011

4 نقد سخن، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی، 2010

5 تذکرۂ سخنوران مئو، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نکھار پبلی کیشنز، ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن، یوپی، 1998

6 کم و کیف، اثر انصاری، اسرار کریمی پریس الہ آباد، 1974

7 افکار پریشاں، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی، 1980

8 زبان غزل، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی، 1987

9 آئینہ در آئینہ، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی، 1992

10 پیراہن گل، اثر انصاری، سرفراز آفسیٹ پریس مئو، 1997

■

Dr. Atiqur Rahman
Assistant Professor of Persian
Dept. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies
Bhasha Bhavana, Visva-Bharati
(A Central University)
Santiniketan, 731236 (WB)
Mobile: 9635193411
Email: atiqura044@gmail.com

مختلف الجہات

شخصیت

ملک زادہ منظور احمد

عادل احسان

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی شخصیت ہمہ جہت اور جامع الکمالات تھی۔ ملک زادہ منظور نے نظامت، شاعری، ادب، تنقید، صحافت، خاکہ، ناول، تذکرہ، نہ جانے کن کن موضوعات اور اصناف پر لکھا ہے، ملک زادہ منظور احمد کے کارناموں پر جس بھی زاویے سے گفتگو کی جائے ہر زاویہ فضل وکمال کے نئے باب کھولتا جائے گا۔ وہ ایک بہترین نثر نگار تھے، وہ ایسی خوبصورت اور دلکش، شگفتہ نثر لکھتے تھے جس نثر میں تصنع، بناوٹ اور آورد کا شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ اردو زبان وادب کے استادو پروفیسر ہونے کے ساتھ انگریزی زبان وادب سے بھی ان کا گہرا رشتہ تھا۔ ایک شاعر اور فکشن نگار کے طور پر بھی انھوں نے اپنی پہچان بنائی تھی۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی قیمتی کتابیں لکھی تھیں۔ ساری زندگی عوامی اور حکومتی سطح پر اردو زبان وادب کی آبیاری کرتے رہے۔ اپنی موت تک اردو زبان وادب کے فروغ اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے ملک زادہ منظور احمد کی کوششیں، محنتیں اور جدو جہد ہمیشہ تاریخ کے صفحات میں زندہ رہیں گی۔ ملک زادہ منظور احمد نے بہترین شاعری بھی کی، نظموں اور غزلوں میں افکار وخیالات کو پیش کیا۔ وہ شاعری میں بھی منفرد طرز اظہار کے مالک ہیں۔ ملک زادہ منظور احمد کا شعری سرمایہ بہت زیادہ نہ ہونے کے باوجود اچھا ہے جو کچھ بھی ہے سراپا انتخاب ہے۔ ان کی تمام حیثیتوں میں مشاعرے کی نظامت سب پر حاوی رہی۔ اردو دنیا میں آپ بحیثیت ناظم مشاعرہ مقبول رہے اور آپ کی یہ حیثیت اس قدر غالب رہی کہ اس نے ملک زادہ منظور کے دیگر ادبی پہلوؤں کو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا لیکن اردو زبان وادب کا طالب علم جب ملک زادہ منظور کی شخصیت اور حیات وخدمات کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے ان کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ملک زادہ منظور احمد ان تمام صلاحیتوں اور خصوصیات کے ساتھ ایک کامیاب مدرس ومعلم بھی تھے۔ ان کے کامیاب شاگردوں کی تعداد کافی ہے۔ انھوں نے اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعے بے شمار ذروں کو آفتاب وماہتاب بنادیا اور بہت سے قیمتی اساتذہ اور ادبا اردو دنیا کو عطا کیے۔

انھیں نظم ونثر پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ماضی قریب میں اس طرح کی متنوع صفات اور جامع الکمالات شخصیتیں کم نظر آتی ہیں جن کے اندر بیک وقت قدرت نے اتنی خوبیاں رکھی ہوں۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بیک وقت اردو زبان و ادب کے معروف استاد، اچھے ناقد، کامیاب شاعر اور ایک عظیم ناظم مشاعرہ تھے۔ انھوں نے اپنی نظامت کے فن سے مشاعروں کو ایک نئی بلندی عطا کی جس سے بعض مشاعرے بہت کامیاب ہو گئے اور بعض شعرا کو ایک نئی پہچان ملی۔ ان کے اسی فن کی وجہ سے انھیں ایک کامیاب ناظم مشاعرہ بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ ملک زادہ منظور اپنی آواز سے پورے ماحول کو اس طرح باندھے رکھتے تھے کہ سامعین خود کو دوسری دنیا میں پاتے تھے یا یوں کہیں کہ ان کی آواز سامعین کے دلوں پر راج کرتی تھی۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے علم وفن کو پروفیسر خالد محمود اس طرح پیش کرتے ہیں:

”پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اردو زبان و ادب کے معروف استاد، ذہین نقاد، اچھے شاعر اور بہت اچھے ناظم مشاعرہ

تھے۔مشاعرے کی نظامت کو انھوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے فن بنادیا تھا۔ان کی آواز ان کے قد کی طرح بلند اور پاٹ دار تھی۔وہ بڑے اعتماد سے نظامت کرتے تھے۔ان کا اعتماد شعر وادب سے ان کی دلچسپی اور گہری واقفیت کا غماز تھا۔ان کے لہجے میں شائستگی اور فرخندگی کا امتزاج تھا۔جو بوقت نظامت سامعین کو بھلا معلوم ہوتا۔وہ جب شاعر کا تعارف کراتے تو ان کے انداز تعارف سے شاعر مسرور اور سامعین متاثر ہوتے۔'' 1

درج بالا اقتباس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملک زادہ منظور احمد کئی علم وفن میں ماہر تھے۔یہ اپنے علم وفن کو ماحول کے حساب سے استعمال کرتے تھے تاکہ اس کی چاشنی برقرار رہے اور سامعین اس سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اگر ان کے علم وفن کو سمجھنا ہے تو ہمیں ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنا ہوگا تبھی اس کی تہہ تک جایا جاسکتا ہے اور ان کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔کیونکہ وہ وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے اشعار کے ذریعے مشاعرے کی ضرورت اور موقع ومحل کے اعتبار سے فضابندی نہایت ہی خوبصورت انداز میں کرتے ہیں جس سے قاری اس فضا کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکے گا۔

ملک زادہ منظور احمد اردو زبان وادب کے بہت بڑے شیدائی ہیں۔اردو زبان وادب سے ان کا تعلق اس قدر ہے کہ یہ اس کو ہمیشہ بلندی پر لے جانا چاہتے ہیں تاکہ یہ زبان ہر خاص وعام پر اپنا غلبہ طاری کر سکے اور لوگ اس زبان سے لطف اندوز ہو کر اس طرف راغب ہوں۔ یہ اپنے ہر پروگرام میں زبان وبیان پر خاص طور سے توجہ دیتے ہیں۔جس سے عام قاری کو بھی تمام باتیں اچھی طرح سے سمجھ میں آجائیں اور وہ قاری اس زبان کی شیرینی سے پوری طرح تروتازہ ہو جائے۔ملک زادہ منظور احمد لفظوں کے استعمال اور واقعات کا نقشہ اس طرح پیش کرتے تھے کہ ساری چیزیں خودبخود آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتی تھیں۔ملک زادہ منظور احمد کی علمی بصیرت،خوبصورت انداز نظامت و خطابت اور صاف گوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاروق ارگلی لکھتے ہیں:

ملک زادہ منظور احمد نے نظیر اکبر آبادی کے شاعرانہ کمالات کو نئے زاویے سے جانچا اور اسے نیا مقام دیاہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جس طرح اپنی غزلوں اور نظموں میں عام انسانوں کی زندگی کو پیش کیا ہے،اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ان کی بہت عزت تھی،یہ صرف روایات وخیالات کے ہی نہیں بلکہ واقعات وحادثات کے بھی شاعر تھے اور اپنے کلام کو محبت کی سنی سنائی روداد سے پاک رکھتے تھے۔

''ملک زادہ منظور احمد نے اردو شعر وسخن کی تاریخ میں اردو زبان کا عوامی اور تمدنی ادارہ 'مشاعرہ' کو اپنی غیر معمولی علمیت، بے کراں بصیرت،خوبصورت انداز خطابت اور پراثر بلاغت کے ذریعے جو اعتبار ووقار بخشا ہے وہ عدیم النظیر ہے،یہ بات دنیائے اردو میں مسلسل ہونے والے مشاعروں کے سامعین سے لے کر اس عہد کے تمام مقتدر اور جید ادبا،شعرا،ناقدین کی دونسلیں تسلیم کر چکی ہیں کہ اس فن میں کوئی ثانی نہ پہلے ہوا نہ اب ہے۔مستقبل میں بھی اس کی توقع اس لیے محال ہے کہ دور ساز شخصیتیں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔یہ امر واقعہ ہے کہ مشاعروں کی نظامت کے وسیلے سے ملک زادہ منظور احمد نے اردو زبان، تہذیب اور اس کی آفاقی ثقافت کو جو بلندیاں عطا کی ہیں اور اس فن لطیف کو جس طرح تمدنی روایات واقدار کے احیا کی اساس بنایا ہے،ان کا مماثل فی الحال رُوئے ادب میں موجود نہیں ہے۔''2

اردو زبان وادب میں ایسے بے شمار ناقد گزرے ہیں جنھوں نے اپنے قلم کے جوہر سے اس میدان میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔اسی میدان کے ایک علمبردار ملک زادہ منظور احمد بھی ہیں جنھوں نے اپنی تنقیدی بصیرت سے بہت سے ادیبوں اور شاعروں پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں اور انھیں اپنی کتاب 'شہر ادب' میں جگہ دی ہے۔اس کتاب میں نظیر اکبر آبادی، سید احتشام حسین، فراق گورکھپوری، منور رانا، سلیم جعفر وغیرہ جیسے ادیبوں پر اپنے خیالات وتصورات پیش کیے ہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں انھوں نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی اور ان کی تحقیق کا موضوع 'مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن' تھا۔ملک زادہ منظور احمد نے اپنے تحقیقی مقالے میں جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کا جائزہ لیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ چونکہ ان کو شروع سے ہی مولانا ابوالکلام آزاد سے دلچسپی تھی اور یہ ان کی تحریروں سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ملک زادہ منظور احمد کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر امام قادری رقم طراز ہیں:

''ابوالکلام آزاد کے سلسلے سے پہلے ملک زادہ منظور احمد نے جس تحقیقی اور تنقیدی کام کی داغ بیل رکھی،اس کی اساسی حیثیت اس بات سے سمجھنا چاہیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں ان کی خدمات کے تعلق سے مضمون نویسی یا کتابی شکل میں کاموں کے تعارف وتنقید کے باوجود سچی بات یہ ہے کہ 1958 میں وفات کے بعد ہی باضابطہ طور پر ابوالکلام آزاد کی علمی خدمات کے احتساب کا سلسلہ قائم ہوا۔ابتدائی دور میں قاضی عبدالغفار،محمد عتیق صدیقی اور مالک رام صاحبان کی خدمات بے شک وقیع ہیں لیکن اس کے بعد جن لوگوں نے ان سے بہتر علمی کام مکمل کیے،ان میں ملک زادہ منظور احمد اور پھر ابوسلمان شاہجہاں پوری، عبدالقوی دسنوی، ظ۔انصاری وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں کیونکہ ان سب نے اس علمی سلسلے کو آگے بڑھایا۔ملک زادہ نے ابوالکلام آزاد کی ادبی شخصیت کو اجمال میں دیکھنے کی کوشش کی،سیاست اور مذہب سے علاحدہ ادب اور صحافت کے موضوعات کو زیادہ توجہ کے ساتھ موضوع بحث بنایا۔اسی وجہ سے ابوالکلام آزاد کے مجموعی علمی کام کی قدر وقیمت متعین کرنے میں ان کی کوششوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ان کی کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد:فکر وفن' حقیقت میں ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں گورکھپور یونیورسٹی میں مکمل ہوا تھا۔''3

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات کے تمام پہلوؤں پر ملک زادہ منظور احمد نے روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے ان کی انسان دوستی، مذہب، سیاست، صحافت اور ادبی دنیا کو جس نظر سے دیکھا اس کی ہو بہو تصویر پیش کرنے کی پوری کوشش کی جس سے ان کی حقیقی زندگی ہر خاص وعام کو معلوم ہو سکے اور اپنے اندر بھی انسان دوستی اور وطن پرستی کو محسوس کر سکیں۔ملک زادہ منظور احمد نے ان کی تخلیقات سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور ان کی تحریروں کو اپنے کلام میں ضم کر لیا جس سے ان کی تصانیف میں ایک نئی روانی پیدا ہو گئی۔مولانا ابوالکلام آزاد نے جس طرح اپنی تصانیف میں سادہ اور عام فہم لفظوں کو جگہ دی ہے۔اسی طرح ملک زادہ منظور احمد نے بھی اپنی تحریروں میں سادہ اور عام فہم لفظوں کا استعمال کیا ہے۔جس سے عام قاری کو دشواری نہ ہو۔

'غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ' ملک زادہ منظور احمد کی

دوسری تصنیف ہے۔انھوں نے اس کتاب میں مولانا آزاد کے خطوط،الہلال والبلاغ، تذکرہ، قول فیصل، ترجمان القران کے ساتھ ان کے اسلوب پر بحث کی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ساری تخلیقات کا بہت ہی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھااوران کے اسلوب سے اپنی تحریروں کونئی بلندی عطا کی۔ملک زادہ منظور احمد نے جس طرح کا اسلوب اپنایا اس سے ان کے فن کونئی بلندی ملی اوران کے فن میں نکھار آیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فلسفیانہ صلاحیت کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ملک زادہ منظور احمد نے ان کے فن کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالی ہے اور ان کے اسلوب کو بڑی حد تک اپنی تحریروں میں اپنایا ہے۔غبار خاطر کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے ملک زادہ منظور احمد لکھتے ہیں:

''مولانا کے یہاں انشا پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں،اور ان کا اسلوب تحریر موضوع کے ساتھ بدلتا رہتا ہے،اگر ہم ترتیب و تاریخ وار ان کی تحریروں کو پڑھیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے انداز و اسلوب کا بڑا ہموار ارتقا ہوا ہے،ان کی شاندار اور پر اثر و پر شکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی لیکن غبار خاطر اور کاروان خیال کا اسلوب دوسرے مؤثرات خارجی کا نتیجہ ہے۔اسی لیے اس میں ادب کی گل کاریاں ہیں،تذکرہ میں ان کی طبیعت کا وہ نقشہ ہے جو انھیں موروثی طور پر ابتدائی ماحول سے ملا،لیکن غبار خاطر میں وہ رنگ ہے جو اکتساب اور ریاضت کے ذریعہ دن بہ دن نکھرتا اور سنورتا رہا ہے۔''4

ملک زادہ منظور احمد نے نظیر اکبر آبادی کے شاعرانہ کمالات کو نئے زاویے سے جانچا اور اسے نیا مقام دیا ہے۔نظیر اکبر آبادی نے جس طرح اپنی غزلوں اور نظموں میں عام انسانوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ان کی بہت عزت تھی۔یہ صرف روایات وخیالات کے ہی نہیں بلکہ واقعات وحادثات کے بھی شاعر تھے اور اپنے کلام کو محبت کی سنی سنائی روداد سے پاک رکھتے تھے۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک حساس اور زندہ دل انسان تھے اور انسانی زندگی میں جنس اور جذبے کی جو اہمیت تھی اس کو وہ ہمیشہ فوقیت دیتے تھے۔وہ جس طرح کے واقعات، مشاہدات اور انداز بیان کو اپنی شاعری میں استعمال کرتے تھے۔اس سے پوری فضا میں ایک رنگینی پھیل جاتی تھی جو ماحول کو خوشگوار بنانے میں بڑی مدد کرتی تھی۔نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر ملک زادہ منظور احمد اپنے خیالات ونظریات اس طرح پیش کرتے ہیں:

''نظیر چونکہ روایات وخیالات کے نہیں بلکہ واقعات وحادثات کے شاعر تھے اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں نہ تو محبت کی سنی سنائی روداد بیان کی اور نہ عاشق کی اس ناتجربہ کاری اور شرمیلے پن کو ابھارا جو اس عہد کی اردو غزل کا معمول بن گیا تھا۔وہ ایک حساس اور زندہ انسان تھے اور انسانی زندگی میں جنس اور جذبے کی جو اہمیت تھی اس کا عرفان رکھتے تھے۔وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ محض حسن بیان اور عروض کے معیارات کسی ادب کی پرکھ نہیں بن سکتے۔''5

اردو ادب میں ملک زادہ منظور احمد کی حیثیت ایک کامیاب شاعر کی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری سے جس طرح عوام کو جوڑا ہے وہ ایک مثال ہے۔چونکہ ان کا صرف ایک شعری مجموعہ ہی منظر عام پر آیا جس کا نام 'شہر ستم' ہے۔اس شعری مجموعے نے ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کیا۔وہ جس طرح مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کئی شعری مجموعے ہونے چاہیے۔

عشق وعاشقی میں محبوب کے جذبات کی ترجمانی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

چاند میں دیکھا تیرا چہرہ، پھول میں تیرا روپ
شمع جلی ہے تو پھیلی ہے تیرے بدن کی دھوپ
میٹھا درد جگا دیتی ہے کوئل کی ہر کوک
ساون ساون چوٹ لگی ہے جیٹھ جیٹھ پروائی
یاد تمھاری آئی ساجن جب بھی گھٹا لہرائی

'رقصِ شرر' ملک زادہ منظور احمد کی شاہکار تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے سبھی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے اور ہر پہلو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ منظر عام پر لائے ہیں۔انھوں نے اس کتاب میں جس طرح کی روداد بیان کی ہے اس میں بڑی حد تک سفر نامے کا عکس جھلکتا ہے لیکن در حقیقت یہ ان کی خودنوشت ہے۔ملک زادہ منظور احمد نے رقصِ شرر میں اس دور کی تاریخ کے ساتھ ایک نسل اور عہد کے عروج وزوال کی داستان بھی بیان کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تمام واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ لمحہ بہ لمحہ،عہد بہ عہد سارے واقعات وحالات سامنے آجاتے ہیں۔اس طرح دیکھا جائے تو ملک زادہ منظور احمد نے اپنی خودنوشت رقصِ شرر میں جس طرح کی فکری وفنی صلاحیت کو پیش کیا ہے۔اس میں بڑی حد تک ان کا اسلوب کارفرما رہا ہے۔وہ جس طرح کا اسلوب اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں۔اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس فن میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کی خودنوشت رقص شرر کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر ظفر احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''ملک زادہ کی نثری تصانیف متعدد ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے،لیکن ان میں شاہکار کا درجہ 'رقصِ شرر' کو حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عہد آفریں کتاب ہے۔اس کا سب سے پہلا امتیاز اس کا دلکش نثری اسلوب ہے وہ ساحرانہ اسلوب جس کے ابتدائی نمونے ہمیں 'شہر سخن' میں نظر آتے ہیں 'رقصِ شرر' اس کا نقطۂ عروج ہے۔خود مصنف نے اسے خودنوشت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔اس لیے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اردو کی نمائندہ اور قدر اول کی حامل آپ بیتیوں کی کتنی ہی مختصر فہرست کیوں نہ بنائی جائے 'رقصِ شرر' کا نام اس میں ضرور شامل ہوگا۔'' 6

اس مختصر سے مقالے میں ان کی گوناگوں اور کثیرالجہات خدمات میں سے چند چیزوں کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔اوپر ذکر کیے گئے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اپنے وقت میں اردو زبان وادب کی ایک ایسی شخصیت تھے جنھیں اپنی زبان سے حد سے زیادہ لگاؤ تھا اور وہ اس کے فروغ وترقی کی خاطر ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی اردو زبان وادب میں عظیم الشان اور گراں قدر خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم انھیں اردو زبان وادب کا عظیم محسن اور شیدائی کہہ سکتے ہیں۔

حواشی

1 تفہیم وتعبیر: خالد محمود، نور پرنٹنگ ایجنسی، سوئیوالان، دہلی، 2017،ص 187
2 اردو ہے جن کا نام: فاروق ارگلی، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2010،ص 204
3 ملک زادہ منظور احمد شخصیت اورفن، ترتیب وتدوین: حکیم نازش احتشام اعظمی، اصلاحی ہیلتھ فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 2016، ص 114
4 غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ: ملک زادہ منظور احمد، ساجد صدیقی بک سیلر اینڈ پبلشرز، لکھنؤ 1971، ص 46-145
5 انتخاب غزلیات نظیر اکبر آبادی، مرتبہ: ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، اترپردیس اردو اکادمی، لکھنؤ 1983، ص 11
6 ملک زادہ منظور احمد شخصیت اورفن، ترتیب وتدوین: حکیم نازش احتشام اعظمی، اصلاحی ہیلتھ فاؤنڈیشن، نئی دہلی 2016، ص 20

■

Dr. Adil Ehsan
Dept of Urdu, B N D geree College
Near Bus Stand
Anjhi Railway Station Road, Shahabad
Hardoi - 241124 (UP)
Mob.: 8802188589

مشتاق احمد وانی

جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری

('بیکراں' کے حوالے سے)

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی شاعری اور شخصیت اردو دنیا کے لیے نہ صرف قابل رشک ہے بلکہ قابل قدر بھی ہے۔وہ نہ صرف ایک اعلیٰ پایے کے شاعر تھے بلکہ ایک اہم ترین ادیب اور دانشور بھی تھے۔اردو نثر ونظم پر جگن ناتھ آزاد کے بڑے احسانات ہیں، کیونکہ آزاد نے چھوٹی عمر سے ہی اپنے آپ کو اردو شعر وادب کے لیے وقف کردیا تھا۔ان کی ادبی وشعری زندگی کو مختلف خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ نثر میں وہ بحیثیت محقق، نقاد، خاکہ نگار، سوانح نگار اور ماہر اقبالیات کے طور پر بہت مقبول ومشہور رہے ہیں اور شاعری میں بحیثیت غزل گو، مرثیہ نگار، نظم نگار اور رباعی گو کے طور پر اپنی قابلیت اور سخن شناسی کا لوہا منوا چکے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کو اگرچہ شاعری وراثت میں ملی ہے لیکن انھوں نے اس میراث پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اپنی محنت وکوشش سے اردو شاعری کو نکھارا، سنوارا اور اپنے خون جگر سے گلستان سخن کی آبیاری کی ہے۔آزاد کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد جو اہم ترین بات قاری کے ذہن پر مرتسم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی انسانیت اور اس کی تمناؤں، سپنوں اور آدرشوں کے شاعر ہیں۔مزید برآں ان کی شاعری نہ صرف ایک مجروح دل کی پکار ہے بلکہ دورِ حاضر کے انسان کی گرج بھی ہے۔

جہاں تک جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری کا تعلق ہے، اس سلسلے میں یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح آزاد کو شاعری میراث میں ملی ہے، اسی طرح غم واندوہ بھی انھیں میراث میں ملا ہے کیونکہ آزاد کے والد محترم جناب تلوک چند محروم (جو استادالشعرا تھے) کی زندگی بھی بہت حد تک غموں کی شکار رہی ہے۔تلوک چند محروم کی پہلی بیوی کا عین جوانی میں انتقال ہونا، ان کی بیٹی شکنتلا کا بچپن ہی میں داغ مفارقت دے دینا اور پھر سب سے بڑا صدمہ یہ کہ بیٹی ودیا (جس کی ماں پہلے ہی اس جہان فانی سے کوچ کرگئی تھی) کا اپنے سسرال والوں سے تنگ آکر خودکشی کرنا۔یہ ایسے دردناک اور دل شکن واقعات تھے جنھوں نے محروم جیسے ممتاز شاعر کے دل ودماغ پر گہرے اثرات چھوڑے۔چنانچہ محروم کی شاعری میں ان مایوس کن واقعات کی موثر ترجمانی موجود ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی زندگی میں بھی اپنے والد ہی کی طرح کچھ ایسے مایوس کن حالات وواقعات دَر آئے ہیں جنھوں نے آزاد کے ذہن ودل کو بہت غمگین کردیا۔مثلاً آزاد کی پہلی شادی شکنتلا جی سے ہوئی جو چھ سال کے بعد آزاد کو داغ مفارقت دے کر عالم ارواح میں چلی گئی اور جگن ناتھ آزاد کو سونپ گئی دو بچیاں، نرملا اور مکتا۔ان کے علاوہ ایک بیٹا بھی تھا جو بچپن ہی میں انتقال کرگیا تھا۔جگن ناتھ آزاد پر غموں کی یلغار یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ انھیں تقسیم ہند کے سانحے کی صورت میں اپنے مادر وطن (عیسیٰ خیل، مغربی پنجاب، پاکستان) کو نہ چاہتے ہوئے بھی خیر باد کہنا پڑا۔یہ ایک ایسا صدمہ تھا جس کی گونج جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں سدا سنائی دیتی رہے گی۔کوئی بھی شخص اپنے مادر وطن سے بچھڑنا نہیں چاہتا ہے لیکن جب ناخوشگوار حالات پیدا ہوجاتے ہیں تو انسان اپنی جنم بھومی کی بوباس کو اپنے آنسوؤں میں جذب کرلیتا ہے۔وہ اپنے وطن اور وطن کی ہر شے کو الوداع کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔آزاد بھی ان تلخ تجربات سے گزرے ہیں۔جب 1947 میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو بہت سے لوگوں کی طرح انھیں بھی اپنی خوشی اور مرضی کے خلاف ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا پڑا۔یہ ایک ایسا انقلابی قدم تھا جس نے جگن ناتھ آزاد کی زندگی پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔وہ اپنی جذباتی زندگی کا ایک انمول سرمایہ پاکستان میں چھوڑ آئے اور وہاں کی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اپنے قلب نحیف میں چھپا کر ہندوستان میں آگئے۔اس میں لاہور کی گلیاں اور چوبارے، دوستوں یاروں کا ایک بہت بڑا حلقہ، دوستوں رفیقوں کے مکانات، اخبارات ورسائل کے دفتر، کتابوں کی دکانیں، درس گاہیں، مساجد، دریائے راوی اور جہلم کا کنارہ......ان کے علاوہ اور بہت سارے مقامات، اپنے پرائے جن کے ساتھ آزاد کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا، وہ سبھی یہاں آکر بہت یاد آئے۔یہی وجہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں غم کا پہلو مختلف صورتوں میں عیاں ہوتا ہے۔آزاد کی شاعری سے متعلق مفتی فخر الاسلام ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

"آزاد کی شاعری میں......المیہ کا احساس نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان تمام ہنگاموں کی سختیاں جھیلنے کا انھیں عملی تجربہ رہا ہے۔1947 میں انھیں اپنی اس دھرتی سے سارے رشتے توڑ لینے پڑے جو ان کی جنم بھومی تھی" ('جگن ناتھ آزاد: فکر وفن' از: محمد منظور عالم، ص21)

گویا معلوم یہ ہوا کہ جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں غم واندوہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ان کا غم صرف رونے بسورنے پر ہی مجبور نہیں کرتا بلکہ وہ اس غم کے ذریعے انسان کو ہمت وحوصلہ اور حالات سے جم کر مقابلہ کرنے، محنت وکوشش سے زندگی کے خارستان سے گزرنے اور ایک بلند ہمت انسان کی طرح زندگی کے غم کو اپنے سینے سے لگانے کا درس بھی دیتے ہیں۔بلاشبہ جگن ناتھ آزاد ایک دردمند دل رکھتے تھے۔وہ دکھی دلوں کی دردمندی کو فوراً محسوس کرتے تھے۔غالباً یہی وجہ ہے جس نے آزاد کی شاعری کو

آفاقیت اور ہمہ گیریت عطا کردی ہے۔وہ ایک سیکولر ذہن انسان تھے۔ان کی نظر میں انسانیت عظیم ومقدس ہے۔انسانی قدروں کے وہ ہمیشہ نہ صرف پاسدار رہے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں ان کے فروغ وبقا کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔اس لیے یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری میں جہاں ان کی داخلی واردات قلبی کا بیان موجود ہے تو وہیں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی رنگا رنگی بھی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں موضوعات کی بھر مار ہے جو اس بات کا پتا دیتی ہے کہ سارے انسانوں کا درد آزاد کے دل میں ہے۔کیونکہ ان کی شاعری میں جو کسک اور سوز وگداز ہے، جو اثر انگیزی اور گھلاوٹ کے علاوہ ایک مخصوص درد وکرب موجود ہے وہ اس فتنہ پرور دور کی غمازی کرتا ہے جب سارے رشتے ناتے ختم ہو چکے تھے اور انسان نے حیوانیت کا چولا پہن لیا تھا۔تقسیم ہند کے لرزہ خیز حالات وواقعات نے آزاد کی جذباتی زندگی کی سطح کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اس کے بعد ہی ان کے ذہن ودل میں نئے تصورات وخیالات نے سر ابھارا یا وہ چشمے پھوٹ پڑے جن کا آزاد نے بے حد اثر قبول کیا۔ان انسانیت سوز حالات میں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سدا کے لیے ایک قنوطی، یاس پرست اور غم دوست انسان بن کے رہ جاتے لیکن چونکہ انھیں اس دنیا اور اس میں بسنے والوں سے بے پناہ محبت تھی۔اس لیے انھوں نے عظمتِ انسان کے گیت گائے اور دوسروں کے غم کو اپنانے کی سعی کی۔جگن ناتھ آزاد اگرچہ 1947 کے خونی واقعات کی لپیٹ میں خود بھی آچکے تھے لیکن ان کی امن پسند نگاہیں ہمیشہ انسانیت کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ اسی لیے ان میں انتقام کا جذبہ ہرگز نہیں ابھرتا۔تقسیم ہند کے پرآشوب دور میں تعصب اور تنگ ذہنیت کا شکار نہ ہوئے۔البتہ اپنے مادر وطن سے بچھڑنے کے غم میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

کہو دیر وحرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
نشانِ برگ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری
وطن کی اے مقدس سرزمیں احساس بھی کچھ ہے
کہ تجھ سے چھٹ کے تیرے سوختہ جانوں پہ کیا گزری
تجھے اے کاش! دہلی اور شملہ یہ بتا سکتے
میانوالی کے صحرا ترے دیوانوں پہ کیا گزری

'جگن ناتھ آزاد اور ان کی شاعری' مشمولہ 'نوائے پریشاں' از: جگن ناتھ آزاد، ص 19)

مندرجہ بالا اشعار آزاد کے دکھ درد کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں اور انھیں اس بات پر پورا یقین ہے کہ ہند کی تقسیم محض مذہبی جوش وجنون کی بنیاد پر ہوئی ہے جس میں آزاد جیسے نیک دل انسان احساس بے دخلی کا شکار ہو کر اپنی معصومیت کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ بار بار اس تباہی وبربادی کا ذکر کرتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی بھی چیز محفوظ نہیں ہے۔ملک کی آزادی کے بعد بھی سماجی وسیاسی حالات میں کوئی بھی خوشگوار تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے بلکہ ظلم وستم، آپسی نا اتفاقی، دغا وفریب، لوٹ کھسوٹ اور ہر قسم کی برائی مسلسل پروان چڑھتی جاتی ہے جسے دیکھ کر جگن ناتھ آزاد کہہ اٹھتے ہیں ۔

آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد
دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے
عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں
درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے
یہ الگ بات ہے تو اس کو نہ دیکھے لیکن
ترے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے
رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے
آج بھی مفت نظر ہے وہی سینوں کا عناد
بند اخلاص ومحبت کی دکاں آج بھی ہے

(جگن ناتھ آزاد 'بیکراں' ص 21-20)

دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا غم بھی جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔دنیا ان کے نزدیک عیش وعشرت اور سکون وراحت کا مسکن نہیں بلکہ وہ گوتم بدھ کی طرح دنیا کو دکھوں کا گھر سمجھتے ہیں۔البتہ یہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ گوتم بدھ نے آدھی رات کو اپنے بیوی بچے کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی تھی اور تارک الدنیا کے نظریے کو عملی جامہ پہنایا تھا جب کہ آزاد دنیا کو ترک کر دینے کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ دنیا کو دائمی گھر نہ سمجھتے ہوئے اس کے مصائب وآلام کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کا سبق دیتے ہیں۔اس موقعے پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اگر سب سے بڑا کوئی غم یا دکھ ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے ایک دن اس دنیا سے اپنا رخ موڑ کر عالم آخرت کو لبیک کہنا ہے! جگن ناتھ آزاد نے ایک حساس شاعر کی حیثیت سے اسی غم کا اظہار درج ذیل اشعار میں اس طرح کیا ہے ۔

جینا ہے غم سہنا ہے غم سہ کر مرجانا ہے
دل اور دل کی دنیا کا بس اتنا افسانہ ہے
پھولوں کے متوالو کیا باغ سے پیار بڑھانا ہے
شاخ پہ دو دن رہنا ہے گانا ہے اڑ جانا ہے

(جگن ناتھ آزاد 'بیکراں' ص 62-61)

انسان کی زندگی دکھوں سے مبرا نہیں ہے۔ہر شخص کی زندگی میں دکھ درد آتے ہیں۔لیکن بات محسوس کرنے اور نہ کرنے کی ہوتی ہے۔شاعر کے پاس چونکہ احساس کی دولت ہوتی ہے، وہ اس دولت کو ایسا لب ولہجہ عطا کرتا ہے جس سے اس کی صحیح نمائندگی ہوتی ہو۔اس طرح وہ ویسا ہی اثر دوسروں کے ذہن ودل میں منتقل کر دیتا ہے جو اس نے خود حاصل کیا ہوتا ہے۔جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ حالات کی تلخیوں کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والا نہ صرف واقفیت حاصل کرتا ہے بلکہ وہ آزاد کا شریک غم بن جاتا ہے۔ان کی بیشتر غزلوں اور نظموں میں انسان کی خود غرضی، سسکتی ہوئی انسانی قدریں، ارضی مسائل کی تلخیاں، انسانی زندگی کو دوزخ بنانے والوں کے خلاف بغاوت کے جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔وہ ایک خوشحال اور پرسکون معاشرے کی تعمیر وتشکیل کے لیے مسلسل تڑپتے ہیں۔وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سماج میں ظلم کب اور کس طرح برپا ہوتا ہے۔انھیں اس بات پر بھی کامل یقین ہے کہ اس دنیا میں خدا کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے لیکن انسان کی شر پسندی کے باعث رحمت خداوندی ہٹ جاتی ہے۔اس سلسلے میں آزاد کی ایک نظم 'کلکتہ' قابل ملاحظہ ہے جس میں انھوں نے 1946 کے فرقہ وارانہ فساد کو اس طرح پیش کیا ہے کہ فساد کی پوری تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے اور دل میں مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے۔نظم کے چند بند ملاحظہ کیجیے ۔

کلکتہ ہوا آگ کے شعلوں میں گرفتار
دیکھ اے دل آزاد قیامت کا نظارا
لے آئی ہے تہذیب کہاں فکر ونظر کو
انساں کو نہیں ہستیِ انساں بھی گوارا
وہ آگ کے شعلوں میں تڑپتے ہوئے انساں
وہ خون کے دریاؤں میں بہتے ہوئے لاشے
دنیا ہے انھیں دیکھ کے انگشت بدنداں

اے اہل وطن تم نے دکھائے جو تماشے
یہ قہر خدا کا ہے نہ غصہ ہے قضا کا
یہ آگ خود انسان کی بھڑکائی ہوئی ہے
یہ ظلم، یہ بیداد، یہ لعنت، یہ تباہی
انسان کی انسان پہ خود لائی ہوئی ہے

(جگن ناتھ آزاد 'بیکراں' ص 79)

ایک مخصوص تاریخی واقعے کو شاعرانہ لب ولہجے کے ساتھ اس طرح ادا کر دینا کہ پورے واقعے کی تصویر قاری کے ذہن میں اتر جائے اور اس کا دل تڑپ اٹھے۔جگن

ناتھ آزاد کو اس سلسلے میں خداداد ملکہ حاصل ہے۔ وہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اسے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیتے ہیں، اس کے بعد بڑے درد و کرب کے ساتھ اسے صفحہ قرطاس پر رقم کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حیات و کائنات کا کافی گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ زندگی نے ان کے ساتھ جس طرح کا بھی برتاؤ کیا، انھوں نے اسے اسی طرح عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ ماضی کی تلخ یادیں انھیں بار بار جھنجھوڑتی ہیں۔ زمانۂ حال انھیں یاس و حسرت میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن مستقبل کے لیے پھر بھی وہ دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔ دراصل آزاد ہر وقت ایک شاندار مستقبل کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ وہ انسان کو زندگی کی مثبت قدروں کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ البتہ ماضی کو وہ ایک لمحے کے لیے بھی فراموش کرنا نہیں چاہتے۔ ماضی کے ہولناک حالات و واقعات بالخصوص اپنے چھوڑے ہوئے وطن کی محبت نے ان کی معصوم و پرخلوص ہنسی میں غم کی چاشنی پیدا کر دی ہے اور سب سے بڑا کمال یہ کہ آزاد نے 1947 کے المناک حالات و واقعات کی جیتی جاگتی تصویر اپنی شاعری میں پیش کر دی ہے۔ شاید ہی ان کا کوئی ہمعصر اس طرح سے پیش کر سکا ہو۔ اس بیان کی تصدیق کے لیے ان کی ایک نظم 'پناہ گزیں' ملاحظہ کیجیے۔

خموشیوں میں حادثوں کی داستاں لیے ہوئے
دل حزیں میں درد و غم کا اک جہاں لیے ہوئے
نگاہ میں حدیثِ جورِ داستاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ
مکاں کسی کا جل گیا کسی کا گھر اجڑ گیا
کسی سے کوئی زندگی کا آسرا بچھڑا گیا
لٹی ہوئی بجھی ہوئی جوانیاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ
اگر چہ دور آ چکے دھڑک رہے ہیں دل ابھی
قدم میں کپکپی سی ہے نظر ہے مضمحل ابھی
خموش لب پہ حشر نالہ وفغاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ

('بیکراں' ص 306-7)

'شکنتلا' جگن ناتھ آزاد کی ایک شاہکار نظم ہے جو انھوں نے اپنی جواں سال بیوی کی موت پر لکھی ہے۔ یہ نظم ان کی بیوی کے حسن اخلاق، اس کی بیماری اور موت کے علاوہ آزاد کے غمناک جذبات و کیفیات کو محیط ہے۔ آزاد اپنی اہلیہ کی بیماری کے دوران جن مصائب و آلام اور مشکلات سے گزرے ہیں ان تمام کا ذکر مذکورہ نظم میں موجود ہے۔ نظم شروع سے لے کر اختتام تک پورے حزنیہ مراحل سے گزر کر قاری کو آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے۔ بیوی کی محبت اور اس کی ہمیشہ کی جدائی نے آزاد کو انتہائی غمگین اور رقیق القلب بنا دیا ہے۔ اسی لیے وہ 'شکنتلا'، 'ایک آرزو' اور 'استفسار' جیسے عنوانات کے تحت اپنی بیوی کو شاعرانہ خراج عقیدت پیش کر چکے ہیں۔ مذکورہ نظموں میں جگن ناتھ آزاد نے اپنی بیوی کے غم کو اتنی شدت سے پیش کیا ہے کہ قاری خود بھی غمگین ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ریل گاڑی رک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغر لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے
میں اسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا
پتھروں پہ ڈگمگاتا جابجا گرتا رہا
کون کر سکتا ہے لیکن اے اجل! تیرا علاج
جب نہ منظور مقدر ہو تو پھر کیسا علاج
اے گرفتارِ تپ کہنہ! قرارِ چشم دل
ایک مدت تک رہی ہے تو علیل و مضمحل
ایک مدت تک تجھے درد والم سہنا پڑا
دور گھر سے اسپتالوں میں تجھے رہنا پڑا
تجھ کو ہر بد ذائقہ کڑوی دوا پینی پڑی
مدتوں پینی پڑی بے مدعا پینی پڑی
پھیپھڑے پر وہ ترے جراح کے نشتر کی ضرب
یاد سے اس کی مرے احساس میں ہے درد و کرب
اب نہ روئے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر
اور اس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر
اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے
اب نہ بیماروں کے بستر پر سلائیں گے تجھے
اے کہ گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے
آگ کے شعلوں میں جاسوئی ہے کس آرام سے
آسماں تک شعلے پہنچے اور تو نے اف نہ کی
کس قدر حیران کن ہے ارتقائے زندگی
روح باقی جاچکی ہے جسم فانی جل چکا
آج وہ میرا جہان شادمانی جل چکا
ہائے کیا نقشہ دکھا یا گردشِ ایام نے
تو نہیں ہے یہ ہیں تیرے پھول میرے سامنے

('بیکراں' ص 122 تا 30)

نظم 'ایک آرزو' اور 'استفسار' سے ماخوذ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے جو جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

اے شریکِ رنج و راحت! زندگانی کی رفیق
چارہ سازِ درد، میری شادمانی کی رفیق
کاش مجھ کو تیری دنیا کا پتا دیتا کوئی
تو کہاں ہے مجھ کو اتنا ہی بتا دیتا کوئی
آگ کی منزل پہ تو میں خود تجھے پہنچا گیا
اس کے آگے کچھ نہ دیکھا میں نے شعلوں کے سوا
تو کہاں ہے اے مرے خاموش نالوں کی مکیں
ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھ کو میری دنیائے حزیں
تو خدا جانے کہاں ہے اور کس عالم میں ہے
میں ہوں جس دنیا میں لیکن وہ سراپا غم میں ہے
یادگاریں تو نے چھوڑی ہیں جو دو میرے لیے
گرچہ قندیلیں ہیں دو وہ میری دنیا کے لیے
یہ بتا میں ان کو لیکن مطمئن کیوں کر کروں
چھیڑتی ہیں جب وہ تیرا ذکر ان سے کیا کہوں
جو بڑی ہے وہ تو میری مان بھی جاتی ہے کچھ
اس پہ جو گزری ہے آفت جان بھی جاتی ہے کچھ
آہ چھوٹی ہے جو لیکن اس کو سمجھائے تو کون
تو نہ واپس آسکے گی اس کو بتلائے تو کون
جاں ہے ننھی سی مگر کس کرب سے لبریز ہے
نو دمیدہ اس کا یہ احساس کتنا تیز ہے
پوچھتی ہے مجھ سے اکثر 'کنتلا کب آئے گی'
'اور جب آئے گی تو میرے لیے کیا لائے گی'

('بیکراں' ص 143 تا 149)

ان اشعار میں جگن ناتھ آزاد نے اپنے غمزدہ دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ہر شعر میں ان کے خلوص و صداقت کی جھلکیاں موجود ہیں۔ ان کی شریک حیات کے غم نے انھیں ایک طرح سے معذور و مجبور اور نحیف و نزار بنا دیا تھا۔ آزاد نے لفظیات اور تراکیب کے برمحل استعمال سے ایک مخصوص صدمے کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اس طرح جگن ناتھ آزاد کا غم ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان کی شاعری کے قارئین بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری میں ان کا اپنا اور زمانے کا غم موجود ہے۔ ان لوگوں کا غم ہے جو 1947 کے خونی واقعات کا شکار ہوئے۔ گھر سے بے گھر ہونے کا غم، وطن سے بے وطن ہونے والوں کا غم اور سب سے بڑا غم آزاد کے نزدیک زندگی اور انسان کا غم ہے کیونکہ زندگی نہ صرف تغیر پذیر ہے بلکہ فانی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں سوز و گداز اور غم و اندوہ کی کیفیات موجود ہیں۔

■

Dr. Mushtaq Ahmed Wani
Asst. Professor, Dept of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajouri - 185234 (J&K)
Mob.:9419336120

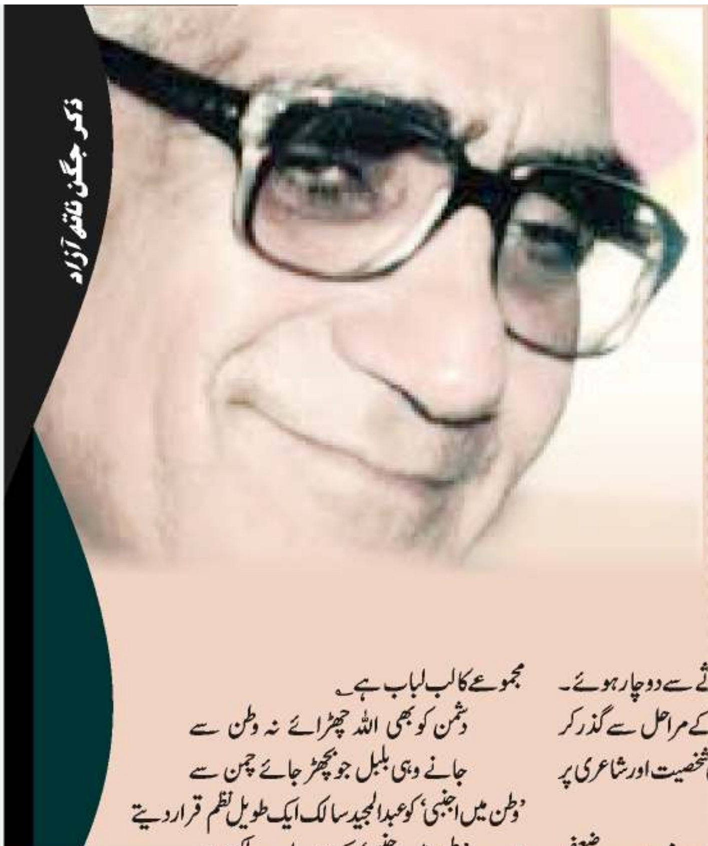

امتیاز احمد

وطن میں اجنبی
تقسیم اور ہجرت کے آئینے میں

جگن ناتھ آزاد اردو کے نامور شاعر تلوک چند محروم کے صاحبزادے تھے۔ آزاد نے نثر اور نظم میں 70 کتابیں اور سیکڑوں مقالات لکھے ہیں۔ ایسے شعرا اور ادبا بہت کم ہیں، جو شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ اس معنی میں وہ ایک کثیر الجہت فن کار ہیں۔ اُن کا کل شعری سرمایہ 9 مجموعوں پر مشتمل ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں کے نام تاریخی ترتیب کے ساتھ یوں ہیں: طبل وعلم، بیکراں، ستاروں سے ذرّوں تک، وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں، کہکشاں، بوئے رمیدہ، گہوارۂ علم و ہنر، نسیم حجاز۔ ان شعری مجموعوں کے علاوہ آزاد نے مختلف موضوعات پر طویل نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں اردو، ابوالکلام آزاد، ماتم نہرو، شاعر کی آواز، اجنتا، دہلی کی جامع مسجد، رفیع صاحب کے مزار پر اور ماتم سالک وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جس سے ان کے ذہنی اور فکری ارتقا کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ان نظموں کے موضوعات کو پڑھ کر ہی آزاد کی انسان دوستی اور وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنی شاعری میں زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بیان کیا ہے وہ اپنی شاعری میں زندگی کے بیتے ہوئے سرد و گرم حالات کو بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں اپنی ہجرت کے غم بیان کیے اور کہیں انھیں 1947 کے خونین مناظر پر افسوس ہوتا ہے۔ آزاد کی شاعری ان کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اور ان کی شاعری میں ان کے عہد کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

آزاد کو بھی نہ چاہتے ہوئے لاہور سے دہلی ہجرت کرنا پڑی۔ آزاد کے یہاں تقسیم ملک، ہجرت، اور بے وطنی غم کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ غم ان کے شعری مجموعے 'وطن میں اجنبی' 1954 میں مکمل صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ یہ مجموعہ ایک ایسے شاعر کی روداد ہجرت ہے، جس نے تقسیم اور ہجرت کو نہ صرف دور کنارے سے دیکھا بلکہ خود بھی اس بھیانک حادثے سے دوچار ہوئے۔ انھیں اپنے آبائی وطن سے ہجرت کے مراحل سے گذر کر دہلی آنا پڑا۔ فراق گورکھپوری آزاد کی شخصیت اور شاعری پر اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

''تقسیم ہندوستان نے حضرت محروم سے ضعیفی میں اور آزاد سے جوانی میں ان کا محبوب خطّہ وطن مغربی پنجاب چھڑوایا۔ اس سانحہ نے آزاد کی شاعری میں نئی کسک اور نیا چٹیلا پن پیدا کر دیا ہے۔ چھوٹے ہوئے وطن کی محبت نے ان کی معصوم و پُر خلوص ہنسی میں آنسوؤں میں تبسم کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ اس سے ان کا کلام اور بھی چمک اُٹھا ہے۔ آزاد کے کلام میں پنجاب کی یاد سے پیدا ہوئے اشعار ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس خلوص کے ساتھ آزاد نے نئے اور اجنبی ماحول کو اپنایا ہے وہ بھی قابل صد ہزار تحسین ہے۔''

(جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری، حمیدہ سلطان احمد، نئی دہلی، مونومینٹل پبلشرز، 1991، ص 36)

آزاد نے اپنے کردار اور اپنی ادبی خدمات کے ذریعے سے اردو کو مالا مال کیا۔ آزاد نے گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی اپنی تخلیقات سے کی ہے۔ انھوں نے امن اور محبت کا درس دیا۔ نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بلکہ پوری دنیا میں وہ اردو کے سفیر مانے جاتے ہیں۔ اس شعری مجموعے میں ہم ایک نئے آزاد سے متعارف ہوتے ہیں۔ جو حقیقی زندگی کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہوتا ہے۔ تقسیم، فسادات اور ہجرت اس کا اہم موضوع ہیں۔ ان تمام واقعات کو آزاد نے تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہجرت کے بعد وطن کی جدائی کا جو درد ہوتا ہے اس کو آزاد نے 'وطن میں اجنبی' میں بہترین انداز میں واضح کیا ہے۔ مجموعے کے آغاز میں ہی آزاد نے میر انیس کے شعر کو سرورق میں جگہ دی ہے۔ جو اس پورے شعری مجموعے کا لب لباب ہے۔

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے

'وطن میں اجنبی' کو عبدالمجید سالک ایک طویل نظم قرار دیتے ہیں۔ وہ 'وطن میں اجنبی' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ لیکن جو روح اس میں مسلسل جاری وساری ہے اس کے اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک طویل نظم ہے جس کے مختلف حصے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہوگئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاعر کے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے۔ پہلی مسدس تو پنجاب کا ایک مرثیہ ہے۔ اور اس موضوع پر اب تک جو بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں ان میں اپنے درد واثر کی وجہ سے بہت ممتاز ہے۔'' (ایضاً، ص 270)

ہندوستان کی تقسیم کے سبب ملک میں افراتفری، خونریزی اور ہجرت جیسے واقعات رونما ہوئے۔ جو صوبے ان حادثات کی لپیٹ میں سب سے زیادہ آئے ان میں پنجاب اور بنگال سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ آزاد کا تعلق سرزمین پنجاب سے تھا۔ 'وطن میں اجنبی' میں آزاد نے اپنی بے بسی کا رونا رویا ہے۔ انھوں نے 'وطن میں اجنبی' کے آغاز میں بطور تمہید کے پنجاب کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں انھوں نے پنجاب کی گذشتہ عظمت کے ترانے گائے ہیں، اور وہاں کے ہندو مسلم اتحاد پر رشک کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد تقسیم ہند کے سبب پنجاب کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا ہے۔ ملک کے دولخت ہونے کے ساتھ ساتھ پنجاب بھی دولخت ہو چکا تھا۔ آزاد کو اس تباہی و بربادی کا شدت سے احساس تھا۔

فردوس کا عالم میرے پنجاب کی دُنیا
تسکین کے، آرام کے، اسباب کی دُنیا

سیلاب محبت کے وہ گرداب کی دُنیا
درد و تپش وسوزوتب وتاب کی دُنیا
وہ ارض حسیں خطۂ محبوب زمانہ
کرتا ہوں یہاں اس کی تباہی کا فسانہ

(وطن میں اجنبی: جگن ناتھ آزاد، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ص29)

آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کی روشن مثال پیش کی ہے کہ کس طرح دونوں قومیں ایک دوسرے کا پاس و لحاظ رکھتی تھیں۔ دونوں قومیں ہندو مسلم اتحاد، اور انسانیت کی بہترین مثالیں ہیں۔ دونوں قوموں نے مل کر اس ملک کی حفاظت میں اپنی جان کے نذرانے پیش کیے ہیں۔

خود باغ کے مالی جو ہوئے باغ کے دشمن
اس خاک کا ہر گوشہ ہوا شعلہ بدامن
اپنا ہی چمن زار تھا اپنا ہی نشیمن
شاداں ہوئے جلتا ہوا دیکھا جو یہ گلشن
اس باغ کا تھا دھرم بھی ایماں بھی محافظ
ہندو بھی محافظ تھا مسلماں بھی محافظ

(ایضاً ص31)

آزاد پنجاب کی خستہ حالی اور تباہی پر بہت نالاں ہیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، یہی کچھ پنجاب میں ہوا۔ قوموں میں آپسی اختلاف اس قدر بڑھے کہ ملک ہی دولخت ہو گیا۔ اس سے پیدا ہونے والے حادثات وواقعات انسانیت کے نام پر ایک سیاہ دھبہ ہیں۔ مذہب کے نام پر جنونیوں نے وہ کچھ کیا جس کی مذہب اجازت بھی نہیں دیتا۔ تقسیم کے وقت جو عصمت دری اور قتل و خونریزی کا بازار گرم ہوا اور تمام مذاہب کے جاہل لوگ جس طرح اس میں شامل رہے یہ انسانیت کے بالکل خلاف ہے۔ اس پر تمام مذاہب کے جنونی لوگوں کی آزاد نے پول کھولی ہے۔

ہندو نے لیا وید کی عظمت کا سہارا
قرآں کے تقدس کو مسلماں نے پکارا
سکھ دھرم سے ہو دور کہاں اس کو گوارا
یوں لے کے زمانے میں مذاہب کا اجارہ
فردوس میں ان سب نے جہنم کو بسایا
پنجاب میں سامان قیامت نظر آیا

(ایضاً، ص31)

جگن ناتھ آزاد جب تقسیم کے بعد ہندوستان سے پاکستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اپنے پرانے وطن جا کر انہوں نے اپنی بے وطنی کا اظہار کیا اور اپنے پرانے وطن میں وہ ایک اجنبی بن کر آئے۔ اس بات سے انہوں نے اہلِ پاکستان کو اشک بار کر دیا۔ انہوں نے اپنی غزل میں اس درد وغم اور بے بسی کو بیان کیا ہے۔ یہاں پر شاعر کا احساس اور فن ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں اشعار۔

تیری بزم طرب میں سوز پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یاد ایام بہاراں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
نگاہوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن
کہ اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں
تفکر میں جمال صبح تاباں لے کے آیا ہوں

(ایضاً، ص70)

جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفر پاکستان کے موقع پر علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دے کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ آزاد نے اقبال کے پیرایہ بیان میں پیر رومی و مرید ہندی کی طرح اقبال سے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور اقبال سے جوابات بھی حاصل کیے ہیں۔ اس طرح آزاد نے بہت سارے سوالات کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے بعد آزاد نے مولانا تاجور نجیب آبادی کے مزار پر بھی حاضری دے کر روح تاجور کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ تاجور آزاد کو اے پسر، اے شاگرد کہہ کر نصیحت کرتے ہیں کہ تم کلام اور کردار کے ذریعے سے برصغیر کے لوگوں میں محبت اور امن کا پیغام دو، امن اور اتحاد، ہندو مسلم ایکتا کے داعی بن جاؤ۔ اس سب کے بعد روح تاجور آزاد سے ان کا کلام سننے کی فرمائش کرتی ہے۔ غرض آزاد نے وطن میں اجنبی میں خیالی ملاقاتوں کے ذریعے سے اپنے مقصد کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تقسیم وطن کے نتیجے میں ملک کے جو بڑے صوبے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ پنجاب اور بنگال تھے۔ یہ دونوں صوبے عمدہ کلچر، زبان، علم وادب، اور تصوف کا مرکز تھے۔ لیکن تقسیم کے حادثے میں یہ صوبے شر انگیزی کی آگ میں جھلس کر راکھ میں تبدیل ہو گئے۔ 'وطن میں اجنبی' میں آزاد ان ہی باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اسی ہندوستان میں دھرم کی مذہب کی دُنیا میں
تمدن کو جنوں کی لہر میں بہتا ہوا دیکھا
معین الدین چشتی کی زمیں پر، کرشن کے گھر میں
مسرت کو الم کی داستاں کہتا ہوا دیکھا
اسی پنجاب میں جس کی محبت کیش دُنیا میں
گورونانک نے اپنے دلنشیں نغمات برسائے
کیے بڑھ بڑھ کے افعال زبوں وہ ابن آدم نے
درندوں کو تو کیا ابلیس کو بھی جن پہ شرم آئے

(ایضاً، ص87)

آزاد نے 'وطن میں اجنبی' میں سرزمین بنگال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے بنگالیوں کی تاریخ، تہذیب ثقافت اور جذبۂ حُب الوطنی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آزاد کے مطابق یہی وہ صوبہ ہے جہاں سب سے پہلے ہندوستان میں جدید تعلیم اور ترقی کے آثار نظر آئے تھے۔ آزاد نے وہاں کی عظیم ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز وہاں کے تاریخی اور سیاحتی مقامات کی بھی تعریف کی ہے۔ ان نظموں میں کلکتے سے ڈھاکہ جاتے ہوئے چٹا گانگ، چٹا گانگ میں چندرن، مشرقی بنگال وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام نظموں میں بنگال ہی موضوع سخن ہے۔ اسی طرح بنگال میں تقسیم کے سبب پیدا ہوئے ماحول کو آزاد یوں بیان کرتے ہیں۔

وہی بنگال گونج اُٹھا جنون انگیز نعروں سے
ترانے پیار کے قاضی جہاں گاتا رہا برسوں
اُسی کی سرزمیں پر خون انسان کی ہوئی بارش
جہاں جام وفا ٹیگور چھلکاتا رہا برسوں

(جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری: حمیدہ سلطان احمد، نئی دہلی، مونومینٹل پبلشرز، 1991، ص269)

'وطن میں اجنبی' میں کچھ نظمیں عالم خیال میں چند ملاقاتیں، کے عنون سے ہیں۔ ان نظموں میں آزاد نے ترقی پسند شعرا کو ذہن میں رکھ کر اپنے سوالات کا جواب تلاش کیا ہے۔ ان شعرا میں سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ممتاز حسین، ظہیر کاشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں یہ بات بھی با آسانی سمجھ میں آتی ہے کہ آزاد کی شخصیت نے ترقی پسند تحریک سے بھی کچھ اثرات لیے ہیں۔ 'وطن میں اجنبی' کی نظموں کا یہ حصہ معنوی اعتبار سے بھی عمدہ ہے۔

'وطن میں اجنبی' میں شاعر نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا مرثیہ لکھا ہے۔ آزاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے احساسات، تجربات اور مشاہدات بھی بیان کیے لیکن کسی طرح کے منفی اثر کا شکار نہ ہوئے انہوں نے اس ساری تباہی کی ذمے داری کسی ایک فرد یا قوم پر نہیں ڈالی بلکہ حقیقت کے دونوں پہلوؤں کو واضح کر کے ملک کے اصلی دشمن یعنی انگریزی راج کے اصلی چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔ شاعر نے اپنے کلام کے ذریعے ہندوستانی قوم کو امن، محبت، وسیع المشربی اور سیکولر اقدار کا درس دیا ہے جس پر وہ خود بھی عمل پیرا رہے۔

■

Dr. Imtiyaz Ahmed
Ward No 4 Rahimabad
Bhatindi- 181152 (J&K)
Mob.: 6005225633

محمد مستقیم
یادوں اور باتوں میں

ارشاد احمد

محمد مستقیم ماہر غالبیات کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ نے غالب کی شاعری میں سائنس علی الخصوص علم طبیعیات کے بعض اصول سے موافقت اور مطابقت کی بازیافت کا کام کیا ہے اور یہ کام ایسا نہیں کہ غالب کو پسند کرنے والا کوئی شخص سرسری نظر سے دیکھ کر گزر جائے، بلکہ وہ چند لمحہ رک کر یہ سوچنے پر مجبور ہوجائے گا کہ کیا واقعی غالب نے شاعرانہ اور فلسفیانہ ذہن کے ساتھ ساتھ سائنس رسا دماغ بھی پایا تھا۔

14 اپریل کو معروف شاعر افتخار راغب کے فیس بک وال سے یہ دل دوز خبر ملی کہ محمد مستقیم صاحب راہی ملک عدم ہوئے۔ دل میں بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ تصدیق کرنے کے لیے اسی گاؤں میں مقیم اپنے بھانجے کو فون لگایا۔ اس نے خبر کو صحیح بتایا اور مزید اطلاع دی کہ 15 اپریل کی صبح نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی۔ وقت مقررہ پر ان کے آبائی گاؤں موضع محمد پور پچرخی پہنچ گیا۔ تجہیز، تکفین و تدفین میں شامل رہا۔

بات فروری 2001 کی ہے۔ ماہنامہ آجکل (اردو) نئی دہلی، میں محمد مستقیم صاحب کا ایک انوکھا مضمون شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا 'غالب کا قصیدہ' (غارسیاہ کی دادخواہی بحضور مفتی اعظم صدرالدین، صدر نشین عدالت عالیہ شاہی) یہ مضمون نہ صرف عنوان سے اچھوتا تھا بلکہ غالب کے قصیدے کی تفہیم، تشریح اور تعبیر کے اعتبار سے بھی بالکل نیا اور جداگانہ تھا۔ ہر چند کہ مرزا غالب کی فارسی شاعری اور سائنسی نکات کی تشریح و تعبیر کا زیادہ تر حصہ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن اتنا ضرور ذہن نشیں ہوگیا کہ غالب کو فلکیات اور علم طبیعیات کا گہرا درک تھا۔ گفتگو رواں اور مدلل تھی۔

محمد مستقیم ماہرِ غالبیات کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ نے غالب کی شاعری میں سائنس علی الخصوص علم طبیعیات کے بعض اصول سے موافقت اور مطابقت کی بازیافت کا کام کیا ہے اور یہ کام ایسا نہیں کہ غالب کو پسند کرنے والا کوئی شخص سرسری نظر سے دیکھ کر گزر جائے، بلکہ وہ چند لمحہ رک کر یہ سوچنے پر مجبور ہوجائے گا کہ کیا واقعی غالب نے شاعرانہ اور فلسفیانہ ذہن کے ساتھ ساتھ سائنس رسا دماغ بھی پایا تھا۔ جناب محمد مستقیم نے اپنے نادر و نایاب مضامین سے ثابت کردیا کہ غالب کا ذہن ادبی، شعری اور منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی بھی تھا۔ یہ مضامین آجکل میں تواتر سے شائع ہوئے۔

محمد مستقیم کی تاریخ ولادت سرٹیفکیٹ کے اعتبار سے 10 اکتوبر 1931 ہے۔ جائے پیدائش موضع محمد پور تھانہ پچرخی ضلع سیوان ہے۔ والد کا اسم گرامی نظرالحق تھا اور والدہ بی بی روضہ خاتون کے نام سے مشہور تھیں۔ والد مفلوک الحال کاشتکار تھے۔ ابتدائی تعلیم شاہ تکیہ کے پرائمری مکتب میں ہوئی۔ تیسرے درجے کے بعد پچرخی مڈل اسکول میں داخلہ ہوا۔ ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول، سیوان سے نویں جماعت پاس کی۔ میٹرک کا امتحان انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول، سیوان سے 1950 میں پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی سندیں ڈی اے وی کالج سیوان سے حاصل کیں۔ گھر کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی لیکن محمد مستقیم اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنی والدہ سے خواہش کا اظہار کیا۔ والدہ نے بتایا کہ گھر میں صرف ڈھائی روپے موجود ہیں۔ اتنے پیسے میں تم پٹنہ کیا سیوان میں بھی تعلیم حاصل نہیں کرسکوگے۔ اس لیے پڑوس کے ایک شخص سے کچھ پیسے بطورِ قرض لے کرانھیں پٹنہ جانے کا انتظام کیا۔

1950 میں قومی سطح پر اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے دستخطی تحریک چل رہی تھی۔ بہار میں اس کے روح رواں غلام سرور (مرحوم) تھے۔ محمد مستقیم نہ صرف یہ کہ اس تحریک میں پیش پیش رہے بلکہ اس کام کے لیے کچھ چندہ بھی اکٹھا کیا اور تمام چیزیں غلام سرور کے پاس بھیج دیں۔ اس طرح غلام سرور سے ان کی جان پہچان طالب علمی کے زمانے میں ہی ہوگئی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد محمد مستقیم پٹنہ پہنچے تو سب سے پہلے غلام سرور سے ہی ملاقات کی اور اپنا مدعا بتایا۔ انھوں نے پٹنہ میں مقیم ایک رئیس کے بچے کا اتالیق بنا دیا۔ قیام وطعام کا بھی انتظام وہیں ہوگیا۔ لیکن یہ کام عارضی تھا اور محمد مستقیم نے مستقل معاش کی تلاش میں پٹنے کا رخ کیا تھا۔ اس لیے اس کام سے وہ مطمئن نہیں تھے اور روزگار کی تلاش میں مختلف دفتروں کا چکر لگاتے تھے۔ ایک دن کی بات ہے کہ سکریٹریٹ میں ریاضی داں کے لیے چند اسامیوں کا اشتہار نکلا۔ آپ نے درخواست دے دی۔ حسن اتفاق کہ آپ کی بحالی ہوگئی اور Sugar cane research centre، پوسا (سمستی پور) میں 1955 میں تقرری عمل میں آئی۔ وہاں آپ کی ملاقات حسن امام صاحب سے ہوئی جو مقامی اسپتال میں بہ حیثیت کمپاؤنڈر مامور تھے۔ علاقائی ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ محمد مستقیم صاحب کے آفس میں جمنا پرساد بھی کام کرتے تھے۔ وہ باصلاحیت اور باذوق انسان تھے۔ انھیں ریاضی اور علم طبیعیات میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ محمد مستقیم صاحب کی بھی مذکورہ مضامین میں گہری دلچسپی تھی۔ ان کی شخصیت کا آپ پر گہرا اثر پڑا۔

پوسا میں ابھی کچھ ہی ماہ گزرے تھے کہ Junior statical officer کا اشتہار نکلا۔ آپ نے فارم بھر دیا۔ امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ اس عہدے کی تنخواہ زیادہ تھی اور کام کم تھا۔ اس عہدے پر آپ کا تقرر اپچکا گاؤں (تھانہ، میرگنج، ضلع گوپال گنج) میں ہوا۔ یہ 1956 کی بات ہے۔ میرگنج میں زندگی بڑے آرام سے گزرنے لگی۔ آبائی گاؤں سے قریب ہونے کی وجہ سے گھر سے تعلق بنا رہا۔ والدین کی خدمت کرنے کا موقع بھی میسر آیا، لیکن مزید رفعت وعزت کی چاہت نے مطمئن نہیں ہونے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد Industrial supervisor کے لیے آسامیوں کی بحالی نکلی۔ آپ نے درخواست دی اور کامیاب ہوئے۔ ٹریننگ کے لیے پٹنہ اور کولکاتا کا سفر کیا اور تقرری مدھوبنی بلاک (بگہا) مغربی چمپارن میں ہوئی۔ 1961 میں رام نگر تبادلہ ہوا۔ وہاں سے برہک

بلاک (سنقال پرگنہ) بھیج دیے گئے۔ وہاں آپ کی کافی عزت افزائی ہوئی۔ یہ جگہ دامن کوہ میں آباد تھی لیکن قدرتی مناظر قابل دید تھے۔

1962 محمد مستقیم کے لیے کافی سود مند رہا۔ اسی سال محکمہ جاتی امتحان پاس کر کے گزٹیڈ افسر بنے اور سرکل افسر کے طور پر مہنار (سمستی پور) میں تعینات کیے گئے۔ چار پانچ سال گزرنے کے بعد 1971 میں مجسٹریٹ بن کر گوڈہ (سنتھال پرگنہ) چلے گئے۔ 1971 میں ترقی پا کر Assistant survey & settlement officer بن گئے۔ سہرسہ میں تقرری عمل میں آئی۔ وہاں اس عہدے پر 1978 تک مامور رہے۔ اس کے بعد Land settlement officer بن کر بھاگلپور چلے گئے۔ ابھی چھے ماہ ہی گزرے تھے کہ ڈالٹین گنج میں SDO کے عہدے پر پوسٹنگ ہوگئی۔ وہاں ایک سال رہے اس کے بعد اسی عہدے پر حاجی پور تبادلہ ہوگیا۔ 1980 میں Additional collector کے عہدے پر ترقی پا کر چھپرہ چلے آئے۔

چھپرہ میں کرامت حسین صاحب سے ملاقات ہوئی جن کے سید اجتبیٰ رضوی سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن دونوں حضرات نے مشورہ کیا اور اجتبیٰ رضوی کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی طبیعت علیل تھی اور اسی حالت میں پٹنہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آکاش وانی پٹنہ میں کسی نشریہ کی ریکارڈنگ تھی۔ اس لیے کچھ تفصیل سے گفتگو نہیں ہو پائی۔ ان کے برادر مہدی حسین نے چائے سے ضیافت کرائی۔ لیکن محمد مستقیم صاحب کی تشنگی برقرار رہی۔ اس لیے ایک دن تنہا ہی اجتبیٰ رضوی سے ملنے چلے گئے۔ اس دن طبیعت بحال تھی۔ انھوں نے محمد مستقیم صاحب سے پوچھا کہ آج کل کیا پڑھ رہے ہیں؟ انھوں نے جواباً عرض کیا کہ خلیل جبران کی کتاب پڑھ رہا ہوں اور کچھ دنوں قبل احسان دانش کو پڑھا تھا۔ لیکن آٹھ دس برسوں سے ادب سے رشتہ کمزور ہوگیا ہے۔ اس دن اجتبیٰ رضوی نے اپنا مجموعۂ کلام 'شعلۂ ندا' کی ایک کاپی عنایت کی اور اپنی ذاتی لائبریری میں سے چند مفید اور اہم کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ اس میں tao te ching کی کتاب بھی شامل تھی۔ یہ کتاب انھیں بہت اچھی لگی۔ یہ ایک مذہبی کتاب تھی۔ اس کا مصنف Lao-tzu چوتھی صدی (ق م) میں چین کا عظیم فلسفی اور مفکر گزرا ہے۔ اسی کے نام پر Taoism مذہب وجود میں آیا۔ اس کتاب میں اخلاقی قدروں، باطنی اصلاح اور معرفتِ الٰہی کا تذکرہ ہے۔ اس طرح ان سے برادرانہ اور سخن گسترانہ رشتہ قائم ہوگیا۔

محمد مستقیم صاحب جب تک چھپرہ میں مقیم رہے اجتبیٰ رضوی کے قریب رہے۔ اجتبیٰ رضوی نے انھیں مشورہ دیا کہ ان کی رباعیوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کریں۔ محمد مستقیم صاحب کو انگریزی زبان پر اچھی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے 'شعلۂ ندا' کی رباعیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ اس کی پہلی نظم حکمت و حیرت نے انھیں کافی متاثر کیا۔ 79 رباعیات پر مشتمل اس نظم میں انسانی زندگی، ارتقائی نظریۂ حیات اور قسمت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نظم میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو انھوں نے شعری پیکر عطا کیا ہے۔ اظہار بیان موثر، لطیف اور پرکشش ہے۔ علامہ اقبال کے مردِ مومن کی طرح اجتبیٰ رضوی کے یہاں 'آدم اکبر' (سوپر مین) کا تصور ملتا ہے۔ آدم پر انھوں نے تین نظمیں فریادِ آدم، ترانۂ آدم اور تقدیر آدم لکھی ہیں۔ اس طرح کی شاعری دوسروں کے یہاں نایاب ہے۔ انھوں نے پوری نظم کو انگریزی میں ترجمہ کر دیا اور اجتبیٰ رضوی کو دکھایا۔ چونکہ یہ ترجمہ لفظی تھا اس

لیے اس میں سلاست و روانی کی کمی تھی۔ اجتبیٰ رضوی نے بتایا کہ ترجمہ لفظی نہیں بلکہ خیالات، مضامین اور جذبات کا ہونا چاہیے۔ انھوں نے ایڈورڈ فٹز جیرالڈ (Edward fitz Gerald) (1809-1883) کے ترجمے کو پڑھنے کا مشورہ دیا جنھوں نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ چند ماہ اور گزر گئے۔ محمد مستقیم صاحب نے ان رباعیوں کا آزاد ترجمہ کر دیا۔ انگریزی میں ترجمہ کردہ اپنی رباعیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور گھنٹوں محمد مستقیم صاحب کی تعریف کرتے رہے۔ اس کے بعد محمد مستقیم صاحب نے ان کی حیات، شاعری اور اہم کارناموں پر تفصیلی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں اجتبیٰ رضوی نے معمولی ردوبدل کی اور کتابی شکل میں شائع کرانے کی اجازت دے دی۔ یہ کتاب 1986 میں گوپال گنج کے ایک مقامی مطبع شیکھر مندرالیہ سے شائع ہوئی۔ اس وقت اجتبیٰ رضوی اپنی صاحبزادی کے ساتھ بنارس میں مقیم تھے۔ کتاب دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں اور ملاقات کے لیے گوپال گنج آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اجتبیٰ رضوی سیوان تک ٹرین سے آئے اور وہاں سے محمد مستقیم صاحب اپنی گاڑی میں لے گئے۔ انھوں نے کتاب کو ایک بار پھر بغور دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے گرے۔ محمد مستقیم صاحب کو ایک غیر مانوس خوف ستانے لگا کہ کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوگئی۔ لیکن جب طبیعت میں افاقہ ہوا تو گویا ہوئے کہ "آپ نے وہ احسان کر دیا کہ جس کا نعم البدل میرے پاس نہیں ہے"۔ محمد مستقیم صاحب نے کہا "مجھے نعم البدل کی نہیں بلکہ دعاؤں کی ضرورت ہے"۔ اجتبیٰ رضوی کئی ماہ تک ان کے مہمان بنے رہے۔

محمد مستقیم صاحب کو بچپن سے ہی اردو ادب سے لگاؤ تھا۔ ان کے گاؤں کے پڑوسی محمد شمس الدین لاہور میں نوکری کرتے تھے۔ ان کے بغل میں ہی احسان دانش کی پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ ان دونوں میں بڑی قربت تھی۔ ان کے مزاج میں موزونیت تھی اور شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ مرزا غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ انھیں مرزا غالب کے سیکڑوں اشعار ازبر تھے۔ محمد شمس الدین جب گاؤں آتے تو احسان دانش کی دکان سے کچھ کتابیں محمد مستقیم صاحب کے لیے بھی لاتے۔ دونوں میں مرزا غالب کی شاعری پر گھنٹوں گفتگو ہوتی۔ انھوں نے محمد مستقیم صاحب کو مرزا غالب کا دیوان مطالعے کے لیے تحفۃً دیا اور فرمایا کہ "مرزا خالص سائنس کا آدمی تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کے اشعار کی تفہیم سائنس کے حوالے سے نہیں ہوسکی ہے"۔ جب محمد مستقیم صاحب نے غالب کے اشعار بالخصوص فارسی، کا مطالعہ کیا تو اس بات میں صداقت نظر آئی۔ انھوں نے ان اشعار کا موازنہ علم الطبیعیات کے مختلف اصولوں سے کیا تو ان میں کافی موافقت نظر آئی۔ انھوں نے کتاب پر ہی حاشیہ لکھنا شروع کیا۔ اس طرح انھوں نے مرزا غالب کے اشعار کی نئی تفہیم و آگہی پر مبنی ایک مضمون قلم بند کیا اور آجکل (اردو) نئی دہلی کو بھیج دیا۔ وہ مضمون شائع ہوا اور کئی حضرات نے ستائش نامے ارسال کیے۔ اس سے ان کے خیال اور وژن میں پختگی

آئی۔اس کے بعد انھوں نے کئی مضامین لکھ ڈالے جو آجکل (اردو) اور زبان و ادب (پٹنہ) میں تواتر سے شائع ہوئے۔

محمد مستقیم صاحب کی کل پانچ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1 وزڈم اینڈ ونڈر (Wisdom & wonder)۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے۔ اس میں سید اجتبیٰ رضوی کی سوانح حیات اور ادبی خدمات پر جامع اور مبسوط مضمون کے ساتھ ساتھ ان کے مجموعہ کلام 'شعلہ ندا' کی 79 رباعیوں کا انگریزی میں آزاد ترجمہ ہے۔ 128 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 30 روپے ہے۔

2 **غالب ایک سائنس داں:** محمد مستقیم صاحب کی دوسری تخلیق ہے۔ جو فاروقی پرنٹرس کانپور سے شائع ہوکر 2002 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔ غالب کے آئینے میں آئنسٹائن، غالب شاعر و سائنس داں، غالب کا قصیدہ نمبر 61، پیران ساوی، غالب کا قصیدہ نمبر 62، غالب کی طیف اساس شاعری۔ ان کے علاوہ عرضِ مصنف کے نام سے مختصر اور عشرت ظفر کا 'غالب کا گنج باد آورد' کے نام سے دو مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ مذکورہ بالا تمام مضامین میں مرزا غالب کو ایک سائنس داں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ صفحات کی تعداد 152 ہے اور قیمت 100 روپے درج ہے۔ غالب کے متعلق محمد مستقیم لکھتے ہیں:

"غالب فطرت کا پہلا محرم راز ہے جس نے شاعری کو رموز فطرت کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ مگر تساہل ذہنی کو کیا کہیے کہ ہم نے غالب کی شاعری لے لی اور اس کی جان کو نظر انداز کر دیا۔ لہٰذا بہ حیثیت شاعر غالب مشہور ہوگیا اور اس کا سائنسی نابغہ پردہ خفا میں پڑا رہا۔ اس سے غالب کا نہیں ہمارا عظیم نقصان ہوا جس کی تلافی ممکن نہیں۔ فطرت کے جو بے بہا رموز و عوامل اولاً غالب کے منصہ شہود پر ظاہر ہوئے وہ نگاہِ بینا کا بھلا کب تک انتظار کرتے؟ بعد میں دوسرے سائنس دانوں نے ان کا آزادانہ انکشاف کیا اور انھیں لے کر آگے بڑھ گئے۔

(غالب: ایک سائنس داں، ص 52)

3 **ترجمہ دیباچۂ غالب:** مرزا غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ انھوں نے لکھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

(میرا فارسی کلام دیکھو جس میں طرح طرح کے رنگین نقش موجود ہیں۔ میرے مجموعۂ اردو سے صرف نظر کرو کہ یہ بے رنگ ہے۔)

مرزا غالب کا جب پہلا فارسی دیوان مکمل ہوا تو

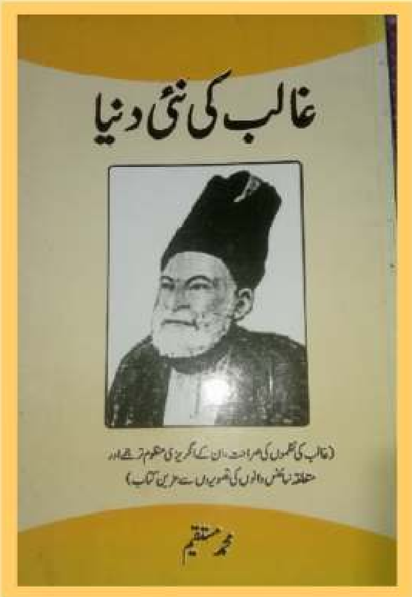

انھوں نے بڑے جوش اور ولولے میں ایک دیباچہ لکھا۔ یہ دیباچہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ اس کی زبان استعاراتی، مبہم اور ادق ہے۔ محمد مستقیم نے اس دیباچے کا ترجمہ مع تدوین اردو میں کیا اور اس کا نام 'ترجمۂ دیباچۂ غالب' رکھا۔ یہ رسالہ 2006 میں شائع ہوا۔ 72 صفحات پر مشتمل اس کی قیمت 60 روپے درج ہے۔ محمد مستقیم صاحب نے اس دیباچے میں سائنسی نکات کی تلاش کی ہے۔ اس مختصر رسالے میں محمد مستقیم نے ان نکات کی نشاندہی کی ہے جو سائنس کے اصولوں نیز نئی دریافتوں پر مبنی ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیں:

"غالب نے الکٹران پر بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ الکٹرانک عہد ہے۔ تقریباً ہر شعبۂ حیات میں کمپیوٹر حاوی ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ 1895 میں برطانوی سائنس داں جے جے تھامس نے الکٹران کا انکشاف کیا تھا۔ بھلا غالب اسے کیسے جانتا؟ غالب کو الکٹران کا سراغ روشنی کے طیوف سے حاصل ہوا۔ غالب طیف شناس تھا۔ طیف اپنے گزرگاہ کا نقش رکھتا ہے۔ غالب کے عہد میں یہ اشاریہ کے آٹھویں عدد تک معلومات فراہم کرسکتا تھا۔ اعشاریہ کا آٹھواں عدد ایک سینٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہے۔ یہی حد ایٹم کی ہیئت ہے۔

(ترجمہ دیباچۂ غالب، عنوان عرض مترجم، ص 16)

4 **غالب کی نئی دنیا:** یہ کتاب محمد مستقیم صاحب کی چوتھی تخلیق ہے۔ یہ کتاب 2007 میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کو بہار اردو اکادمی نے عبدالمغنی انعام سے نوازا۔ اس کتاب میں کل 34 مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے توسط سے محمد مستقیم نے مرزا غالب کو ایک نئی دنیا یعنی سائنس کی دنیا کا تخلیق کار بنا دیا ہے۔ بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن:

"غالبیات پر مہارت کے بہت دعویدار ہیں مگر غالب پر محمد مستقیم کے مقالے سے جو منظر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ مستقیم آئے اور ماہرین غالبیات کی گود سے غالب کو لے کر چلتے بنے اور بیچارے ماہرین اپنے منھ کھولے دیکھتے رہ گئے"

اس کتاب کے کل صفحات 130 ہیں اور قیمت 100 روپے ہے۔

5 **غالب کے کلام میں سائنسی کہکشاں:** یہ کتاب محمد مستقیم صاحب کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اسے محمد آزاد حسین نے ترتیب دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس سے شائع کرایا ہے۔ اس میں محمد مستقیم صاحب کے بارہ مقالات شامل ہیں جب کہ مرتب نے مقدمہ کے تحت کتاب کا تعارف اور محمد مستقیم صاحب کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین آجکل (اردو) میں شائع ہوچکے ہیں۔

محمد مستقیم صاحب کی شادی مولوی محمد حنیف موضع حبیب پور تھانہ بڑہریا ضلع سیوان کی صاحبزادی چاند تارہ کے ہمراہ 1956 میں ہوئی۔ آپ کے بطن سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تولد ہوئیں۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد جاوید آئی آئی ٹی گوہاٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ مرحوم انتقال کے وقت یہیں مقیم تھے۔ دوسرے صاحبزادے محمد پرویز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ ہیں۔ دونوں بیٹیوں کی شادی ہوچکی ہے اور خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مختلف شہروں اور عہدوں پر اپنی خدمات انجام دینے کے بعد محمد مستقیم صاحب 31 اکتوبر 1991 میں حاجی پور سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت آپ ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ آفیسر کے عہدے پر مامور تھے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنے آبائی وطن محمد پور پچرخی میں رہنا پسند کیا اور غالب پر اپنا تحقیقی کام جاری رکھا۔ اس بات میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ انھوں نے مرزا غالب کے کلام کی تفہیم و تشریح کا ایک الگ نظریہ قائم کیا ہے اور مرزا کے کلام کو سائنسی تناظر میں پرکھنے کی ابتدا کی ہے۔ میری دانست میں مرزا غالب کے تعلق سے محمد مستقیم صاحب کا کام بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ آپ کی علمی اور ادبی خدمات کی قدروں کا تعین ابھی باقی ہے۔ تقلید پسند ناقدین اور روایت پسند قارئین نے بے توجہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں ان کے کارناموں کو ملک گیر سطح پر پذیرائی ہوگی۔

■

Dr. Irshad Ahmad
1731, Islamia Nagar
Seewan- 841226 (Bihar)
Mob.:9431644722

مٹی کی سوندھی خوشبو کا شاعر
سرفراز شاکر

اکمل نعیم

اس سے آگے چلا نہ جائے گا   عمر بھر کی تکان ہے بھائی

جودھپور کی ادبی سرزمین پر اردو غزل کی آبیاری میں برسوں سے مشغول ایک بے لوث اور سادہ مگر ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر نے حال ہی میں اس دار فانی کو الوداع کہتے ہوئے اپنے زندگی کے سفر کو مکمل کیا۔ جی ہاں! سرفراز شاکر یقیناً اب اپنے چاہنے والوں کے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا کلام انہیں دل و ذہن میں صدیوں تک زندہ رکھے گا۔

تو ہی ہارے گی زندگی اک دن   ختم ہوگا نہ سلسلہ میرا

شاکر صاحب کو شاعری وراثت میں ملی تھی کیونکہ ان کے پردادا صابر شاہ افسر اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے، دادا عارف شاہ اور ان کے والد سکندر شاہ خوش دل بھی شاعر تھے۔ لیکن شاکر نے وراثت میں ملی اس روایت کو روایتی نہ رہنے دیا بلکہ انھوں نے شاعری کا ایک نیا اور انوٹھا طرز اختیار کیا جس میں لوک گیتوں کا سا اپنا پن ہے، سادگی ہے، عام الفاظ کا استعمال ہے، قدرتی مناظر ہیں، اور ان قدرتی مناظر کی نادر تصاویر اور تشبیہات ہیں مگر اس جدت میں قاری کے لیے کسی قسم کی دشواری نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بہت بہتر ہیں جنگل بستیوں سے   پرندے کتنے اچھے بولتے ہیں
کہاں اس سے بڑھ کر ہے امن و اماں   خلا میں اڑیں گھونسلوں میں رہیں

کالی داس گپتا رضا ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ آپ کا اپنا لہجہ ہے۔ انفرادیت بہت کم لوگوں میں آتی ہے۔'' اپنی اسی انفرادیت کی وجہ سے سرفراز شاکر، اپنے عہد کے شعرا میں سرفراز نظر آتے ہیں۔ نذیر فتح پوری بھی اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ ''وہ روایتوں سے ہٹ کر اپنا لہجہ بنانے کی کوشش ایک مدت سے کر رہے ہیں۔ اس کوشش میں ان کے شعور نے، ان کے حالات اور ان کے ماحول نے ان کی بھرپور معاونت کی ہے۔''

یوں ہی بہتا ہے پسینا فائدہ کیا   بند کر دو جینا وینا فائدہ کیا
اب کہاں ہے سیدھے سادھوں کا زمانہ   یہ سلیقہ، یہ قرینہ فائدہ کیا

شاکر کی شاعری کی زبان کسی معصوم سے بچے کی زبان سے مشابہ ہے۔ اس میں نہ تصنع ہے نہ بناوٹ اور نہ بھاری بھرکم اور دقیق الفاظ کا استعمال۔ وہ بہت عام سے الفاظ میں، بہت سادگی کے ساتھ اپنی بات بیان کر دیتے ہیں۔ رؤف خیر نے ایک بار کہا تھا ''آپ کے لہجے میں جو معصومیت ہے وہ آپ کو زندہ رکھے گی۔'' اور یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ وہ خود بھی کہتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہو اے کاش شاکر   میں یوں بولوں جوں بچے بولتے ہیں
حال چہرے بیان کر دیں گے   وہ سجاتے ہیں گھر سجانے دو

ان کے اشعار میں طفلی معصومیت اور حیرت کا عنصر قدرے نمایاں ہے۔ یہ اشعار دیکھیے۔

اونچائیوں سے جھانکا تو صورت بدل گئی   پربت بھی پانیوں میں ہے الٹا اسی لیے
مخلوق کیسی بس گئی شاکر زمین پر   لگتا ہے اس کی دنیا کا نقشہ بگڑ گیا

بھیڑ سی ہے تماش بینوں کی   اور اونچائی سے گرے ہیں ہم
ہر گھڑی ڈر لگا ہی رہتا ہے   کیا ابھی تک نئے نئے ہیں ہم
کچھ بھی ہوتا رہے ہمارا کیا   پیڑ کی چھاؤں میں پڑے ہیں ہم
چلا ہوں ساتھ میں دنیا کے برسوں   اب اپنے ساتھ چلنا چاہتا ہوں

شاکر کے اشعار کی زبان عوامی زبان ہے۔ وہ اپنے اشعار میں ایسے الفاظ کا بھی بڑی خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں جنھیں عمومی طور پر شعرا حضرات متروک سمجھتے ہیں۔ عام بول چال کے الفاظ کا اردو شاعری سے رشتہ استوار کرنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس ضمن میں ندا فاضلی کہتے ہیں ''سرفراز شاکر ان نئے تخلیق کاروں کے کارواں میں شریک ہیں، جنھوں نے اردو کے شعری لب و لہجہ کو ایرانی اثرات سے آزاد کرنے کی نہ صرف سعی کی ہے، اس کا رشتہ دوبارہ اس زمین و آسمان سے قائم بھی کیا ہے جو امیر خسرو سے عہد دکن تک تو نظر آتا ہے لیکن بعد میں سعد اللہ گلشن آبادی کی تنبیہ پر غائب ہو جاتا ہے۔'' ان کے اشعار میں آپ کو تاڑنا، بھیڑنا، آلس بمعنی سستی، کباڑ، باڑی اور اگاڑی بمعنی آگے جیسے الفاظ پڑھنے کو ملیں گے جو اس دور میں آپ کو کہیں اور کسی اور شاعر کے کلام میں دستیاب نہیں ہوں گے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام الفاظ اتنی خوب صورتی سے اشعار میں پروئے گئے ہیں کہ پڑھتے اور سنتے ہوئے گراں نہیں گزرتے بلکہ شعر کی روانی اور سلاست کی وجہ سے مزہ دیتے ہیں۔

اس کو کچھ کہنا چاہتا تھا میں   وہ مگر پہلے ہی سے تاڑ گیا
اس کی کتنی نفیس تھیں رسمیں   ہم نے لیکن گنوائیں آلس میں
میں جاؤں تو کدھر جاؤں بتا دے   زمیں سے آسماں بھیڑا ہوا ہے
کئی لعل و گہر بکھرے پڑے ہیں   کباڑ اتنا یہاں پھیلا پڑا ہے
ابر ہے جھیل ہے پہاڑی ہے   خوب صورت جہاں کی باڑی ہے
میں ستاروں کے بیچ رہتا ہوں   بے سکونی میرے اگاڑی ہے

خود کلامی ایک تخلیقی عمل ہے۔ ہر باشعور اور تخلیقی مزاج رکھنے والا شخص خود کلامی کے دشت میں گشت ضرور کرتا ہے۔ جو باتیں دوسروں سے سیدھے طور پر کہنا ممکن نہ ہو وہ خود سے تو کہی جا سکتی ہیں؟ اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اس میں کسی کی دل شکنی یا دل شکستگی کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ شاکر کے کلام میں بھی جا بجا خود کلامی پائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود شناسی اور خود کی تلاش میں سرگرداں بھی نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب ایک بار ہے مرنا تو کیوں نہیں مرتا   یہ کار خیر نہ ہوگا گھڑی گھڑی مجھ سے
کہیں کیوں سر اپنا کھپایا کروں   پرندوں کی صحبت میں جایا کروں

ویسے تو شاکر کی شاعری کا خاصہ اس کی سادگی، انداز بیان کی ندرت اور فطرت کی عکاسی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں شاکر قاری کو چونکا دینے کا کام بھی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے اشعار فطری طور پر ان کی غزلوں کا حصہ

ہوتے ہیں اور وہ اس کے لیے خصوصی سعی نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی شاعری کا مزاج ایسا ہے یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے چونکا دینے والے اشعار مصنوعی محسوس نہیں ہوتے ہیں۔ ہاں قاری اور سامع کو داد دینے پر مجبور ضرور کر دیتے ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیے۔

رات باقی نہ دن ہیں راہوں میں وقت سے آگے بڑھ چکے ہیں ہم
کڑا تھا کتنا سخاوت کا امتحاں شاکر میری ہی زندگی سائل نے مانگ لی مجھ سے
جو بکھرتا ہے وہ سمٹتا ہے پیڑ تو خودکشی نہیں کرتا
سو گئے آسماں زمیں دونوں خواب دیکھیں گے مل کے آپس میں
میرا اپنا کیا ہے مجھ میں اس کا رنگ بچا ہے مجھ میں
لمحہ لمحہ سمیٹ کر شاکر کاغذوں میں چھپا لیا اس نے

ان کے اشعار میں فطرت کے مناظر کی خوب صورت تصاویر نظر آتی ہیں۔ جب آپ ان کے اشعار پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کوئی بہت خوب صورت پینٹنگ دیکھ رہے ہیں یا کوئی بہت خوب صورت سا قدرتی منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اردو نثر میں تو عمدہ منظر نگاری کے بہت نمونے ملتے ہیں لیکن عہد حاضر میں، اردو غزل میں یہ کمال شاکر کے اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ درج ذیل اشعار کو پڑھ کر آپ میری اس بات کی تائید ضرور کریں گے۔

میں پانی ہوں جھلمل کرتا سورج مجھ میں جھانک رہا ہے
گلے مل کے ناچے ہے مٹی سے اکثر ہے بے باک کیسی ہوا سیدھی سادی
نیلے پانی کے چشمے میں میں اک چادر دیکھ رہا تھا
کروٹیں جس پہ لے رہی ہے ہوا جھیل ہے یا کوئی بچھونا ہے

شاکر کی شاعری کا ایک رنگ استفہامیہ بھی ہے۔ اردو ادب میں استفہامیہ انداز کی شاعری کا اہتمام بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ غالب کے بعد اقبال اور پھر شہریار کے یہاں اس کا اہتمام نظر آتا ہے۔ شاعری اگر استفہامیہ رنگ میں ہو تو اس میں طنز اور تعریض کی گنجائشیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے کائنات کو تجسس اور تشکیک کی روشنی میں دیکھا ہے، جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعری پڑھنے یا سننے والے کے ذہنوں میں بھی تجسس اور غور وفکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے سو الگ۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تم اپنے آپ میں خاموش رہ کر اڑاتے ہو دھواں کیا کر رہے ہو؟
ہو گئی آج پھر غزل شاکر گر نہ سمجھا کوئی اشارہ تو
تنہا رہنے کا شوق ہے تم کو کاٹنے آئے گا سناٹا تو
گھاس، شبنم، گلاب اور مہک ایسے دامن کو کون جھاڑ گیا
رکھ دیا طاق میں مجھے شاکر آندھیوں سے لڑا نہیں کیا میں
بارش کا کہنے آئی تھی گل کر گئی چراغ پیغام لائی بھی تو ہوا میرے حق میں کیا
ٹکرا کے لوٹ آئی صدا میری، میرے پاس دامن میں وادیوں کے بچا میرے حق میں کیا
میرے ہی سر پہ گر گیا شاکر میرا مکان کی اس نے بارشوں کی دعا میرے حق میں کیا
تمھارے سامنے کوئی بڑا نہیں ہے کیا جہاں میں صرف تمھیں ہو، خدا نہیں ہے کیا

شاکر کی شعری علامات بھی ان کی زبان کی طرح سادہ ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی اشیا اور مناظر سے ہی علامتیں، تشبیہات اور استعارات برآمد کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ اس ضمن میں شمیم کاف نظام کا یہ قول اہم ہے کہ ''ان کی علامات سامنے کی ہوتی ہوئی بھی ان چیزوں سے برآمد کی گئی ہیں جن کو آج تک درکنار کیا گیا ہے۔''

کبھی تو آؤ کہ صحرا ابھی سے کہتا ہے تمھاری جیبوں میں چاہت کی بالو بھر دوں گا

افتخار امام صدیقی اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ ''الفاظ وتشبیہات واستعارات شعری تراکیب سے خلق کیے گئے ہیں۔ شعری پیکر مانوس ہیں لیکن ان میں شاکر کا شعری وجدان نئی بات اور نئی امیج بھی کاڑھتا ہے۔'' چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بیٹھا بیٹھا گلی میں سناٹا چادر شب کتر رہا ہے کیا
زرد پتوں کو ہوائیں چھو گئیں ٹوٹنا ان کا بھی واجب ہو گیا
اف یہ سرکس سی زندگی شاکر ایک پہیے پہ جیسے گاڑی ہے
عجائب گھر کا حصہ ہو گیا ہوں میں دنیا سے نرالا ہو گیا ہوں
اچانک گل ہوئی بجلی تو شاکر کھلی آنکھوں کا اندھا ہو گیا ہوں
کہیں سر کو رکھ دوں میں دھڑ سے الگ نہیں ! اب نہیں بوجھ ڈھونا مجھے
بدلی ہوئی دنیا ہے، بدلا ہوا گھر لے آ آنگن میں لگانے کو، کاغذ کا شجر لے آ

شاکر نے کبھی خود کو فلسفی، خطیب یا واعظ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ وہ کبھی کسی کو ملامت نہیں کرتے وہ کوئی فلسفہ پیش نہیں کرتے اور نہ ہی وہ کبھی کوئی نصیحت کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو دقیق اور مشکل الفاظ سے آلودہ کیے بغیر سامنے کی موجودات کو علامت بنا کر اپنی بات رکھ دیتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ باوجود اس سب کے ان کے اشعار ایک تاثر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ہی لے لیجیے۔

آسمانوں تلے پڑی ہے تو کیا یہ زمیں بے وقار تھوڑی ہے
دل تو دل ہے کہیں رکھ دے چاہے دنیا چھوٹی ہے کدھر جائے گا
مرے پیچھے وہ کیوں آتے ہیں شاکر پکڑ میں کیسے آؤں گا دھواں ہوں
کبھی سونپ دوں گا سبھی کچھ تجھے وہ سرمایہ جو بھی ترا مجھ میں ہے

شاکر کے کلام کی ایک خاص بات اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا سارا کلام چھوٹی بحروں پر مشتمل ہے۔ یعنی یہاں بھی انہوں نے سہل پسندی سے کام لیا۔ یہ سہل پسندی اور سادگی دراصل ان کے جینیاتی نظام میں ہی رچی بسی ہے۔ بڑی اور مشکل بحریں ان کے کلام کا حصہ نہیں ہیں اور ایک بات جو ان کی شاعری میں نہیں ملتی وہ ہے رومانس۔ محبوب کا سراپا، اس کے رخسار، زلفیں، نگاہیں، محبت، وفا، جفا، دیوانگی، جنون۔ شاکر نے ان کی جانب سے بالکل بے توجہی برتی ہے۔ ایسے اشعار کے نمونے بہت کم ان کے یہاں ملتے ہیں۔ اگر ملتے بھی ہیں تو ان میں بھی ایک سنجیدگی ہے۔ مثال کے طور پر شعر دیکھیں۔

تمھاری دھن میں آنکھیں موند لی ہیں نگاہوں میں اتر جاؤ کسی دن

اپنی اور اپنے کلام کی تعریف کرنا اردو ادب کے شعرا کے یہاں خاصا مقبول شغل رہا ہے۔ شاکر بھی اس سے بچ نہیں پائے ہیں۔ انھوں نے بھی تعلی کے اشعار کہے ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

تو بھی کتنا عظیم ہے شاکر چومتا ہے جبیں فلک تیری
زمیں پڑھتا ہوں لکھتا آسماں ہوں مجھے اب دیکھنا رکتا کہاں ہوں
اب اندھیرا کہاں ہے چاروں طرف میرے لفظوں سے روشنی سی ہے

سرفراز شاکر کے اب تک تین مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'رستہ رستہ ریت' راجستھان اردو اکادمی نے شائع کیا تھا، دوسرا مجموعہ 'بادلوں سے کرن' اور تیسرا حالیہ شائع شدہ مجموعہ 'گونج آہٹ صدا' ہے۔ سرفراز شاکر اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا یہ شعر بہت کچھ کہتا ہے۔

میں واپس آسماں پہ جا کے شاکر نیا بن کر اترنا چاہتا ہوں

■

Akmal Naim Siddiqui
Faize Aam Masjid, G Sector, Partap Nagar
Jodhpur- 342003 (Rajasthan)
Mob.: 9413844624

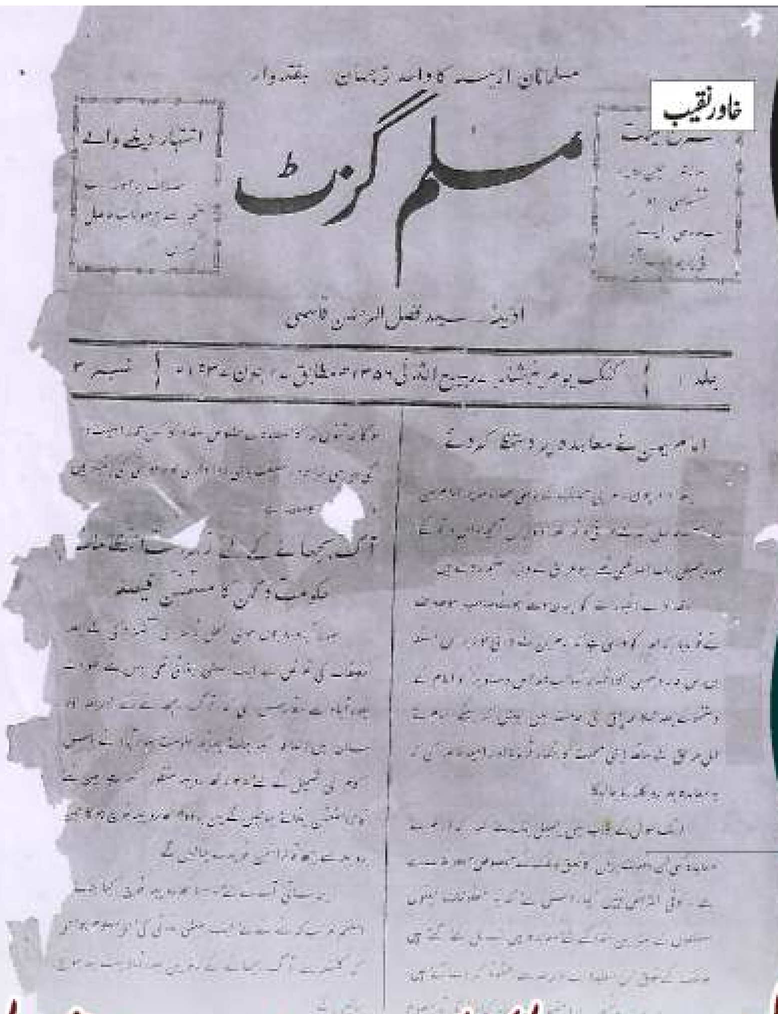

اڈیشا کا پہلا اردو اخبار

ہفتہ وار 'مسلم گزٹ'

خاور نقیب

ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ دو صدی سے زائد عرصے کو محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں اردو صحافت نہ صرف یہ کہ عوامی سطح پر مقبول ہوئی بلکہ 1822 سے 1947 تک تحریکِ آزادی کے ہر موڑ پر اس نے اپنے نقوش بھی ثبت کیے۔ جہاں تک اردو کے اولین اخبار کے اجرا کا تعلق ہے اس میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پروفیسر سید ارتضیٰ کریم تحریر کرتے ہیں:

''محققین کے مطابق اردو صحافت کا آغاز 27 مارچ 1822 کو ہفت روزہ 'جامِ جہاں نما' کلکتہ سے ہوا۔ جس کے مالک ہری دت اور مدیر منشی سدا سکھ رائے تھے۔ اس اخبار کو کمپنی سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ بنیادی طور پر فارسی کا اخبار تھا اور اس میں اردو کی حیثیت ایک ضمیمے کی سی تھی۔ کچھ محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ 1794 میں شائع ہونے والا ٹیپو سلطان کا ہفت روزہ 'فوجی اخبار' اردو کا اولین اخبار ہے اور ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہونے والا مولوی اکرام علی کا اخبار 'اردو اخبار' اردو کا پہلا اخبار ہے جو 1810 میں شائع ہوا''[1]

محققین کے اختلاف رائے سے تحقیق کا کام آگے بڑھتا ہے اور محققین، تحقیق کی دشوار گزار راہوں سے ہو کر بالآخر اس مقام تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جہاں اختلاف رائے کی بڑی حد تک گنجائش نہیں رہتی۔ البتہ بعض تحقیقی امور اختلاف رائے کے سبب مدتوں معلق رہتے ہیں۔ جیسا کہ آج تک یہ طے نہیں کیا جا سکا کہ اردو کا پہلا اخبار کون سا ہے؟ اس سلسلے میں ٹیپو سلطان شہید کے فرمان پر ان کے سرکاری مطبع (میسور) سے شائع ہونے والے 'فوجی اخبار' (1794) پر ہماری نظر مرکوز ہوتی ہے۔ لیکن یہ خالص اردو اخبار نہیں تھا۔ بلکہ اس کے صفحات انگریزی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے لیے بھی مختص تھے اب جبکہ محققین کی ایک بڑی جماعت ہفت روزہ 'جامِ جہاں نما' کو اردو کا پہلا اخبار تسلیم کر چکی ہے۔ لہٰذا تحقیق کی اس حتمیت پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچا جا سکتا۔ البتہ اس ضمن میں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا امداد صابری کی تحقیق کے مطابق 'جامِ جہاں نما' فارسی زبان میں 16/ مئی 1822 کو اور اس کا اردو ضمیمہ 23/ مئی 1823 کو نکلا۔[2] ملحوظ رہے کہ اسی سال مئی 1823 میں منشی رام ٹھاکر کی ادارت میں کلکتہ سے 'شمس الاخبار' کا اجرا بھی ہوا تھا۔ مگر اس کی تاریخ اجرا مکمل نہیں ہے۔ اس اعتبار سے 'جامِ جہاں نما' کے اولین اردو ضمیمے کو اردو صحافت کا نقشِ اول قرار دیا جا سکتا ہے۔ 'جامِ جہاں نما' کا اردو ضمیمہ اوائل جنوری 1828 تک شائع ہوتا رہا۔ بعد ازاں اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، دہلی میں محفوظ 'جامِ جہاں نما' کے ایک شمارے میں اس کے بند ہونے کی توجیہہ یوں پیش کی گئی ہے:

''اس لحاظ سے کہ بہتیرے قدر شناس جنھوں کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہلِ ہند جنھوں کی زبان ہی فارسی ہے وہ فارسی کی تحریر چاہتے ہیں۔ خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتہ سے ہندی فرمان کے عوض اور فرمان فارسی میں لکھا کرے''[3]

ان باتوں سے قطع نظر جہاں تک اخبار نویسی کا تعلق ہے یہ ایسا فن ہے جو معاشرتی سطح پر اپنی چھاپ قائم کرتا ہے اور اخبار چونکہ ایک سماجی آرگن ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی ایک حاوی زبان (Dominant Language) ہوتی ہے جسے ہم صحافت کی زبان کہہ سکتے ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ہر اخبار اپنی طے شدہ پالیسی پر کاربند ہوتا ہے اور یہی پالیسی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے قدر و معیار کا تعین اخبار کے مدیر اور اس سے وابستہ اخبار نویسوں کی ژرف نگاہی، سوجھ بوجھ اور طرزِ تحریر سے ہوتا ہے۔ خصوصاً اخبار کے ایڈیٹر کے لیے ازحد ضروری ہے کہ وہ سماجی شعور کے سیاق و سباق پر گہری نظر رکھتا ہو اور اس کی تحریر اخباری اور ثقافتی زبان (Cultural Language) کا ایسا آمیزہ ہو جو سماجی شعور کو متاثر

کر سکے۔ سلیم شہزاد کی رائے مبنی بر حقیقت ہے کہ ''اخبار نویسی چونکہ ایک بڑا سماجی عمل ہے جو اس کے ماحول اور کیف وکم کے مدِ نظر ہی واقع ہوتا ہے۔''4

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اخبار سماج کا ایک لاینفک جزو ہے۔ جس کے متون میں سماج سے کشید کیا ہوا مواد جسے ہم سماج کا امتزاجی شعور بھی کہہ سکتے ہیں۔ موج تہہ نشیں کی صورت کارفرما ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی عہد کے اخبار کا سماج سے جڑے ہوئے موضوعات کے تناظر میں تاریخ وار مطالعہ کریں اور اس کے جملہ مشمولات پر مبنی ایک تجزیاتی گوشوارہ مرتب کرسکیں، تو یہ گوشوارہ اس عہد کی معاشرت اور روحِ عصر کا نگارخانہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ٹیپو سلطان شہید کے فوجی اخبار (1794) سے لے کر 1857 تک شائع ہونے والے دسیوں اخبارات نے عوامی سطح پر جس نوع کی ذہن سازی کی اور اردو صحافت کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیا اس کی تفصیلات خاصی طول طویل ہیں۔ تاہم ہندوستان کے مختلف مقامات سے شائع ہونے والے کچھ اخبار کے سرسری احوال ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

اردو اخبار (1810) مدیر مولوی اکرام علی، کلکتہ، ہفتہ وار جام جہاں نما (1822) مدیر منشی سدا سکھ، کلکتہ، ہفتہ وار شمس الاخبار (1823) مدیر منشی رام ٹھاکر، کلکتہ، ہفتہ وار دہلی اردو اخبار (1837) مدیر مولوی محمد باقر، دہلی، ہفتہ وار سید الاخبار (1837) مدیر۔ سید محمد خاں۔ دہلی، ہفتہ وار کریم الاخبار (1845) مدیر۔ مولوی کریم الدین، بمبئی، ہفتہ وار قران السعدین (1852) ماسٹر رام چندر، دہلی، ہفتہ وار فوائد الشائقین (1846) پربھودیال، دہلی، ہفتہ وار اسعد الاخبار (1847) مدیر۔ قمر الدین، آگرہ، ہفتہ وار سدھاکر اخبار (1848) مدیر۔ تارا موہن متر، بنارس، ہفتہ وار گوالیار اخبار (1848) مدیر۔ لکشمی پرشاد، گوالیار، ہفتہ وار بنارس اخبار (1848) مدیر گھوش رگھوناتھ۔ بنارس، ہفتہ وار عمدۃ الاخبار (1849) مدیر۔ پچھمن پرشاد۔ بریلی، الحقائق (1849) مدیر، موتی لال۔ آگرہ، ہفتہ وار کوہِ نور (1850) مدیر ہرسکھ رائے۔ لاہور، خورشید عالم (1850) مدیر۔ منشی دیوان چند۔ سیالکوٹ، ہفتہ وار نور علیٰ نور (1851) مدیر۔ مولانا محمد حسین۔ لدھیانہ، ہفتہ وار باغ و بہار (1851) مہاراجہ بنارس، ہفتہ وار مفتاح الاخبار (1852) مدیر۔ مولوی محبوب علی۔ میرٹھ، ہفتہ وار آفتاب ہند (1853) مدیر بابو گووند رگھوناتھ۔ بنارس، ہفتہ وار صادق الاخبار (1853) مدیر مصطفیٰ خاں۔ دہلی، ہفتہ وار وکٹوریہ پیپر (1853) مدیر۔ دیوان چند، سیالکوٹ، ہفتہ وار صادق الاخبار (1854) مدیر سید جمیل الدین خاں ہجر، ہفتہ وار کشف الاخبار (1854) مدیر۔ منشی امان علی۔ بمبئی، مظہر الاخبار (1856) مدیر۔ محمد خواجہ بادشاہ مدراس، ہفتہ وار سحر سامری (1856) مدیر۔ منشی نرائن عیاش لکھنؤ، ہفتہ وار مفید خلائق (1856) مدیر۔ شیو نرائن۔ آگرہ، ہفتہ وار خلاصۃ الاخبار (1857) مدیر۔ متھراداس۔ دہلی، طلسمِ حیرت (1857) مدراس، پیامِ آزادی (1857) یہ اخبار بہادر شاہ ظفر کے نواسے مرزا بیدار بخت کے حکم پر شائع ہوا تھا۔

جہاں تک ہفتہ وار دہلی اردو اخبار کا تعلق ہے اس کا اجرا 1837 میں ہوا لیکن غدر کے بعد اس کا تیور حد درجہ باغیانہ ہوگیا۔ جس کی پاداش میں مولوی محمد باقر شہید کردیے گئے۔ وہ اردو کے پہلے شہید صحافی ہیں جن پر ایک انگریز کو تحفظ فراہم نہ کرنے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ اسی ہیجان انگیز دور میں اودھ اخبار (1858) مدیر۔ منشی نول کشور، لکھنؤ، اردو کا پہلا روزنامہ اردو گائیڈ (1858) مدیر مولوی کبیر الدین احمد خاں، اودھ پنچ (1877) مدیر۔ منشی سجاد حسین، لکھنؤ۔ اکمل الاخبار (1886) حکیم محمود احمد خاں۔ پیسہ اخبار (1887) منشی محبوب عالم، لاہور وغیرہ متعدد اخبار نے جہاں اردو صحافت کو زبانِ خلق کا ترجمان بنایا وہیں یہ اخبار جبر واستبداد کے خلاف سینہ سپر بھی رہے۔

اب آیئے اردو صحافت کے زرّیں دور پر اک نظر ڈالیں۔ محققین نے 1901 سے 1947 تک کے دور کو اردو صحافت کا زرّیں دور کہا ہے۔ اس دور کے کم وبیش ہر اخبار نے تحریکِ آزادی کی کھل کر حمایت کی اور حصولِ آزادی کے لیے قوم کو ایک سلکِ اخوت میں پروئے رکھا۔ اس دور کے اردو اخبار مثلاً زمیں دار (1903) مولانا ظفر علی خاں، لاہور۔ اردوئے معلّیٰ (1903) مولانا حسرت موہانی، علی گڑھ۔ الہلال (1912) مولانا ابوالکلام آزاد، کلکتہ۔ ہفتہ وار مدینہ (1912) مولوی مجید حسن، بجنور۔ ہمدرد (1913) مولانا محمد علی جوہر۔ البلاغ (1915) مولانا ابوالکلام آزاد۔ پرتاپ (1919) لاہور۔ ریاست (1924) سردیوان سنگھ مفتوں۔ دہلی۔ سچ (1925) مولانا عبد الماجد دریابادی۔ انقلاب (1938) بانی مدیر مولوی عبد الحمید انصاری، بمبئی وغیرہ نہ صرف یہ کہ آتش زیرپا رہے بلکہ اردو صحافت کے خال وخط کو مزید آراستہ و پیراستہ بھی کیا۔

اردو صحافت کے اسی زرّیں دور میں قصبہ سونگڑہ کے ایک جید عالم مولانا سید فضل الرحمٰن قاسمی نے جون 1937 میں ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' کا اجرا کیا۔ شہر کٹک سے نکلنے والا اردو کا یہ پہلا اخبار تھا جس نے صوبۂ اڈیشا میں اخباری صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ 8/صفحات پر مشتمل اس اخبار کا سائز 22×12mm تھا جو لکشمی نارائن پریس (کٹک) میں طبع ہوا کرتا تھا۔ اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' کے اجرا سے تقریباً سات سال قبل سید فضل الرحمٰن قاسمی کے برادرِ خرد مولانا سید محمد عمر کا ماہنامہ رسالہ 'المنصور' منصۂ شہود پر آچکا تھا۔ صوبۂ اڈیشا کی مردم خیز سرزمین سونگڑہ سے شائع ہونے والا اردو کا یہ پہلا رسالہ تھا۔ جس نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اڈیشا میں اردو صحافت کی شمع روشن کی۔ 'المنصور' کے متعلق ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری رقم طراز ہیں:

''ماہنامہ 'المنصور' کا اجرا اڑیسہ میں اردو صحافت کا پہلا قدم تھا۔ مولوی محمد عمر کی تعلیم اتر پردیش کے اسلامی مدارس میں ہوئی۔ ان کے اندر زبان وادب کے ارتقا کا جذبہ موجزن تھا کہ گوناگوں مسائل کے باوجود انھوں نے سرزمینِ اڑیسہ سے 'المنصور' جیسے ایک اردو ماہنامہ کا اجرا کیا''5

مدعائے تحریر اصل میں یہ ہے کہ 1901 سے 1947 تک ملک کے مختلف مقامات سے اردو کے جتنے اخبار شائع ہوئے ان میں ایک ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' بھی تھا۔ جس نے اردو صحافت کے اس ہنگامی دور میں نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ اڈیشا کے دلوں میں حریت کے جذبات کو بیدار رکھا بلکہ ان کی سیاسی واخلاقی رہنمائی بھی کی۔

اس وقت میرے پیش نظر ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' کے 13/شمارے ہیں۔ جو بے حد خستہ حال اور کرم خوردہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر شماروں کے شروع اور آخر کے صفحات امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہوچکے ہیں۔ 22/ربیع الاول 1356ھ مطابق 3/جون 1937 سے 20/جمادی الثانی 1356ھ مطابق 27/اگست 1937 تک کل 13/شماروں کے 72 صفحات اپنے دور کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ 'مسلم گزٹ' کے مدوّن شماروں کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اخبار عوام کے مافی الضمیر کا اظہاریہ تھا جس کے موضوعات متنوع اور وقیع ہوتے تھے۔ اس میں ملکی وغیر ملکی خبروں کے علاوہ 1937 میں کانگریس پارٹی کی سرگرمیاں، تحریک آزادی کو جلا بخشنے والی تحریریں، جمعیۃ علماء ہند کی کارگزاریاں خصوصاً اڈیشا میں اس کی صوبائی شاخ کے قیام کے سلسلے میں اپیلیں، کھیل کود سے متعلق خبریں اور ادارتی گزارشات وغیرہ رشحاتِ قلم باہتمام شائع ہوتے تھے۔ 'مسلم گزٹ' کے دستیاب شماروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اس کے مشتملات ہمیں اخبار کی پالیسی اور ترجیحات کی خبر دیتے

> ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' بلا شبہ ایک جہت ساز اخبار تھا۔ جس نے اڈیشا کے مسلمانوں کو عصری تقاضوں سے باخبر رکھنے کی سعی بلیغ کی اور انھیں میدانِ کارزار میں ڈٹے رہنے کا حوصلہ بھی عطا کیا۔ لیکن افسوس کہ یہ اخبار زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ حالانکہ اس کے فاضل مدیر اور بھی خواہوں نے اس کی خیرو بقا اور استقامت کے لیے بارہا اپیلیں شائع کیں اور قلم سے تیر و نشتر کا بھی کام لیا۔ لیکن ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔

ہیں۔ لہٰذا مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ اخبار جمعیۃ علما ہند کا ترجمان اور تحریکِ آزادی کا علم بردار تھا۔

مدبرینِ امت، مجاہدین ملت کا فیصلہ ہے کہ آپ پر دو فرض عائد ہوتے ہیں۔ نظامِ ملت درست کرنے کے لیے آپ جمعیۃ علما ہند کے ساتھ منسلک ہوں۔''[6]

اخبار کے فاضل مدیر سید فضل الرحمٰن قاسمی کی دیرینہ خواہش تھی کہ 'مسلم گزٹ' ملکی سطح پر قوم وملت کا ترجمان بنے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اڈیشا کے مسلمانوں کی زبوں حالی دور ہو۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اخبار کے توسط سے مسلمانوں کو تعلیمی اور معاشی بحران سے نکلنے اور اپنے سماجی حالات کو بہتر بنانے کے بارہا تلقین کی۔ حق بات تو یہ ہے کہ صحافت اپنے اندر معاشرتی حالات اور عوام الناس کی سوچ کو بدلنے کی بڑی قوت رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صحافت صادق القول اور جری ہو۔ Tom stoppard نے ایک جگہ لکھا ہے:

"I still belive that if your aim is to change the world, Journalism is a more immediate short-term weapon" [7]

یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی بھی زبان کی معیاری صحافت کلیشے (Cliche) کی زبان استعمال نہیں کرتی۔ بلکہ وہ ایسی Demotic Language کو بروئے کار لاتی ہے جو چٹ پٹی، موثر اور اپیلنگ ہونے کے ساتھ ہی عوام وخواص کے مذاق سے ہم آہنگ ہوتی ہے، 'مسلم گزٹ' کے مندرجات بالخصوص اس کے اداریے اور مضامین میں بڑی حد تک سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ البتہ کہیں کہیں مقامی زبان کی آمیزش بھی نظر آتی ہے اور املے کا فرق بھی نمایاں ہے۔ ذیل میں ایک اداریے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''افراد کی صورتیں جو کہ تمہارے سامنے نظر آتی ہیں انھیں کے مجموعہ کا نام قوم ہے۔ لہٰذا میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ اگر تمہیں میں کا ایک شخص خریدار بن گیا تو ساری قوم بن گئی۔ جب ساری قوم خریدار بن گئی تو اخبار چل نہیں سکتا؟... آپ کو معلوم ہے جب ابتدا ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی تمام قوتیں کمزور ہوتی ہیں۔ نہ وہ بول سکتا ہے، نہ وہ سمجھ سکتا ہے، نہ وہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ غرض کہ سب کچھ کمزور ہوتے ہیں۔ مگر جب دنیا میں چند دن گزار لیتا ہے۔ اس کی قوت میں اضافہ بھی ہوتا ہے یہی حال ابھی اس اخبار کا ہے''[8]

ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' بلا شبہ ایک جہت ساز اخبار تھا۔ جس نے اڈیشا کے مسلمانوں کو عصری تقاضوں سے باخبر رکھنے کی سعی بلیغ کی اور انھیں میدانِ کارزار میں ڈٹے رہنے کا حوصلہ بھی عطا کیا۔ لیکن افسوس کہ یہ اخبار زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ حالانکہ اس کے فاضل مدیر اور بہی خواہوں نے اس کی خیرو بقا اور استقامت کے لیے بارہا اپیلیں شائع کیں اور قلم سے تیر ونشتر کا بھی کام لیا۔ لیکن ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ 'مسلم گزٹ' کی بحرانی صورتِ حال کے پیشِ نظر مولانا فضل الرحمٰن قاسمی اور ان کے خیر خواہوں کی دلی کیفیات کا اندازہ ان کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ اقتباسات حسب ذیل ہیں:

''اپنے عمل کا حساب کرنے والا صرف اخبار ہی ہے۔ پس اگر زندہ رہنے کا ارادہ ہے تو اسے زندہ رکھیے اور اپنی زبان اور کلچر کو برباد ہونے سے بچائیے۔ ورنہ آپ کھچڑی ہو جائیں گے اور آپ کی ہستی خلط ملط ہو کے رہ جائے گی۔[9]

ہفتہ وار 'مدینہ' (بجنور) کے مدیر نے 'مسلم گزٹ' کی حالت زار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ واقعی پر تاسف ہے۔ مراسلے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اگرچہ اس اخبار کی ظاہری حالت سے اس کی مفلسی، بے مائگی اور فاقہ زدگی کا پورا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں توقع ہے اڑیسہ کے ذی ثروت مسلمان بالخصوص اور عام حلقہ بگوشانِ اسلام بالعموم اپنے قومی فریضہ کی بجا آوری میں زیادہ سستی وکاہلی کو دخل نہ دیں گے اور اپنے امداد وتعاون کے ذریعہ صوبہ کے اس قومی آرگن کو حیاتِ جاوید بخشنے کی پوری پوری کوشش فرمائیں گے''[10]

غرض کہ ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ اس کے شکستہ اور کرم خوردہ شمارے جو اس وقت زیر تدوین ہیں وہ ادبی نقطۂ نظر سے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ اخبار صحیح معنوں میں ایک قومی آرگن تھا۔ جس نے معاشرتی اخلاق کی بھی تعلیم دی۔ اس کے فاضل مدیر نے ہر ممکن کوشش کی کہ اخبار پابندی سے نکلتا رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے اخبار میں قارئین سے راست گفتگو کی طرح بھی ڈالی مگر ذیل کا اقتباس کچھ اور ہی احوال بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''افسوس جن لوگوں کے پاس پچھلے مہینہ کا روپیہ باقی ہے نہ انھوں نے دیا، نہ ان لوگوں نے جو شروع سے پرچہ لیتے ہیں اور اب تک ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ بعض حضرات نے پہلی تاریخ کا وعدہ فرما کر اسے فراموش کر دیا۔ ایسی حالت میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کم از کم بطور امداد کچھ چندہ ہی ارسال فرمائیے تا کہ ہم پریس کے قرضہ سے سبکدوش ہو جائیں''[11]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگست 1937 میں یہ اخبار زوال کی کگار پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت کب بند ہوئی یہ امر ہنوز تشنۂ تحقیق ہے۔

حواشی

1. اردو صحافت کے دو سو سال (حصۂ اول) مرتب، سید ارتضیٰ کریم ص۔ 5 پہلی اشاعت 2017۔ ناشر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی)
2. تاریخ صحافت اردو (جلد اول) امداد صابری، ص 52۔ 1953
3. ماخذ، تاریخ صحافت اردو (جلد اول) امداد صابری ص 55-54- 1953
4. فرہنگِ ادبیات۔ سلیم شہزاد۔ ص 529۔ پہلی اشاعت، 2018۔ ناشر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
5. اڑیسہ میں اردو۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری۔ ص 268۔ سالِ اشاعت۔ 2001، ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی)
6. ہفتہ وار مسلم گزٹ، مدیر۔ مولانا سید فضل الرحمٰن قاسمی۔ شمارہ، 27/ اگست 1937۔ ص 6
7. Source: https://www.brainyquote.com
8. ہفتہ وار مسلم گزٹ، شمارہ، 10/ جون 1937 ص: 2
9. ہفتہ وار مسلم گزٹ۔ شمارہ، 24 جون 1937۔ ص: 5
10. ہفتہ وار مسلم گزٹ، شمارہ، 22/ ربیع الثانی 1356ھ ص: 8
11. ہفتہ وار مسلم گزٹ۔ شمارہ، 13/ اگست 1937۔ ص: 7

■

Khawar Naquib
Editor"Tarweej"
Daryapur, P.O. Kood(Sungra)
Dist. Cuttack- 754221 (Odisha)
Mob: 7605902971
E-mail: khawarnaqeeb@gmail.com

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کیا ہے ، اس کی مثال ہندوستان میں تو کیا ، بلکہ دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکوں میں بھی ملنا محال ہے۔ اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما کلکتہ سے 26مارچ 1822 کو شائع ہوا۔ اس اخبار کی خوش نصیبی یہ رہی کہ اس کو ابتدا سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور سر پرستی حاصل رہی ، مگر حکومت پنجاب کے سر براہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں متنازعہ مضمون شائع کرنے پر اسے اس سر پرستی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

جہانگیر احمد خان

تحریک آزادیٔ ہند اور اردو اخبارات

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کی مثال ہندوستان میں تو کیا، بلکہ دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکوں میں بھی ملنا محال ہے۔ اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما کلکتہ سے 26مارچ 1822 کو شائع ہوا۔ اس اخبار کی خوش نصیبی یہ رہی کہ اس کو ابتدا سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور سرپرستی حاصل رہی، مگر حکومت پنجاب کے سربراہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں متنازعہ مضمون شائع کرنے پر اسے اس سرپرستی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسی طرح راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان میں 12اپریل 1822 کو فارسی زبان کا پہلا اخبار جاری کیا، مگر اس کی اشاعت کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ گورنر جنرل جان ایڈم نے ہندوستان میں 14 مارچ 1822 کو اس اخبار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پریس آرڈیننس جاری کر دیا۔ راجہ رام موہن رائے نے اس کی زبردست مخالفت بھی کی۔ مگر نتیجہ کچھ حاصل نہیں ہوا اور آخر کار اس اخبار کو بند ہونا پڑا۔ رجب علی حسینی لکھنوی نے 2اگست 1832 کو فارسی اخبار 'سلطان الاخبار' شائع کیا۔ اس وقت ملک میں اس کی دھوم مچ گئی۔ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرنا آسان کام نہیں تھا۔ رجب علی کے اس اخبار کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے کھل کر بغاوت کر رہے ہیں اور ان کی چیرہ دستیوں کو اس اخبار کے ذریعے سامنے لا رہے ہیں۔ یہ وہ اخبار تھا جس نے 1857 کی جنگ آزادی میں حریت پسندی اور سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ مگر اس اخبار کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا جو دوسرے اخبارات کے ساتھ ہوا تھا اور 1857 کی بغاوت کے سلسلے میں اس پر مقدمہ چلا دیا گیا۔ رجب علی حسینی لکھنوی نے اس کی مخالفت بھی کی۔ اس مخالفت کا اندازہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

'سلطان الاخبار' اس دور کی صحافت میں ایک منفرد حیثیت کا مالک تھا۔ حالات پر تبصرہ بھی کیا۔ حکومت وقت کے ہتھکنڈوں پر نکتہ چینی بھی کی، برے سے برے حالات میں بھی جرأت مندانہ انداز سے کام لیا۔ سلطان الاخبار وہ پہلا اخبار تھا جس نے نوابی حکومت کا تقابل برطانوی علاقہ کے نظم ونسق سے کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ مملکت انگریزی میں لوگ زیادہ پریشان حال ہیں۔'

دراصل سلطان الاخبار محض ایک اخبار نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے محبان وطن کے دل و دماغ میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کی سچائی وحق گوئی کے سبب ہی 1857 کی پہلی جنگ آزادی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔

اسی طرح 'دہلی اردو اخبار' مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 28فروری 1837 کو دہلی سے جاری کیا۔ اس کے صفحہ اول کے ایک کالم میں 'حضور والا' کے عنوان سے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں روز نامچہ چھپتا تھا۔ جبکہ دوسرے کالم میں 'صاحب کلاں' کے عنوان سے 'ایسٹ انڈیا کمپنی' سے متعلق خبریں اور اطلاعات شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار برطانوی حکمرانوں کے عزائم کو بے نقاب کرتا اور کھل کر تحریک آزادی کی حمایت کرتا تھا۔ اس سلسلے میں 'دہلی اردو اخبار' میں رڑکی میں باغی سپاہیوں کے ہاتھوں انگریزوں کی ہلاکت کی خبر بھی شائع ہوئی۔

اس کے بعد اس اخبار میں اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں ہونے والی بربریت اور حملوں کی خبریں شائع ہوئیں اور اس اخبار کے ذریعے ملک میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ مگر بدنصیبی نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا اور اس کا اثر مولوی محمد باقر پر بھی پڑ گیا اور 16 ستمبر 1857 کو

انقلاب کی ناکامیوں کے بعد ان کی اشتعال انگیز صحافتی سرگرمیوں کے سبب محض اس الزام میں جام شہادت پینا پڑا کہ انھوں نے دہلی کالج کے انگریز پرنسپل بٹلر کو اپنے گھر یا امام باڑے میں انقلاب کے وقت پناہ دی۔ سر عبدالقادر نے مولوی باقر کی شہادت کے واقعہ پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے:

'' بٹلر نے مولانا کے مکان سے نکلنے سے پہلے انھیں کاغذات کا ایک بنڈل دے کر کہا کہ اگر دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو جائے تو جو انگریز پہلے ملے یہ بنڈل اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جب مولانا باقر نے یہ بنڈل انگریز کرنل کے سپرد کیا تو کرنل نے بنڈل پر لاطینی زبان میں بٹلر کی لکھی ہوئی سطور دیکھیں۔ مولوی محمد باقر نے پہلے پہل مجھے اپنے مکان میں پناہ دی لیکن پھر حوصلہ ہار گئے اور میری زندگی بچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس پر کرنل نے فوراً مولانا کو گولی سے اڑا دیا۔''

اس کے بعد دہلی سے 1841 میں ہفتہ وار فارسی اخبار 'سراج الاخبار' جاری ہوا جو بہادر شاہ ظفر کے محل سے شائع ہوتا تھا۔ اسے روز نامچہ یا سرکاری گزٹ کے نام سے موسوم کیا جا تا تھا۔ یہ اخبار 1857 کی جنگ آزادی کے دوران برابر شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار سے اس وقت ہونے والے ظلم کی پوری کہانی ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ 9,10 مئی 1857 میں میرٹھ (اترپردیش) میں تعینات کمپنی کے دیسی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا اور پھر رات بھر پیدل چلتے ہوئے میرٹھ سے دہلی جا پہنچے اور بہادر شاہ ظفر کی ملاقات کی غرض سے جمنا کے کنارے لال قلعہ کی مشرقی دیوار کے نیچے ڈیرا ڈال دیا۔

اس سلسلے میں 'سراج الاخبار' نے بڑی گہری روشنی ڈالتے ہوئے برطانوی سلطنت کے منہ پر زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ اس کی چند سطروں کا ترجمہ ذیل میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں:

'' آٹھ بجے کے بعد خبر ملی کی ضلع میرٹھ کے انگریزی فوج کے سوار اور پیادوں نے وہاں کے حکام وقت سے سرتابی کی ہے اور اپنے افسروں کو قتل کرنے کے بعد جوق در جوق جھروکہ کے نیچے حاضر ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اور جھروکوں کے نیچے در کھولنے کے لیے آوازیں لگا رہے ہیں۔''

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب انگریز پرست ہندوستانیوں کے دل میں بھی ملک کی آزادی کی تڑپ و چاہ موجود تھی۔ دہلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر کو ہی لے لیجیے۔ انگریز پرستی کا جذبہ ان کے دل و دماغ پر اس قدر حاوی رہا کہ انھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا لیکن 1845 میں جب اپنا پندرہ روزہ اخبار 'فوائد الناظرین' جاری کیا تو ان کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ موجزن ہوا جو 'فوائد الناظرین' اخبار کے اداریے سے ظاہر ہوتا ہے:

'' کم ہمتی جو اہل ہند کا خاصہ ہے اور اس کے باعث وہ ہمیشہ غلامی میں رہتے ہیں اور دیکھیں کب تک رہیں گے، ان کو آزاد گورنمنٹ کا تصور ہی نہیں۔ اس لیے (اہل وطن کے لیے) آزاد قوموں کا مطالعہ سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ان کی عالی ہمت اور حب الوطنی کو دیکھ کر اپنے اندر بھی عزم لاحق ہوگا کہ داغ غلامی سے بری ہوں۔ دیکھیے ہندوستان کے دن کب پھرتے ہیں۔''

اس کے بعد دہلی سے 'صادق الاخبار' نام سے پانچ اخبار شائع ہوئے۔ جن میں جمیل الدین خاں کے اخبار کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ جبکہ مدراس سے 'جامع الاخبار' اور 'امیر الاخبار'، لاہور سے 'دریائے نور الٰہی' اپنی انقلابی تحریروں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ یہ سب 1857 سے قبل کے اخبار تھے۔

صادق الاخبار 1854 میں جاری ہوا جس کے شمارے آج بھی نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہیں۔ جس نے اپنی شعلہ بیانی سے تحریک آزادی کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور اپنی تحریروں کے ذریعے تحریک آزادی کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ بلکہ سپاہیوں اور مجاہدین آزادی کے جوش جہاد میں غیر معمولی شدت پیدا کی۔

اس زمانے میں نواب واجد علی شاہ کے سچے پرستاروں ورہنماؤں میں فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی محمد یعقوب انصاری کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ 1856 میں انھوں نے مغرب کے خلاف پوری شدت سے صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے لکھنؤ سے اخبار 'طلسم لکھنؤ' جاری کیا۔ اس اخبار میں انگریزی حکام کے خلاف خیالات رقم کیے۔ ہندوستان میں جب انقلاب برپا ہوا تو طلسم لکھنؤ کے مدیر نے مجاہدین آزادی کے خلاف ان کے جوش و جذبے کو اشاعت میں اولین ترجیح دی۔ اس طرح انگریزوں کے خلاف ان کے جوش و جذبے کو بڑھاوا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے خیالات اس طرح واضح کیے ہیں:

''اس ہفتہ وار اخبار 'طلسم لکھنؤ' میں لکھنؤ ہندوستان وغیرہ ممالک کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے، وہاں کی خبریں چشم دید کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس اخبار میں اودھ کے خاص و عام اور لکھنؤ کی زبان پر خصوصاً واجد علی شاہ کی معزولی کے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے، بآسانی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔''

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 1857 سے قبل ہی انگریزوں کے خلاف فارسی اردو کے قلمی اخبارات سے لے کر مطبوعہ اخبارات تک نے بلاتفریق مذہب و مسلک پوری طاقت سے متحد ہو کر اپنی زبردست تحریک چلائی جس نے محبان وطن کے اندر ولولہ آزادی کا ایک الگ اور کبھی نہ ختم ہونے والا جذبہ پیدا کیا بھی۔ پنجاب و ہریانہ سے شائع ہونے والے اخباروں نے اس آزادی کی تحریک کی آگ کو بھڑکانے میں مدد کی اور وہ انگریزوں کے ظلم سہتے ہوئے بھی اپنے مقصد پر اڑے رہے۔ لاہور سے ہندو مسلمانوں کے بہت سے اخبارات شائع ہوتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سبھی اخباروں کے کسی نہ کسی سوال پر انگریزی حکومت فکرمند ہو جاتی تھی اور نتیجتاً ان کے مالکوں یا ایڈیٹروں کو جرمانے کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔

لاہور کے مشہور اردو اخبار 'زمیندار' کے مالک ظفر علی خاں کی شعلہ بیانی مشہور تھی۔ مولانا ایک جادو بیان مقرر اور بڑے شاعر بھی تھے۔ لہٰذا باغیانہ تقریروں اور تحریروں کے باعث ان کو جیل کی سزا بھی کاٹنی پڑی۔

مولانا انگریزی حکومت کے خلاف بڑی دلیری اور جرات مندی سے قلم رواں رکھتے تھے۔ اس کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے بار بار اخبار بند کیا جاتا اور ضمانتیں طلب کی جاتیں۔ تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے 'زمیندار' اخبار کے عملۂ ادارت سے ایک درجن کے قریب لوگ گرفتار ہوئے مگر انھوں نے اخبار کو دم توڑ نے نہیں دیا۔ وہ اپنے اخبار میں فرنگیوں اور ان کی وضع

بٹلر نے مولانا کے مکان سے نکلنے سے پہلے انھیں کاغذات کا ایک بنڈل دے کر کہا کہ اگر دھلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو جائے تو جو انگریز پہلے ملے یہ بنڈل اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جب مولانا باقر نے یہ بنڈل انگریز کرنل کے سپرد کیا تو کرنل نے بنڈل پر لاطینی زبان میں بٹلر کی لکھی ہوئی سطور دیکھیں۔ مولوی محمد باقر نے پہلے پہل مجھے اپنے مکان میں پناہ دی لیکن پھر حوصلہ ہار گئے اور میری زندگی بچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس پر کرنل نے فوراً مولا نا کو گولی سے اڑا دیا

کردہ پالیسیوں کی خوب خبر لیتے رہے۔ سائمن کمیشن کی آمد پر انہوں نے انگریز نوازوں کے خلاف لکھا:

"کمیشن کی حمایت کرنے والے یہ تو فرمائیں کہ آخر خوشامد کا وہ انہیں کیا صلہ دے گا۔ کون سی نئی عزت ملے گی؟ وہ کس سرخاب کے پر ان کی ٹوپیوں میں سجا دے گا ؟ مگر چھچھوڑتی ہڈیاں ہیں خوان مغرب کی جنہیں وہ پھینک کر مشرق کے کتوں کو لڑوا دے گا۔"

رولٹ ایکٹ کے خلاف جد و جہد میں اور جلیاں والے باغ میں قتل عام کے دنوں میں مولانا کی تحریروں نے انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ لگا دی۔ مولانا نے پریس ایکٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اس ایکٹ کی منسوخی کے لیے انگلستان تک گئے۔ جب لالہ لاجپت رائے پر لاٹھی چارج کیا گیا تو مولانا ظفر علی خان نے ایک نظم شائع کی۔ سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو جب پھانسی دی گئی اور لاشیں دریائے ستلج کے کنارے جلا دی گئیں تو اس کے خلاف مولانا ظفر علی خاں نے مضامین لکھے اور تقریریں کیں۔ زمیندار اخبار کی اشاعت تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی، جو اس وقت تک کے کسی اخبار کی سب سے زیادہ اشاعت تھی۔

اس زمانے میں مکمل آزادی کا نعرہ بلند کرنے والے مولانا حسرت موہانی نے بھی میدان صحافت میں قدم رکھا اور اپنا مجلّہ 'اردوئے معلّیٰ' 1930 میں علی گڑھ سے جاری کیا اور اپنے پہلے ہی شمارے میں کامل آزادی کا مجاہدانہ نعرہ لگایا۔ ساری زندگی انگریزوں کے خلاف جہاد بھی کیا اور جہاد بھی ایسے دور میں جب انگریزی حکومت آزادی کا لفظ سننے کو تیار نہیں تھی۔ حسرت جنگ آزادی کے ایک نمایاں سپاہی تھے، انھوں نے رسالہ کے ذریعے سودیشی تحریک کو طاقت پہنچائی اور ولایتی چیزیں ترک کرنے کی ترغیب دی۔ یہ اخبار بھی سودیشی تحریک کو تیز کرنے اور برطانوی چیزوں کا بائیکاٹ کرنے کے الزام میں تین ہزار روپے ضمانت نہ دے پانے کی پاداش میں بند کر دیا گیا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جو دو اخبارات بہت اہم نظر آتے ہیں، وہ 'الہلال' اور 'ہمدرد' ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے 1912 میں دہلی سے 'ہمدرد' اخبار نکالا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے 1912 میں کلکتہ سے 'الہلال' اخبار نکالا۔ مولانا محمد علی برطانوی نظام کی مخالفت ساری زندگی کرتے رہے اور اس کے لیے ان کا اخبار اور چھاپہ خانہ ضبط کر لیا گیا اور انھیں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ مگر وہ حصول آزادی کے راستے سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور نہ ہی انگریزوں سے خوف زدہ ہوئے۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی جوہر نے تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کے لیے پورے ملک کے دورے کیے۔ مولانا محمد علی جوہر نے فرنگی نظام کی مخالفت اور آزادی کی حمایت کرتے ہوئے امرتسر کے کانگریس کے اجلاس میں کہا تھا کہ:

"اس آزادی کے لیے مسٹر تلک کو پھر سے جیل چلے جانا چاہیے۔ مجھے دوبارہ عمر بھر کے لیے نظر بند ہو جانا چاہیے۔ مسز اینی بیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے مگر اس قسم کے نظام کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جانا چاہیے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے پہلے شمارے میں کہا:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں، صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں، عشق کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے سیم وزر کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان ہونے کے لیے آئے ہیں۔"

کلکتہ سے نکلنے والے ان دو اخبارات کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک روز نامہ 'زمانہ' ہے جو مولانا اکرام خاں کی ادارت میں شہر کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔ دوسرا روز نامہ 'احرار' ہے۔ یہ اخبار کلکتہ سے خواجہ محمد اسد اللہ اسد نے جاری کیا تھا۔ یہ دونوں اخبار حکومت وقت کی تمام پالیسیوں کے زبردست ناقد تھے۔ مولانا اکرام خاں نے 28 جولائی 1920 کو بانگ درا کے عنوان سے ایک طویل اداریہ قلم بند کیا جس کا ایک ایک لفظ جوش اور حوصلہ عطا کرتا ہے:

"اٹھو، لیکن مایوس ہو کر نہیں، اٹھو! لیکن اداس اور مغموم بن کر نہیں۔ دل میں ولولے اور تازہ امیدیں لے کر اٹھو لیکن سر جھکانے کے لیے نہیں سر بلندی کے لیے اٹھو۔ اب زبان سے منت نہ کرو، مطالبہ کرو، اب آنکھوں سے آنسو نہ بہاؤ، بجلیاں گراؤ، اب ہاتھ جوڑ کر نہ کھڑے ہو، ہاتھوں سے کام لو، اب پاؤں کو توڑ کر نہ بیٹھو، منزل مقصود طے کرو۔"

اسی طرح روز نامہ 'احرار' کے ایڈیٹر خواجہ محمد اسد اللہ اسد نے 24 نومبر 1921 کے شمارے میں جدید تلاشیاں اور گرفتاریاں، گورنر بنگال کا اعلان جنگ اور پبلک کا فیصلہ کے عنوان سے اداریہ لکھا، جس کا ایک ایک لفظ طنز سے بھر پور ہے:

"گورنر بنگال نے اپنی پر جوش تقریر میں اس کا اعلان کیا کہ گورنمنٹ کے صبر وتحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ امن و امان کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ سختی سے نپٹا جائے۔ گورنمنٹ اپنی پوری طاقت صرف کر دے اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پبلک پولیس کا ہاتھ بٹائے۔

ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں، صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں، عشق کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں، دنیا کے سیم و زر کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان ہونے کے لیے آئے ہیں۔

ایک طرف گورنر بنگال ہیں جو جدید سامان جنگ سے لیس ہیں، توپ، بندوق، ہوائی جہاز، جنگی جہاز گولا بارود، مضبوط قلعہ، خوشنما محل غرض یہ کہ سبھی کچھ ہے اور پبلک سے کہتے ہیں کہ آؤ تم صفیں باندھ کر ہماری طرف کھڑے ہو جاؤ اور ہماری مدد کرو کس چیز میں؟ آزاد قوموں کو غلام بنانے میں۔ بزرگوں کی جلاوطنی میں۔ معصوم بچوں کی یتیمی میں۔ باعصمت دیویوں کی عصمت دری کرنے میں۔ بے گناہ ہندوستانیوں کی خوں ریزی میں۔ تحریک خلافت اور سوراج کی پامالی میں۔ تحریک خلافت کے دفتروں میں انگریز کی ڈاکہ زنی میں، تاکہ دنیا میں امن رہے۔؟

دوسری طرف غریب کھدر پوش رضا کاران وطن ہیں، ان کے پاس نہ توپ ہے نہ بندوق، نہ ہوائی جہاز نہ مشین گن، نہ تلواریں نہ مضبوط قلعہ، نہ خوش نما محل۔ وہ بھی تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ آؤ ہماری مدد کرو۔ کس چیز میں؟ بیواؤں کی خدمت میں، باعصمت دیویوں کی حفاظت میں، لیڈروں کی رہائی میں، حصول آزادی میں، اس کے بدلے تمہیں کیا ملے گا؟ خوش حالی، فارغ البالی، آزادی، اب تم خود فیصلہ کرو کہ کس کا ساتھ دو گے؟ ظالموں کا یا مظلوموں کا اور غلام بنانے والوں کا یا آزاد اور آزاد کرانے والوں کا۔"

غرضیکہ اردو صحافت اور اخبارات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی میں اردو اخبارات نے جو گراں قدر خدمات اور قربانیاں پیش کیں انھیں صفحہ تاریخ سے مٹانا ناممکن ہے۔

■

Dr. Jahangir Ahmed Khan
Associate Professor Urdu Dept
Govt. Raza PG College
Rampur- 244901 (UP)
Mob.:9837764885
Email:jahangir4885@gmail.com

عوامی ترسیل اور نئی ٹیکنالوجی

وثیق الرحمن داؤد علی

ترسیل عربی زبان کا لفظ رسل سے ماخوذ ہے، جس کا معنی بھیجنا یا پہنچانا ہے۔ انگریزی زبان میں ترسیل کو Communication کہتے ہیں، جو بنیادی طور پر لاطینی لفظ 'کمیونی کیئر' Communicare سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی اشتراک کے ہیں۔[1]

بقول پروفیسر محمد شاہد حسین:

"جب ہم کسی جذبے، خیال، معلومات یا محسوسات کو دوسرے تک بھیجتے ہیں تو اسے مشترک کرتے ہیں گویا اس میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں لہٰذا خیالات اور تجربات و محسوسات میں دوسروں کو شریک کرنے کا عمل ترسیل کہلاتا ہے۔"[2]

وریبالا اگروال اور وی ایس گپتا نے ترسیل کو تصورات، خیالات، عقائد، معلومات اور نظریات کے باہمی تبادلے سے تعبیر کیا ہے۔ ان دونوں کا کہنا ہے:

"ترسیل اطلاع بھیجنے یا حاصل کرنے کا عمل ہے۔ یہ ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہم انسانی رشتوں کو ہموار کرتے ہیں اور فروغ دیتے ہیں۔"[3]

دراصل ترسیل تقریر، تحریر اور اشاروں کے ذریعے رائے، خیالات اور معلومات کے تبادلے کا نام ہے۔ ترسیل وہ عمل ہے جس سے فرد کو اجتماعیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ شخصی زندگی کو متاثر کرتی ہے اور اسے نئی سوچ عطا کرتی ہے۔ اس سے انسان کو غور وفکر کرنے کے نئے انداز مہیا ہوتے ہیں جس کا اثر پورے سماج پر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک انسان کے پھلنے پھولنے کے لیے غذا ضروری ہے ٹھیک اسی طرح معاشرتی ترقی کے لیے ترسیل اور عوامی ترسیل بھی ضروری ہے۔ ترسیل سماج کے بنیادی ڈھانچے میں اسی طرح پیوست ہے جس طرح انسان کی نسوں میں خون۔ یہ انسان پر ایسا تاثر چھوڑتی ہے جس سے انسان اپنی شخصیت میں نمایاں تبدیلی لاکر خود سماجی تبدیلی کا باعث بن جاتا ہے۔

ترسیل ایک فطری عمل ہے۔ یہ انسانی زندگی اور سماج کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اس کے بغیر معاشرتی زندگی اور سماجی چہل پہل ناممکن ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ترسیل کے بغیر انسان کا وجود رہنا ہی مشکل ہے تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ ترسیل کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسان کی تخلیق۔ ترسیل انسان کی تاریخ کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے۔ انسان کی تاریخ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ترسیل کی تاریخ بھی پروان چڑھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ کی ترقی کے ساتھ ترسیل کے اقسام اور ہیئت میں بھی دن بہ دن وسعت ہوتی رہی ہے۔

کلام اور غیر کلام کے اعتبار سے ترسیل کو کلامی اور غیر کلامی ترسیل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کلامی ترسیل میں الفاظ کا استعمال ہوتا ہے جبکہ غیر کلامی ترسیل میں اشارے، کنایے میں پیغامات ارسال کیے جاتے ہیں۔ اس میں باڈی لینگویج کا بڑا دخل ہے۔ چہرے کے تاثرات، آنکھوں کے اشارے، ہاتھوں اور پیروں کی حرکات و سکنات، سر کی جنبش وغیرہ اس میں شامل ہیں۔

عموی طور پر ترسیل کی پانچ قسمیں، اندرون ذاتی ترسیل، شخصی ترسیل، جماعتی ترسیل، طبقاتی ترسیل اور عوامی ترسیل بیان کی جاتی ہیں۔ 'اندرون ذاتی ترسیل' ترسیل کی سب سے قدیم قسم ہے۔ اس کی تاریخ اس وقت سے مانی جائے گی جب سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ 'اندرون ذاتی ترسیل' میں ایک انسان بذات خود اندرون میں اپنے حواس کے مطابق ضرورت کی چیزوں کو طلب کرتا ہے۔ حسیاتی نظام کے تحت دماغ کسی پیغام کو پورے جسم میں پھیلاتا ہے اور اس کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔

بین شخصی ترسیل میں دو لوگ آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھار دو سے زائد لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ دو سے زائد کے حلقے میں بھی بروقت دو ہی لوگ بات چیت کرتے ہیں۔ لوگوں کے اس حلقے میں سورس اور ریسیور (مرسل اور مرسل الیہ) میں فوراً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

جماعتی ترسیل میں جماعت کا اعتبار ہوتا ہے اس میں دو سے زائد افراد کے درمیان ترسیل کا عمل انجام پاتا ہے۔ ترسیل کی اس قسم میں سورس اور ریسیور کے درمیان ایک واضح رشتہ ہوتا ہے۔ اس ترسیل میں ریسیور کی تعداد گنتی کی جا سکتی ہے۔ جبکہ طبقاتی ترسیل ایک بڑے مجمع کے درمیان ہوتی ہے۔ اس میں ریسیور کی تعداد کی گنتی نہیں کی جا سکتی ہے مگر ان کا تخمینہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی ایجاد سے پہلے اس ترسیل کو عوامی ترسیل کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ مگر جدید سائنسی ایجادات کے بعد اس ترسیل کا نام طبقاتی ترسیل اور جدید دور کے ذرائع ابلاغ کو عوامی ترسیل میں شمار کیا گیا ہے۔

'عوامی ترسیل' ترسیل کی سب سے جدید ترین قسم ہے۔ عوامی ترسیل کو انگریزی میں Mass Communication کہتے ہیں۔ اس ترسیل میں ریسیور کی تعداد کی گنتی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ عوامی ترسیل میں اخبار، رسائل و جرائد، پمفلیٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا وغیرہ شامل ہیں۔

'شرلی بیاگی' کہتے ہیں:

"عوامی ترسیل مواصلات کے مختلف ذرائع جیسے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سوشل میڈیا وغیرہ کو کسی ایک وقت میں استعمال کرکے متنوع آبادی کے ایک بڑے حصے تک معلومات پہنچانے اور ان کا تبادلہ کرنے کا ایک عمل ہے۔"[4]

اسٹڈی ڈاٹ کام کے تحت:

"عوامی ترسیل ایک ایسا عمل ہے جس میں ایک شخص یا لوگوں کا ایک گروپ یا کوئی ادارہ مواصلات کے ایک چینل (ذرائع) کے ذریعے گمنام اور متضاد لوگوں اور

تنظیم کے ایک بڑے گروپ کو پیغام بھیجتا ہے۔[5]

محمد شاہد حسین اور اظہار عثمانی کی کتاب 'اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ' میں عوامی ترسیل کی تعریف یوں ہے کہ:

''عوامی ابلاغ کے ذریعے اطلاعات، خیالات، تجربات، فکر و نظریات، علوم و فنون، تفریحی مواد، حالات حاضرہ، عوامی مسائل اور دیگر بہت سی چیزوں کو ایک بڑے اور مختلف النوع انسانی گروہ تک بیک وقت کسی ایسے ذرائع سے پہنچایا جائے جو اس کے لیے اختراع کیا گیا ہو۔[6]

ان تمام تعریفوں کا لب لباب یا پھر یوں کہیے کہ مرکزی خیال یہ ہے کہ عوامی ترسیل ایک ایسا عمل ہے جس میں بیک وقت پیغام کو چینل کے ذریعے بڑے پیمانے پر معلوم یا نا معلوم متعدد لوگوں تک پہنچایا جائے۔ عوامی ترسیل کے چینل میں اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم، انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر محمد شاہد حسین کہتے ہیں:

''مختصر یہ ہے کہ ہم ان ہی چیزوں کو عوامی ابلاغ کے ذرائع مانتے ہیں جو فنی اور تکنیکی طور پر پیغامات کو عوام کے بڑے گروہ تک بیک وقت پہونچانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔''[7]

عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی میں سورس، میسیج (پیغام)، چینل، رسیور، فیڈ بیک اور بریئر (رکاوٹ) شامل ہیں۔

ٹیکنالوجی کا معنی و مفہوم

ٹیکنالوجی کی تعریف میں ماہرین کی مختلف آراء رہی ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق: ٹیکنالوجی سائنسی علم سے تیار کردہ مشینیں اور آلات ہیں۔ جبکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا گیا ہے:

''ٹیکنالوجی انسانی زندگی کے عملی مقاصد کے لیے سائنسی علم کا استعمال ہے۔ یہ انسانی ماحول اور سرگرمی کی تبدیلی کا اہم ذریعہ بھی ہے۔''[8]

دراصل ٹیکنالوجی سائنس اور معلومات کے فنی اور عملی استعمال کو کہا جاتا ہے۔ اس شعبۂ علم کے دائرے میں وہ تمام آلات، تمام دستور العمل یا طریقۂ کار بھی آجاتے ہیں جو علمی استعمال سے متعلق ہوتے ہیں۔ عوامی ترسیل کے تعلق سے ٹیکنالوجی سائنس اور معلومات کے اس فنی اور علمی استعمال کو کہیں گے جسے ترسیل کے تعلق سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ تمام مشینیں اور آلات ٹیکنالوجی میں شامل ہوں گے جو ترسیل کے عمل میں ضروری ہیں۔

ترسیل کے تعلق سے جہاں تک نئی ٹیکنالوجی کی بات ہے تو ہر زمانے میں عوامی ترسیل کے لیے جو جداگانہ طریقۂ کار، نئے آلات اور مشینیں استعمال کی گئیں ہیں اسے ترسیل کے عمل میں نئی ٹیکنالوجی کہیں گے۔ پرنٹ مشین آجانے کے بعد 1609 سے مطبوعہ صحافت کی شروعات ہوئی یا پھر 1780 میں ہکی (Hicky) نے بنگال گزٹ اخبار نکالا تو یہ اپنے اپنے وقت میں عوامی ترسیل کے لیے ایک نئی ٹیکنالوجی تھی۔ اسی طرح جب ٹیلی ویژن ایجاد کیا گیا اور اس سے عوامی ترسیل کا کام لیا جانے لگا تو ترسیل کے لیے یہ بھی ایک نئی ٹیکنالوجی تھی۔ آج کے دور میں عوامی ترسیل کے لیے جدید ترین کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویب ایپلی کیشن، سافٹ ویئر وغیرہ جو استعمال ہو رہے ہیں آج سے پندرہ، بیس سال پہلے ہم ان سے واقف نہیں تھے۔ بلاشبہ یہ ہمارے دور میں ایک نئی ٹیکنالوجی ہے۔

عوامی ترسیل اور نئی ٹیکنالوجی کا باہمی ربط

چینل (ذرائع) کا تعلق مشینوں سے ہے۔ اسی طرح ٹیکنالوجی کا تعلق بھی مشینوں سے ہے۔ بذات خود ترسیل کے لیے ٹیکنالوجی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے جبکہ عوامی ترسیل کے لیے ٹیکنالوجی ناگزیر ہے۔ موجودہ دور میں عوامی ترسیل نئی ٹیکنالوجی پر بہت زیادہ منحصر ہے۔ ٹیکنالوجی کے بغیر عوامی ترسیل کا وجود ناممکن ہے۔ عوامی ترسیل کو وسعت دینے اور تیز رفتار کرنے میں نئی ٹیکنالوجی نے فعال کردار نبھایا ہے۔ پہلے عوامی ترسیل میں کوئی خاطر خواہ وسعت اور تیزی نہیں تھی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سے عوامی ترسیل کا کام انجام دیا جا رہا تھا۔ اس ترسیلی نظام میں بہت زیادہ وقت لگتا تھا اور کئی بار خبروں کے حقائق تک پہنچنا بھی ایک مشکل کام تھا۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جہاں ہر میدان میں انقلاب آیا وہیں عوامی ترسیل کے ذرائع (چینل) پر بھی اس کا اثر نمایاں ہوا۔ گذشتہ تین چار دہائیوں میں سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت زیادہ ترقی ہوئی (حالانکہ دوسرے ممالک میں اس سے قبل ترقی شروع ہوگئی تھی)۔ اس دوران انسانی تاریخ میں ترقی کا پہیا بڑی تیزی سے گھوما اور پھر نئی ٹیکنالوجی کے راستے ہموار ہوئے۔ آج کا دور تو یہ ہے کہ نئی ٹیکنالوجی عوامی ترسیل کا ایک لازمی جز یا پھر یوں کہیے کہ پورے جسم میں انھیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ جدید دور میں سماجی تبدیلی اور ارتقا میں نئے حرفیاتی نظام کا اہم رول رہا ہے۔ مارشل میک لوہان نے اپنی کتاب 'Understanding Media' میں لکھا ہے کہ:

'' سماج کو نئی شکل دینے میں فکر سے کہیں زیادہ میکانیکی ذرائع کا ہاتھ ہے جو فکر کی نشر و اشاعت کو ممکن بناتے ہیں۔ الیکٹرونک انفارمیشن ٹیکنالوجی، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن فلم اور کمپیوٹر ہماری تہذیب کو نئی شکل دے رہے ہیں۔ اس سے قبل پرنٹ میڈیا نے یہ اہم رول ادا کیا تھا۔''[9]

میڈیا کے اقسام

میڈیا کے اقسام یوں تو دو یعنی 'پرنٹ میڈیا' جیسے کتاب، اخبار، رسائل اور 'الیکٹرونک میڈیا' جیسے ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیلی فون وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں مگر دور جدید میں میڈیا کو 'روایتی میڈیا' (Traditional Media) اور 'نیا میڈیا' (New Media) میں تقسیم کیا گیا ہے:

- روایتی میڈیا میں عوامی ترسیل کے وہ تمام ذرائع ہیں جو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی سے پہلے رائج تھے۔ اس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، پرنٹ میڈیا جیسے اخبار و رسائل وغیرہ شامل ہیں۔
- نیا میڈیا عوامی ترسیل کے ان ذرائع کو کہتے ہیں جس میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ذریعے الیکٹرونک مواصلات کی مختلف قسم کو بروئے کار لایا جائے۔ اسے ڈیجیٹل میڈیا کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں ویب ایپلی کیشن ہائبرڈ (web application hybrid)، انٹرنیٹ آرٹ، ملٹی میڈیا سی ڈی رومس (Multimedia CD-ROMs)، سافٹ ویئر، ویب سائٹس جیسے بروشروائر، بلاگ اور ویکیز، ای میل اور اٹیچمنٹ وغیرہ شامل ہیں۔

سوشل میڈیا اور نیو میڈیا میں فرق

سوشل میڈیا نیو میڈیا کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہ آن لائن کمیونٹی کے مابین بات چیت کا ایسا ذریعہ ہے جس میں معلومات اور خیالات کے تبادلے ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے علاوہ عوامی ترسیل میں رسیور (مرسل الیہ) مجہول (Passive position) ہوتا ہے جبکہ سوشل میڈیا میں رسیور سینڈر یعنی معروف ہوتا ہے۔ فیس بک، ٹیوٹر، انسٹا گرام، اسنیپ چیٹ (Snapchat)، یوٹیوب، اور وی میو (Vimeo)، سوشل میڈیا کے اہم پلیٹ فارم ہیں۔

عوامی ترسیل کی زبان

ابلاغ و ترسیل میں زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ترسیل کی تمام قسموں میں یوں تو زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے مگر عوامی ترسیل میں زبان کی اہمیت اور ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ زبان کے بغیر موثر طور پر عوامی ترسیل کا عمل ناممکن ہے۔ حالانکہ عوامی ترسیل کے اجزاء ترکیبی 'سورس (مرسل) چینل (ذرائع) پیغام، رسیور

(مرسل الیہ) فیڈ بیک اور بریئر (رکاوٹ) میں 'زبان' کو جگہ نہیں دی گئی ہے مگر پھر بھی ہمیں عوامی ترسیل میں زبان کو اہمیت دینی ہوگی۔ کیونکہ اس کے بغیر عوامی ترسیل کا عمل پتھر میں جونک لگانے کے مترادف ہے۔ انجم عثمانی کہتے ہیں:

''ترسیل صرف بات کہہ دینا (چاہے وہ تصویری زبانی ہو، لفظ کے ذریعے ہو یا عمل وحرکت کے ذریعے) نہیں ہے، بلکہ بات کا پہنچنا بھی ضروری ہے۔ جہاں بات دوسرے تک منتقل نہ ہو پائے وہاں ترسیل نہیں ہوگی۔''10

بسا اوقات اشارے، کنایے اور حرکات وسکنات وغیرہ کے ذریعے بھی ترسیل کا کام لیا جاتا ہے مگر ان کا دائرہ بہت محدود ہے۔

عوامی ترسیل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی ترسیل کی زبان کے کوئی خاص اور متعین اصول وضوابط نہیں ہیں جس کی روشنی میں پیغام آسانی سے مرتب کیا جاسکے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا ہر ایک کی الگ زبان، حدود اور تقاضے ہیں۔

عمومی طور پر عوامی ترسیل کی زبان سادہ اور آسان ہونا چاہیے۔ اس میں الفاظ وجملوں کی تکرار نہیں ہونی چاہیے۔ اضافت اور مترادفات کے استعمال سے بچنا چاہیے۔ تحریر وتقریر میں ربط اور جملے کے اختصار کے ساتھ ان کی ساخت وتراکیب سہل ہونا چاہیے۔ مروجہ اصطلاحات کے استعمال کے ساتھ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے ایسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے جو نامانوس اور مشکل ہوں۔ اخبار کی زبان آسان اور روزمرہ کی زبان ہونی چاہیے تاکہ رسیور کو پہلی نظر ہی میں بات سمجھ میں آجائے۔ کتابی زبانوں سے بچنا چاہیے۔ سہل اور آسان کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ غیر معیاری ہونی چاہیے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان میں اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ عام طور پر اخبار کا قاری تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہوتا ہے مگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رسیور (مرسل الیہ) ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو بالکل بھی پڑھے لکھے نہ ہوں۔ یہاں ایک بار بات نکل جانے کے بعد اس پر قابو نہیں پایا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہاں زبان کے ربط اور منطقی ترتیب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

سماج پر عوامی ترسیل اور نئی ٹیکنالوجی کے اثرات

بلاشبہ نئی ٹیکنالوجی ہماری معاشرتی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ اس نے ہماری سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی زندگی کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔ سماجی تبدیلی، رائے عامہ کی تشکیل اور اسے ہموار کرنے میں نئی ٹیکنالوجی کا بڑا دخل ہے۔ افراد کی ذہنی نشوونما، سیاسی بصیرت، سماجی شعور کی بیداری اور کردار سازی میں ٹیکنالوجی کا اہم رول ہے۔ آج پوری دنیا مارشل میکلوہان (Marshall McLuhan) کے بقول ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ ہمارے ملک کی بات چھوڑیے ہم سکنڈوں میں دور دراز ممالک اور جگہوں کی حالت سے باخبر ہو سکتے ہیں۔ ایک کلک میں ہم ان کی معاشرتی زندگی، سیاسی خدوخال، بازاروں میں اشیا کی قیمتوں اور اتار چڑھاؤ کے بارے میں آسانی سے جان سکتے ہیں۔ وہاں موجود لوگوں سے ویڈیو اور آڈیو کالنگ کے ذریعے بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔

تعلیم کی تحصیل وترسیل اور فروغ میں نئی ٹیکنالوجی ایک جزء لاینفک ہے۔ تعلیمی میدان میں انقلاب نئی ٹیکنالوجی کا ہی مرہون منت ہے۔ ٹیکنالوجی کے بغیر آج تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ نئی ٹیکنالوجی سے ہمارے سماج پر منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کی بدولت غلط اور گمراہ کن چیزوں نے ایک مہذب سماج کا تانا بانا اور عظمت کو مجروح کیا ہے۔ غلط بیانی، جھوٹ اور افواہوں کی تشہیر وترسیل کرکے آپسی بھائی چارے اور قومی یکجہتی کو تار تار کیا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نئی ٹیکنالوجی دو دھاری تلوار ہے یا پھر ایک ایسا چاقو ہے جس سے اچھے اور برے دونوں طرح کے کام لیے جاسکتے ہیں۔ گویا یہ ایک آگ ہے جس سے ہم فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو سلامت رکھ سکتے ہیں اور ان کا غلط استعمال کرکے زندگی کے نشیمن کو خاکستر بھی کر سکتے ہیں۔

نئی ٹیکنالوجی اپنے دامن میں روشنی اور تاریکی دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ کوئی بھی چیز بذات خود بری نہیں ہوتی بلکہ ان کا استعمال انھیں اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ نئی ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے والوں کے اوپر ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی روشنی سے اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ ملک اور سماج سے بھی اندھیرے کو مٹا کر تعمیری کام انجام دے سکتے ہیں وہیں ان کے منفی استعمال سے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ ملک اور سماج کو گمراہ بھی کر سکتے ہیں۔

نئی ٹیکنالوجی سے ہمارے سماج میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے۔ ایک طرف اگر اس سے نئی نسل میں اخلاقی گراوٹ، اقدار کی پامالی اور جرائم میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف اس نے سماج کا ایک آئینہ بن کر اس کا تحفظ بھی کیا ہے۔ مستقبل کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے راستے بھی ہموار کیے ہیں۔ یہ صرف ہمیں باخبر کرکے نئی فکر، نئے شعور سے ہم آہنگ ہی نہیں کراتی بلکہ تجربات میں وسعت پیدا کرکے نئے چیلنجز قبول کرنے کے لائق بھی بناتی ہے۔ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات کی صحیح تصویر کشی کرکے معاشرے کا عکس عوام کے سامنے پیش بھی کرتی ہے، تاکہ عوام صورت حال کے مطابق لائحہ عمل تیار کر سکے۔

غرض کہ نئی ٹیکنالوجی عوامی ترسیل کے ساتھ انسانی زندگی کے لیے ایک لازمی شے بن چکی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ٹیکنالوجی کے بغیر آج عوامی ترسیل کا وجود ناممکن ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت موجودہ دور میں اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کوئی بھی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ نئی ٹیکنالوجی کے نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص شتر مرغ بن کر اپنا سر ریت میں چھپالے کہ آندھی نہیں آئے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ ٹیکنالوجی انسانی زندگی پر اپنی گرفت مضبوط کر چکی ہے اور آگے بھی اس کے دائرے پھیلتے جائیں گے۔ بل گیٹس نے 'انٹرنیٹ از دی فیچر' میں لکھا ہے کہ:

''انٹرنیٹ ایک تلاطم خیز لہر ہے جو کمپیوٹر انڈسٹری کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ وہ لوگ جو اس لہر میں تیرنا سیکھنے سے احتراز کریں گے اس میں ڈوب جائیں گے۔''11

حواشی

1 اردو میڈیا: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، مضمون: او پی ورما، این سی پی یو ایل، 2014، ص1

2 ابلاغیات / پروفیسر محمد شاہد حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2020، ص3

3 اردو میڈیا، ص37

4 Media/Impact: An Intoduction to Mass Media By Shirley Biagi, Belmont, CA: Wadsworth,1988, Page No:7/8,

5 اسٹڈی ڈاٹ کام، لفظ: 'ماس کمیونی کیشن'

6,7 اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ / محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، اردو اکادمی دہلی، 2007، ص8-9

8 انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، لفظ 'ٹیکنالوجی'

9 عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی، دیویندر اسر، مترجم: شاہد پرویز، این سی پی یو ایل، 2012، ص14

10 ٹیلی ویژن نشریات: تاریخ، تحریر، تکنیک: انجم عثمانی، فیصل انٹر نیشنل، 2008، ص18

11 عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی: دیویندر اسر، مترجم: شاہد پرویز، این سی پی یو ایل، 2012، ص12

■

Wasiqur Rahman
Research Scholar
Delhi Ulniversity
Delhi-110007
Mob.:9113704556

مصنف: احسان عبدالقدوس
مترجم: محمد قطب الدین

بھکاریوں کی ہڑتال

آزادیِ نسواں اور رومانوی ادب کے علم بردار احسان عبد القدوس(1990-1919) بیسویں صدی کے مایۂ ناز عربی افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں۔ان کی پیدائش 1919میں مصر کے شہر قاھرہ میں ہوئی۔1942میں قاھرہ یونیورسٹی کے فیکلٹی آف لا سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی،مگر صحافت سے خاص دل چسپی کے باعث انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی بحیثیت ایک سیاسی تجزیہ نگار اور عربی مجلہ 'روزالیوسف' جسے ان کی والدہ فاطمہ الیوسف نے جاری کیاتھا، کی ایڈیٹر شپ سے شروع کی۔اپنے بے لاگ صحافیانہ تجزیوں کے سبب بے باک صحافیوں میں شمار کیے جانے لگے جس کی وجہ سے انھیں دوبرسوں تک قیدو بند کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔علاوہ ازیں میدانِ صحافت میں مختلف مناصب پر فائز ہوئے اور آخر میں جریدہ 'الأھرام' کے ایڈیٹر بھی منتخب ہوئے۔

احسان عبد القدوس نے بعد میں تصنیف و تالیف کے لیے خود کو وقف کردیا اور تادمِ حیات اسی میں مشغول رہے۔انھوں نے سینکڑوں افسانے اور متعدد ناول تحریرکیے جن میں اکثروبیشتر ٹیلی ویژن،سنیما اور ریڈیو کے ذریعے پیش ہوئے۔ موصوف نے اپنی تحریروں میں اجتماعی زندگی اور معاشرتی خرابیوں کو اجاگر کرکے سماج کی دکھتی رگ پر ھاتھ رکھاھے۔ان کے مشھور ناولوں میں 'أنا حرۃ'(میں آزاد ھوں) 'الطریق المسدود'(بند راستے) 'شئی فی صدری'(دل کا بھید) 'لا انام'(میں نھیں سوتی) 'لا تترکونی ھنا وحدی'(مجھے تنھا چھوڑ نہ جانا)وغیرہ ھیں۔نیز افسانوں میں 'زوجات ضائعات'(لاچار بیویاں) 'سیدۃ فی خدمتك'(خانم حاضر ھے) 'البنات والصیف' (دوشیزائیں اور موسمِ سرما) 'فوق الحلال والحرام'(حلال و حرام سے پرے) 'بئر الحرمان'(تشنگی)اور 'عقلی و قلبی'(دل و دماغ)وغیرہ بھت مشھور ھیں۔پیش نظر افسانہ کا عربی عنوان 'إضراب الشحاذین' ھے جواحسان عبدالقدوس کے آخر الذکر افسانوی مجموعے سے ماخوذ ھے۔

ایک نہایت دین دار شخص تھا جس کی عادت تھی کہ وہ ہر سال رمضان کے مہینے کی پہلی رات میں 'ختم قرآن' کا اہتمام اور 'سیدہ زینب' کے مقبرے پر جمع ہونے والے تمام بھیک منگوں کی دعوت کرتا تھا۔ان کی ضیافت کے لیے وہ دو بچھڑے ذبح کرتا اور کافی مقدار میں پکا ہوا چاول اور چپاتیاں ان میں تقسیم کرتا تھا۔

ہر سال کی طرح امسال بھی اس نے اس کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ہاتھوں میں تسبیح لے کر اللہ کا ذکر کرنے لگا اور اس کے ارد گرد کچھ لوگ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھے اور وہ شخص بھیک منگوں کا انتظار کر رہا تھا۔

روزہ افطاری کے اعلان کے لیے توپ کے ذریعے گولہ داغے جانے میں محض ایک گھنٹہ باقی تھا، تاہم ابھی تک کوئی بھکاری وہاں نہیں پہنچا تو اس دین دار شخص نے صورت حال کا جائزہ لینے اپنے نوکر کو بھیجا۔

تھوڑی دیر بعد نوکر ہانپتا کانپتا آیا اور اس دین دار شخص سے کہنے لگا:

''تمام بھکاری آج آنے سے انکار کر رہے ہیں!''

اس شخص نے حیرانی سے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پوچھا:

''انکار کر رہے ہیں،مگر کیوں؟!''

نوکر نے جواب دیا:

''ان لوگوں نے اپنی ایک یونین بنالی ہے اور ایک ٹانگ سے معذور محمد نکلہ اور مفلوج و خارش زدہ ابوراپیہ کو

اپنا لیڈر چن لیا ہے!''

اس شخص کو یقین نہیں ہو رہا تھا، پھر بھی اس نے پوچھا:

''ان کے لیڈروں نے تم سے کیا کہا؟''

نوکر نے بدستور ہانپتے ہوئے جواب دیا:

''ان لوگوں نے کہا کہ وہ بغیر کچھ شرطیں منوائے آپ کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔''

اس شخص نے چلا کر کہا:

''شرطیں... خدا کی ذات بزرگ و برتر ہے، ان لوگوں کی اوقات بھکاری کے سوا کچھ نہیں ہے... ہم تو انھیں اللہ کے واسطے کھانا کھلاتے ہیں اور وہ ہمارے ہی اوپر شرطیں لگاتے ہیں... وہ بھاڑ میں جائیں، انھیں کھانا کھلانا تو گھاٹے کا سودا ہے!'' وہ بڑبڑانے لگا۔

نوکر اس شخص کے سامنے سے پیچھے کھسکتا ہوا چلا گیا۔

دین دار شخص تھوڑی دیر تک سوچوں میں گم رہا، ہر سال اس 'ختم قرآن' اور دعوت کے اہتمام کی اسے عادت سی ہوگئی تھی، اپنے کاروبار کے لیے اسے وہ نیک فال تصور کرتا تھا اور اسی کے دم پر محلے بھر میں نیک نام و دین دار شخص کی حیثیت سے معروف تھا، نیز اس کا رعب و دبدبہ بھی قائم تھا۔ چنانچہ 'ختم قرآن' کی یہ رسم بھکاریوں کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تھی... یہ کتے!

اس نے اپنے نوکر کو دوبارہ بلایا اور پوچھا:

''بھکاریوں کی شرطیں کیا کیا ہیں!؟''

نوکر نے جواب دیا:

''ان کا مطالبہ ہے کہ کھانے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کو دس 'قرش' (ایک سکہ جو مختلف عرب ممالک میں مختلف قیمتوں میں چلتا ہے) بھی دیے جائیں۔!!''

دین دار شخص یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور تیز آواز میں کہنے لگا:

''وہ ہماری سخاوت کا غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ میرا گھر برباد کرنے پر تلے ہیں، کتے!''

نوکر نے ڈرتے ہوئے کچھ کہنے کی جرأت کی:

''وہ کہتے ہیں کہ آپ کافی مال دار ہیں، اگر ایک ایک بھکاری کو دس دس قرش دیدیں تو آپ کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔''

وہ شخص پھر چیخنے لگا:

''ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکتی، بھاڑ میں جھونکو سب کو!''

نوکر ابھی واپس پلٹنا ہی چاہ رہا تھا کہ اس شخص نے اسے روک لیا اور حکم دیا:

''جاؤ ان بھکاریوں کو بلا لاؤ جو 'جامع الحسین' کے پاس کھڑے ہوتے ہیں۔''

نوکر نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا:

''ان میں سے کوئی بھی نہیں آئے گا، مجھے پتہ چلا ہے کہ بھکاریوں نے آپس میں علاقے بانٹ لیے ہیں۔ 'جامع الحسین' علاقے کا بھکاری 'سیدہ زینب' کے علاقے میں نہیں داخل ہوسکتا۔''

دین دار شخص نے ہاتھ ملتے ہوئے اپنا سر ہلایا، اس کی زبان پر بار بار یہی فقرہ آتا تھا:

''لاحول ولا قوۃ... ساری دنیا خسارے میں ہے، اب اس دنیا میں بھلائی کی کوئی جگہ نہیں بچی!''

اس شخص نے اپنا سر جھکا لیا اور گہری سوچوں میں گم ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب تو پورے سال نحوست چھائی رہے گی... اس کے کاروبار میں بھی نقصان کا اندیشہ ہے، مزید وہ اپنا رعب و دبدبہ اور پرہیزگار شخص کی حیثیت سے اپنی شناخت بھی گنوا بیٹھے گا۔ وہ کہیں آجا نہیں سکتا۔ لوگ اسے دیکھ کر طعنہ ماریں گے کہ یہ وہی شخص ہے جس کی دعوت بھکاریوں نے ٹھکرا دی تھی۔

اچانک وہ سوچوں کے حصار سے باہر نکلا اور اپنے نوکر سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا:

''جاؤ اور انھیں بتادو کے تمھاری شرطیں منظور ہیں۔ فوراً جاؤ، میری کار لے جاؤ، افطار کے اعلان میں اب صرف آدھا گھنٹہ بچا ہے۔''

نوکر تقریباً بھاگتا ہوا گیا۔

اس شخص کو اب بھی کل نہیں پڑ رہی تھی، اسے خدشہ تھا کہ نوکر کہیں خالی ہاتھ ہی نہ لوٹ آئے۔ اس لیے اپنے بیٹے کو بلایا اور اس سے کہا:

''یہ نوکر بے وقوف ہے.... اس کے بس کا کچھ بھی نہیں.... تم خود جاؤ اور سارے بھکاریوں کو لے کر آؤ....''

صاحبزادہ 'سیدہ زینب' مسجد گیا، وہاں دیکھا تو سارے بھکاری ایک جگہ جمع ہیں، وہاں ایک ٹانگ سے معذور محمد نکلہ اور اپاہج و خارش زدہ ابو رابیہ بھی تھا۔

صاحبزادہ انھیں دیکھتے ہی اپنے باپ کے سے لہجے میں کہنے لگا:

''اب تمھیں کس چیز کا انتظار ہے؟! میرے والد صاحب نے کھانے کے ساتھ ساتھ اپنی تجوریاں تم پر کھول دی ہیں اور ہر شخص کو پانچ قرش بھی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

یہ سنتے ہی ایک بھکاری بلند آواز میں بولا:

''ہاں... ہاں... چلو، یہ بہت اچھا موقع ہے اور نعمت خداوندی ہے۔''

دفعتاً چھوٹے پہیے والے لکڑی کے تختے پر بیٹھے ایک ٹانگ سے معذور محمد نکلہ نے اپنی گردن اونچی کرتے ہوئے کہا:

''نہیں... ہم اسی وقت جائیں گے جب ہمارے سارے مطالبات اور شرطیں مانی جائیں گی۔''

اپاہج اور بغیر بازو والے ابو رابیہ نے اپنا سر ہلاتے ہوئے ہانک لگائی:

''ہمیں ایک جٹ رہنا چاہیے... ہماری ایکتا زندہ باد!''

دوسرے بھکاریوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور زور زور سے دہرانے لگے:

''ہماری ایکتا زندہ باد.... ہماری ایکتا زندہ باد!!''

ایک اور مفلوج و خارش زدہ بھکاری نے ہانک لگائی:

''مال داروں کے مال سے ہم اپنا حق مانگ رہے ہیں... مال داروں کو بھی ہماری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہمیں مال داروں کی... اگر بھکاری نہ ہوتے تو سخاوت کرنے والے بھی نہ ہوتے، لہٰذا تم اپنی مانگوں پر ڈٹے رہو... تمھاری مانگیں جائز ہیں۔''

اس کی بات سن کر بھکاریوں نے بھاری اور سمع خراش آوازوں میں نعرہ لگانا شروع کردیا:

''ہماری مانگیں جائز ہیں... انصاف زندہ باد!!''

یہ ہنگامہ دیکھ کر دین دار شخص کا صاحبزادہ ڈر سا گیا... بھکاریوں کے بدن سے پھوٹنے والی بدبو سے اسے زکام ہوگیا اور اس کا جی متلانے لگا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر چند قدم چلا... وہ ڈرا، سہما اور ناکردہ غلطی کے احساس میں مبتلا تھا... ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ دین دار شخص کا سکریٹری دوڑا دوڑا آیا اور ان بھکاریوں سے کہنے لگا:

''آؤ... جناب نے تمھارے سارے مطالبات مان لیے ہیں، اب ہر شخص کو منھ مانگی مراد ملے گی۔''

یہ سنتے ہی خوشی کے مارے بھکاریوں کی آوازیں بلند ہوگئیں اور وہ نعرہ لگانے لگے:

''مردم نواز آقا زندہ باد... بندہ پرور زندہ باد... اے نیکی کرنے والے اللہ تعالیٰ تمھارا گھر آباد رکھے!!....

پھر بھکاریوں نے ایک ساتھ گرج دار آواز میں نعرہ لگایا:

''ہماری یونیٹی زندہ باد... ہماری ایکتا امر رہے!!''

■

Dr. Md. Qutbuddin
Associate Professor of Arabic
Centre of Arabic and African Studies
School of Language, Literature and Culture Studies (New Building)
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067

عربی ادب کا ایک ناول 'لقیطہ' اور سماج کی تصویریں

پریتی بھارتیا

انیسویں صدی کے دور میں جہاں عربی ناول نگاری میں ادیبوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جن میں نجیب محفوظ، طه حسین، السید مصطفی لطفی منفلوطی، عبد الرحمن منیف، یوسف ادریس، احسان عبد القدوس اور دیگر ناول نگاروں کے نام شمار ہوتے ہیں۔ انھیں میں ایک نام عبد الحلیم عبداللہ کا آتا ہے، وہ ایک مصری ناول نگار اور قصہ نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں مختلف رنگ نمایاں ہیں جس میں موضوعات کی کثرت ہے۔ ان کے سماجی، ریلیسٹک ناول، رومانٹک ناول اور فلسفیانہ ذوق و فکر اپنے قاری کو باندھے رکھتے ہیں۔ مصر کے اجتماعی حالات کو عبد الحلیم عبداللہ نے اپنے ناولوں اور قصے کہانیوں میں بھرپور طریقے سے پیش کیا ہے۔

ادب کی مختلف اصناف، ناول، قصے کہانیاں، ڈرامے وغیرہ انسانی وجود اور اس کے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ ادب انسانوں کے بُنے ہوئے سماج کا آئینہ ہے۔ جس کا عکس کبھی سفید تو کبھی سیاہ ہوتا ہے۔ انسانوں کے انھیں گوشوں کو چھوتا ہوا ایک ایسا ناول جو سماج کے سیاہ پہلو کو قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ اس ناول کو عربی ادب کے مشہور ناول نگار اور ادیب عبد الحلیم عبداللہ نے لکھا ہے اور اس میں انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے انسانوں کے احساسات اور روزمرّہ کی زندگی کی مشکلات کو قلم بند کیا ہے۔ ان کا یہ ناول اس اعتبار سے ایک مثالی ناول کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ سماج کے اس طبقے سے واقف کرواتا ہے جس کو ہم یتیم کے نام سے جانتے ہیں۔ فی الواقع یہ ناول ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو یتیم ہے۔

انیسویں صدی کے دور میں جہاں عربی ناول نگاری میں ادیبوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جن میں نجیب محفوظ، طہٰ حسین، السید مصطفیٰ لطفی منفلوطی، عبد الرحمٰن منیف، یوسف ادریس، احسان عبد القدوس اور دیگر ناول نگاروں کے نام شمار ہوتے ہیں۔ انھیں میں ایک نام عبد الحلیم عبداللہ کا آتا ہے، وہ ایک مصری ناول نگار اور قصہ نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں مختلف رنگ نمایاں ہیں جس میں موضوعات کی کثرت ہے۔ ان کے سماجی، ریلیسٹک ناول، رومانٹک ناول اور فلسفیانہ ذوق و فکر اپنے قاری کو باندھے رکھتے ہیں۔ مصر کے اجتماعی حالات کو عبد الحلیم عبداللہ نے اپنے ناولوں اور قصے کہانیوں میں بھرپور طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ ایک فلاسفر، ایک ادیب، ناول نگار اور بیک وقت سماج کی اصلاح کے داعی بھی ہیں جنھوں نے سماج میں گھلی ہوئی برائیوں کو نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ ان پر مختلف سوالات بھی اٹھائے ہیں۔ یہ ناول 1945 م میں شائع ہوا۔ ان کی یہ تصنیف بڑی ہی باریکی سے سماج میں ہو رہے حادثات اور ان کے ہونے والے اثرات کی منظر کشی کرتا ہے۔ جہاں محبت کرنا اور اس کے بعد دھوکہ دینا ایک عام مشغلہ بن چکا ہے۔ بعض لوگ اس کو ایک ترقی یافتہ سوچ یا سیکولر فکر کا نام دے دیتے ہیں۔ جہاں ایک انسان دوسرے کو صرف اپنے مفاد اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس سے ایک سیڑھی کی طرح کام لیتا ہے۔

لقیطہ ایک ایسی مجہول شخصیت کی کہانی ہے جو تلخ حقائق سے روبرو کراتی ہے۔ یہ کہانی شروع ہوتی ہے جہاں چند لوگوں کو سڑک کے کنارے نوزائیدہ بچی ملتی ہے جس کو کسی نے اس ویران سڑک کے کنارے چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس کی خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی کہ وہ ابھی بھی سانس لے رہی تھی۔ لوگوں کی نظروں میں افسوس اور تعجب سے زیادہ حقارت کا پہلو غالب تھا۔ وہ لوگ اس کو ج نامی یتیم خانے میں لے جا کر چھوڑ آتے ہیں۔

هذا ما تهامست به الأفواه في الصباح الباكر في ملجأ اللقطاء، لما دخلته طفلة

جديدة في يومها الثاني.

(لقيطه، محمد عبدالحليم عبدالله، ص 1)

"یہ رزیلہ کی بیٹی ہے، صبح تڑکے یتیم خانہ ج میں تمام لوگوں کی زبان پر یہی جملہ تھا۔ یتیموں کے اس ٹھکانے پر جہاں آج دوسرے دن اس نئی بچی کو لایا گیا تھا۔"

یہاں سے اس کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی یتیم خانے میں زینب نامی ایک عورت جو اس بچی کی پرورش کرتی ہے اور اپنا دودھ پلاتی ہے۔ جو کہ خود بھی ایک یتیم تھی۔ اس طفلہ کا نام لیلیٰ رکھا گیا جو کہ بے حد خوبصورت تھی اور ایسا بھولا پن اور سادگی کہ دیکھتے ہی پیار آئے۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔ لیلیٰ کو دنیا میں جو پیار ملتا ہے یہیں ملتا ہے۔ اس نے اس یتیم خانے میں سترہ سال گزارے اور اب اس کی یہاں سے جانے کی باری تھی ایک ایسی دنیا میں جو بالکل اس کے لیے نئی تھی۔ اس کا مزاج ایک نرم پتے کے جیسا تھا جو کہ پیار اور محبت اور اپنے لوگوں کے لیے ہمیشہ تڑپا کرتا تھا اور محبت ملنے پر لہلہانے اور کھلکھلانے لگتا۔ وہ خود اپنی ذات سے پوچھا کرتی کہ اس کو اس طرح کیوں پھینک دیا گیا، اس کا کیا قصور تھا؟

ج سے نکلنے کے بعد وہ ایک ہسپتال میں نرس کے طور پر خدمت کرتی ہے جہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ک سے ہوتی ہے۔ لیلیٰ کو کبھی سوالوں نے اکیلا نہیں چھوڑا اور نہ ہی لوگوں کی کھسپھساتی زبانوں اور سوالوں سے بھری نظروں نے۔ وہ جہاں بھی گئی لوگوں کے تانے اور چبھتے ہوئے رویے اس کو ملے اس کا ایک ہی قصور تھا کہ اس کی کوئی شناخت نہیں ہے۔ وہ ایک مجہول شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے خاندان کا کچھ پتا نہیں تھا حتیٰ کہ اس کی ماں کون تھی جس نے اس کو ایسے ہی کسی بیکار شے کی طرح چھوڑ دیا تھا۔ لیلیٰ مختلف سوالوں سے گھری ہوتی تھی جو خود بھی اس کے اندر غوطے لگاتے رہتے تھے۔ لیلیٰ اس ہسپتال میں کافی رغبت کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہی تھی مگر اس کے ساتھ دوسری نرسوں سے اپنا پن نہیں ملا حتیٰ کہ ایک انسان کے طور پر ملنے والی عزت بھی اسے نصیب نہیں ہوئی۔ ہمیشہ ان نرسوں کی کوشش رہتی کی وہ اس کو اس ہسپتال سے باہر کا راستہ دکھا سکیں۔ ایسے حالات نے لیلیٰ کو مایوسی سے بھر دیا اور اس فکر کو اس حادثے نے اور طول دیا۔ جب دوسری نرسوں نے اس کی کردارکشی کی۔ اس حادثے نے اس کی زندگی کو پرامید نہیں رہنے دیا۔ اپنی ماں کے چھوڑے جانے کے بعد وہ اس تنہائی میں جی رہی تھی جہاں روشنی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کہتی ہے:

انا التي خلقت وحدي كأنني حواء هذا الزمان. (المصدر السابق، ص 131)

"مجھے اکیلے ہی پیدا کیا گیا گویا کہ میں اس زمانے کی حوا ہوں۔"

ان حالتوں میں وہ اپنی ذات سے ہی سوال کرتی کہ اس کی ماں کون ہے؟ کیوں اس کی ماں نے اسے چھوڑ دیا؟ مگر ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

انہی حالات میں ایک دن لیلیٰ کو ایک خط موصول ہوتا ہے جس میں ایک نئی نوکری کی پیش کش ہوتی ہے اور لیلیٰ یہاں سے کوچ کر جاتی ہے۔ مگر اسکندریہ پہنچ کر بھی وہ اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں سے آزاد نہیں ہو سکی تھی۔ جب وہ اسکندریہ کے اسٹیشن پر اترتی ہے تو لوگوں کی بھیڑ میں وہ اپنے ماں اور باپ کو تلاش کرتی اور سوچتی ہے:

لعل أبي وأمي بين الذين أرى.. لعل أمي تلك الملفقة التي وراء ها الخادم، أو تلك المسافرة التي ستسافر وحدها، أو تلك التي تنادى على الفاكهة! ولعل أبي هذا السيد الذي يركض بجواره أو هذا الذي يعمل بالمحراث، أو صاحب هذا المقهى القريب من المحطة.. كل هذا جائز، وجائز ألا يكون لي أبوان في هذا البلد ولا في أى بلد آخر، فربما كانا من تحت التراب.

(المصدر سابق، ص 146)

"کاش میرے ماں باپ انھیں لوگوں میں سے ہوتے جنھیں میں دیکھ رہی ہوں، وہ خادم کے پیچھے لپٹی اور سمٹی کھڑی ہے، یا وہ مسافرہ جو اکیلے سفر کرنے والی ہے یا وہ جو پھلوں کے بیچنے والوں کو آواز دے رہی ہے۔

میرا باپ شاید وہ شخص جو اپنے گھوڑے پر سوار ہو رہا ہے، یا کہ وہ شخص جو کدال سے کام کرتا ہے، یا پھر اس کافی ہاؤس کا مالک جو کہ اسٹیشن کے قریب ہے۔

یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس شہر میں میرے والدین نہ ہوں اور نہ کسی اور شہر میں۔ اور شاید کہ وہ دونوں زمین کی تہہ میں ہوں۔"

اس ہسپتال میں اس کی ملاقات ڈاکٹر جمال سے ہوتی ہے، جمال کو لیلیٰ کی سادگی اور لطیف طبیعت سے محبت ہو جاتی ہے۔ مگر لیلیٰ اس نئی محبت اور اپنے پن سے واقف نہیں تھی اور وہ اپنی ذات سے جڑے سوالوں کے جواب تلاش کرنا چاہتی تھی۔ جمال لیلیٰ کو اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہے۔ پھر لیلیٰ کو بھی جمال سے محبت ہو جاتی ہے اور جمال کی ضد کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو جاتی ہے مگر جمال کے والد اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ انھیں صرف اپنی عزت کی پرواہ تھی۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے خاندان کا تعلق کسی ایسی لڑکی سے ہو جو کہ مجھولہ ہے، جس کی کوئی پہچان نہ ہو، جس کے خاندان کا کچھ علم نہ ہو۔ دوسری طرف جمال لیلیٰ سے جھوٹ بولتا ہے کہ اس کے خاندان کے افراد اس کے لیے راضی ہیں۔ وہ اپنے والدین سے کہتا ہے کہ لیلیٰ ایک مالدار اور شہرت مند تاجر کی بیٹی ہے تا کہ اس کے خاندان والے اسے قبول کر لیں۔ مگر جمال کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیونکہ دودھ بیچنے والی کو کسی نے بتا دیا تھا کہ لیلیٰ ہسپتال ک میں کام کرتی تھی۔ اس کے بعد جمال کے والد لیلیٰ کے بارے میں معلومات کرنے کے لیے ک ہسپتال جاتے ہیں اور انھیں ساری سچائی سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اتفاقاً اسی دن لیلیٰ کی حقیقی ماں ہسپتال میں اپنی بیماری کا علاج کرانے آتی ہے اور لیلیٰ کو دیکھ کر پہچان جاتی ہے۔ کیونکہ آج بھی اس کے پاس اپنی چھوٹی مولودہ کے سنہرے بال تھے اور اسے بتاتی ہے کہ تو میری بیٹی ہے میں ہی تمہاری ماں ہوں۔

اس نے رومال کے نیچے سے اس کی بالوں کی چوٹی کو نکالا۔

قریب تھا کہ لیلیٰ کے منہ سے چیخ نکل پڑے، اس نے ٹوٹتی آواز میں کہا،

"تم میری ماں ہو، بے شک تم ہی میری ماں ہو۔"

لیلیٰ کی ماں اس کو اپنی آپ بیتی سناتی ہے اور بتاتی ہے کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دیا تھا پھر مجھے ایک شخص سے محبت ہو گئی۔ کچھ دن کے بعد وہ بھی مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ایسی حالت میں میرے پیٹ میں ایک نئی جان پل رہی تھی۔ اس کے بعد گاؤں کے لوگوں نے اور خود گھر والوں نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد میری زندگی بڑی مشکلوں میں گھر گئی تھی۔ دونوں ماں اور بیٹی گہرے احساسات اور آنسوؤں میں لبریز ہو جاتے ہیں۔

اب دونوں خاندان آمنے سامنے ہوتے ہیں جہاں اب لیلیٰ کو اس کی ماں مل چکی ہے لیکن جمال کے والد اس بات پر راضی نہیں ہوتے ہیں۔ بالآخر ان سبھی باتوں سے لیلیٰ بے حد مایوس ہو جاتی ہے۔ سماج کے برے عکس و آئینے کو تو اس نے بچپن سے ہی دیکھا تھا، اب ان تمام حادثات نے اسے تھکا کر چور کر دیا تھا۔ اس کہانی کا اختتام بڑا ہی مایوس کن اور درد بھرا ہوتا ہے جہاں لیلیٰ کو سرجری کے دوران سرجیکل چاقو سے ایک ایسا زخم لگتا ہے جو اس

کے پورے جسم کو زہر سے بھر دیتا ہے جس کے سبب اس کی موت ہو جاتی ہے۔

سماج کی کئی تصویریں

لقیطہ صرف ایک کہانی نہیں ہے جہاں ایک یتیم لڑکی اپنی زندگی سے جڑے ہوئے رشتوں کو تلاش کرتی ہے اور وہ خود کی بھی شناخت کرنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ یہ کہانی مختلف زاویے سے سماج کے آئینے کو پیش کرتی ہے۔ آج جہاں یتیم بچوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جس کے متعدد اسباب ہیں جن میں والدین کا گزر جانا یا پھر ماں یا باپ میں سے کوئی ایک گزر گیا ہو، والدین نے خود ہی بچے کو چھوڑ دیا ہو اپنی خودغرضی کی وجہ سے یا سماج کے ڈر سے، یا لڑکی پیدا ہونے پر، پہلے محبت اور پھر شادی کا وعدہ کرکے ایسے مقام پر پہنچا دینا جہاں نہ صرف خود بلکہ ایک ننھی سی جان کی بھی زندگی بے حد مشکل ہو جاتی ہے۔ یا پھر ماں کو اپنے ہی خاندان سے مجبور ہو کر اپنے ہی بچے کو اپنے آپ سے جدا کرنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے اسباب ہیں یا یوں کہیں کہ ان اسباب کے علاوہ برائیاں زیادہ ہیں۔ اب رہی اس بچے یا بچی کی بات جسے لاوارث چھوڑ دیا گیا ہو اس کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، مگر اس کو ایسی سزا ملتی ہے جسے وہ عمر بھر جھیلتی ہے۔ کہیں اپنے وجود سے جڑے سوالوں سے تو کبھی سماج کے بنے ہوئے سانچے میں فٹ ہونے کے لیے اور یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔

عربی ادب کا یہ ناول ایک بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ناول نگار نے اس شاہکار کو لکھ کر قارئین کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ وہیں سماج میں ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہونے والے رویے کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے اور ان جیسے ناولوں کی بدولت ہمیں اپنے رویوں اور برتاؤ پر دوبارہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف لیلیٰ کی کہانی ہے بلکہ ہمارے اپنے سماج کی کہانی ہے اور یہ ناول جہاں ایک بچی کے پیدا ہونے، اس کا بچپنہ اور جوانی تک کے تمام مرحلے کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے وہیں اس کی ذہنی الجھنوں اور فکروں کے بارے میں بھی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ایسے سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے جس کے جوابات شاید ہی کسی کے پاس ہوں۔

عام طور پر لوگ یتیم سے بعض اوقات نرمی اور انسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کو مدد فراہم کرتے ہیں۔ مگر ایسے پڑے ہوئے بچوں سے اکثر لوگ نظر اور دامن دونوں بچا کر ہی نکلتے ہیں۔ اس میں ان بچوں کا قصور کیا ہے۔ اس کہانی میں یتیم کی جو بات کی جا رہی ہے وہ ایک ایسی یتیم نہیں جس کے ماں باپ گزر گئے ہوں بلکہ ایک ایسا یتیم ہے جو دو لوگوں کی شادی کے بغیر پیدا ہوا ہے۔ اسی موضوع کے بارے میں زینب نے کہا تھا جس کو عبدالحلیم نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

لا فرق بيني و بين أم هذه الطفلة، إلا أنني أحببت فتزوجت وهي أحبت ولم تتزوج۔ وجمع بين و بين زوجي حب و شريعة، وجمع بينها و بين رجلها حب بلا شريعة۔

(المصدر السابق، ص 12)

’’مجھ میں اور اس بچی کی ماں میں کوئی فرق نہیں فرق صرف یہ ہے کہ میں نے محبت کی اور میری شادی ہو گئی، جبکہ اس کی ماں نے محبت کی مگر شادی نہیں کر سکی۔ میرے اور میرے شوہر کے درمیان پیار اور قانون کا میل ہے جبکہ اس کی ماں اور اس کے باپ کے درمیان محبت بغیر قانون کے ہے۔‘‘

خلاصہ

عربی ادب کا یہ ناول ایک بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ناول نگار نے اس شاہکار کو لکھ کر قارئین کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ وہیں سماج میں ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہونے والے رویے کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے اور ان جیسے ناولوں کی بدولت ہمیں اپنے رویوں اور برتاؤ پر دوبارہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف لیلیٰ کی کہانی ہے بلکہ ہمارے اپنے سماج کی کہانی ہے اور یہ ناول جہاں ایک بچی کے پیدا ہونے، اس کا بچپن، اور جوانی تک کے تمام مرحلے کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے وہیں اس کی ذہنی الجھنوں اور فکروں کے بارے میں بھی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ایسے سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے جس کے جوابات شاید ہی کسی کے پاس ہوں۔

اس ناول کے ذریعے ناول نگار نے مصری سماج کی عکاسی کی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ ہم سبھی کے سماج کی تصویریں پیش کرتا ہے جن میں مشابہت کا پہلو نمایاں ہے چاہے وہ کسی بھی ملک کا سماج ہو۔ جہاں سماج میں رہ رہے دو لوگ بنا نکاح کے ایسے رشتے بناتے ہیں جس سے ایسی ہی نہ جانے کتنی مختلف لیلیٰ کی پیدائش ہوتی رہے گی جسے سماج قبول نہیں کرتا ہے۔ ماں چاہتی بھی ہو تو سماج کے ڈر سے اس نوزائدہ بچی کو ایسے ہی کسی سڑک کے کنارے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

اس ناول میں مختلف پہلو ہیں جو کڑوی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں جن میں نچلے طبقے اور اونچے طبقے کے درمیان کی کھائی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ جہاں نچلے طبقے کا انسان حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اچھے کردار اور حسن اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہیں اگر وہ کوئی عورت ہو تو اس کی پریشانیاں دوگنی ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسے ہی مقام پر جہاں جمال کے والد جمال سے لیلیٰ کے بارے میں کہتے ہیں:

أنا لا أعارض في شئ مادامت طبقتها غير نازلة۔ (المصدر السابق، ص 183)

’’مجھے صرف اس سے غرض ہے کہ اس کا سماج اور معاشرہ اس کا طبقہ پسماندہ اور دبا کچلا نہ ہو۔‘‘

ان سب کے علاوہ کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو سماج میں امید کی چھوٹی سی کرن کے مانند ہیں، جو کہ تبدیلی لانے کی قابلیت رکھتے ہیں اور انسانیت کے پہلو اور اس پر بھروسہ کرنے کی ہمت دلاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار ہے زینب کا جو ایک یتیم بچی کو اپنا دودھ پلاتی ہے اس کو پالتی ہے، اس کو انسیت اور محبت کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیتی ہے۔ زینب کے علاوہ ایک ایسا کردار ہے جو صحیح سمت کی طرف جدّ وجہد کرتا ہے اور اپنے گھر والوں سے اخلاق اور کردار کو نسب، نسل، درجہ، رنگ پر فوقیت دینے کی بات کرتا ہے۔ سماج کو ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے جو سماج کو ایک صحیح آئینہ دکھا سکیں۔

■

Priti Bhartiya
ND-4 Delhi University Women
Association University of Delhi
Chatra marg Delhi-110007

محمد شاداب عالم

تعلیمی مسائل کی سماجی اساس

تعلیم انسان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ تعلیم ہی ایک ایسی شے ہے جس سے انسانی فلاح و بہبودی ممکن ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں جس نے تعلیم کی ترقی کے بغیر منازل طے کیے ہوں تحقیقات اور اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی ترقی یافتہ ممالک ہیں ان میں سے بیشتر ممالک نہایت ہی تعلیم یافتہ ہیں۔ حالیہ Human Development Index 2022 یہ بتاتی ہے کہ جن ممالک کی شرح خواندگی دنیا میں بہتر ہے ان کی زندگی کا معیار بھی بلند ہے۔ ان کی سماجی، سیاسی معاشی حالت ان ملکوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے جن کی شرح خواندگی مناسب نہیں ہے۔ معیاری تعلیم انسانی زندگی کو سنوارنے اور بہتر سے بہتر بنانے میں کافی اہم رول ادا کرتی ہے۔ اچھی تعلیم سماج میں معاشی مساوات اور سماجی ہم آہنگی کو قائم و دائم رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ متوازن اور صحت مند معاشرے کے فروغ کے لیے اچھی تعلیم و تربیت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

ابتدا سے ہی انسانوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا رہا ہے وہ قسم قسم کی مشکلات سے دوچار ہیں۔ مختلف شعبے سے جڑے ہوئے لوگوں کے مسائل مختلف ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بینک سے جڑا ہے تو ممکن ہے اسے بینک کو اچھی طرح چلانے میں بسا اوقات مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر کوئی انسان محکمہ سراغ رسانی یا پولیس یا پھر محکمہ دفاع سے جڑا ہوا ہے تو اسے دفاعی مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ غرض جو انسان جس شعبے سے جڑا ہوتا ہے عین ممکن ہے کہ اسے اس شعبے سے متعلق امور کی انجام دہی میں کچھ نہ کچھ مسائل کا سامنا ہو جو کہ ایک فطری بات ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر کوئی انسان شعبہ تعلیم و تربیت سے منسلک ہے تو بہت ممکن ہے کہ اسے تعلیمی امور کی انجام دہی میں تعلیمی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔

یہ بات الگ ہے کہ دشواریوں کی سطح کیا ہے اس حساب سے دشواریوں کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے لیکن یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر انسان کو اپنے اپنے میدانوں میں امور کی انجام دہی کے وقت کچھ نہ کچھ مشکلات اور مسائل پیش آتے ہیں جن کا ادراک یا تدارک ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پیچیدہ مسائل بسا اوقات سرگرمی میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔

یہاں پر تعلیمی دشواریوں کا سماجی تناظر میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون کا اہم مقصد تعلیمی دشواریوں کا سماجی تناظر میں تجزیہ ہے اس میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ تعلیمی دشواریوں کا تعلق سماج سے کس طرح سے ہے۔ تعلیمی دشواریوں کی سماجی اساس: سماج کی وجہ سے پیش آنے والی تعلیمی دشواریاں ہیں۔

تعلیمی مسائل

تعلیمی مسائل سے مراد طلبا و طالبات کو تعلیمی میدان میں سماج کی وجہ سے ہونے والی دقت یا پریشانی ہے۔

تعلیمی مسائل کی وجوہات

تعلیمی مسائل کی بہت ساری ممکنہ وجوہات یا عوامل ہو سکتے ہیں یہاں پر چند کو قلم بند کیا جاتا ہے۔

(1) سماجی محرک (Social Factors of Academic Diffculties): سماجی محرکات طلبا و طالبات کی تعلیمی سرگرمیوں کو بڑی حد تک متاثر کر سکتی ہیں یہ وہ محرکات ہیں جو طلبا و طالبات یہاں تک کہ اساتذہ کے درس و تدریس کو بھی متاثر کر سکتے ہیں تعلیمی میدان میں بڑھتے ہوئے صنف، ذات، ثقافت اور مذہب کی بنیاد پر کیے جانے والے منفی امتیازات کو سماجی محرکات کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

(2) سیاسی وجوہات (Policital Factors of Academic Difficulties): حکومتیں اپنے شہریوں کو خواندہ یعنی تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتی ہیں لیکن بسا اوقات حکومت اپنے شہریوں کے لیے ایسے قوانین وضع کرتی ہے جو طلبا و طالبات کی تعلیمی سرگرمیوں کو منفی انداز میں متاثر کرتی ہیں قدیم زمانے میں غلاموں اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح امریکہ میں ایسے قوانین بنائے گئے جس کے تحت کالے اور گورے لوگوں کے لیے اسکول (Seprated School System) بنائے گئے۔ ایسے قوانین تعلیمی میدان میں بچوں کے لیے دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔

3 معاشی محرکات (Eocnomic Factors): معاشی طور پر کمزور طبقہ کے لیے اپنی تعلیم کو جاری رکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ غیر مستحکم معاشی صورت حال سے بچوں کی تعلیم پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گاؤں و دیہات یعنی دیہی علاقوں میں زیادہ تر بچے فصلوں کی کٹائی اور بوائی کے وقت اسکول نہیں جاتے ہیں۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں اس کا مشاہدہ عام ہے۔ اچھی تعلیم و تربیت کے لیے مناسب مقدار میں سرمایے کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

4 ماحولیاتی محرکات (Envorinmental Factors of Academic Difficulties): مؤثر تدریسی عمل کے لیے پرسکون ماحول کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مخدوش حالات اور غیر موافق صورت حال با مقصد اور مؤثر تدریسی سرگرمی کے لیے مانع ہے۔ بہتر تعلیم و تربیت کے لیے سازگار ماحول کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ غیر مناسب ماحول (Adverse Environment) طلبا و طالبات کی تدریسی واکتسابی سرگرمی (Teaching Learning Activities) کو منفی انداز میں متاثر کرتا ہے۔ جنگ زدہ علاقوں میں یا پھر مخدوش علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں کو انجام دینا آسان نہیں ہوتا ہے۔ نامساعد حالات اور ناساز موسم میں بھی تدریسی عمل عام معمولات کے حساب سے نہیں چل سکتا ہے۔ پہاڑی علاقوں اور برفیلے علاقوں میں سطحی علاقوں کے مقابلے تعلیمی سرگرمیاں قدرے دشوار کن ہوتی ہیں۔ اسکولی ماحول اور اسکول کی تعلیمی سرگرمیاں، طلبا و اساتذہ کا شرح تناسب (Pupil Teacher Ratio) اسکولی عمارت، اساتذہ کا تدریسی طریقہ کار اور تدریسی اشیا اور کا ساز و سامان بھی ماحولیاتی عوامل میں شامل ہیں۔

5 حیاتیاتی مسائل (Biological Factors of Academic Difficulties): ایک عام بچہ ایک خاص بچے سے منفرد ہوتا ہے۔ان کے پڑھنے لکھنے کی رفتار بھی جداگانہ ہوتی ہے۔ان کے پڑھنے لکھنے کے طور طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔

(3) مخصوص ضروریات کے حامل بچوں کی ضروریات (Children with special needs) عام بچوں کی ضروریات سے مختلف ہوتی ہیں۔فطری طور پر گونگے اور اندھے بچوں کی اکتسابی صلاحیت عام بچوں سے مختلف ہوتی ہے غرض حیاتیاتی محرکات بچوں کی تعلیم کو بڑی حد تک متاثر کرسکتی ہیں۔

6 تعلیمی دشواریوں کی نفسیاتی وجوہات (Psychological Factors of Academic Difficulties): نفسیاتی وجوہات بھی طلبا و طالبات کی تدریسی واکتسابی سرگرمیوں کو بڑی حد تک متاثر کرسکتی ہیں۔ دنیا میں بہت سارے ایسے بچے بھی ہیں جو نفسیاتی مریض ہیں ایسے بچوں کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ تعلیمی دشواریوں کے بہت سارے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن یہاں پر تفصیل سے صرف اور صرف تعلیمی دشواریوں کا سماجی اساس کے تناظر میں تجزیہ کیا جارہا ہے۔

تعلیم وتربیت کی ترویج کے لیے معاشرے کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ معاشرے نے تعلیم وتربیت کی اشاعت وترویج میں اپنا اہم رول ادا کیا ہے۔لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ عناصر نے تعلیم کی ترویج و اشاعت میں رخنہ ڈالا ہے۔تعلیم کی فروغ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔مثال کے طور پر قدیم زمانے کے سماج کو لے لیتے ہیں وہاں پر سماج میں ایک بڑا طبقہ ایسا بھی ملتا ہے جو کمزور اور پسماندہ طبقوں کو صدیوں تک تعلیم سے محروم رکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھا۔آزادی سے قبل ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل نہیں تھے۔

عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل نہیں تھے۔ان کے لیے اسکول یا تعلیمی مراکز نہیں ہوا کرتے تھے۔ ودیا ساگر، راما بائی اور فاطمہ شیخ جیسی عورتوں کی جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں خواتین بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ ہیں۔

ہندوستان میں شمولیاتی، مفت اور لازمی تعلیم کا تصور غالباً پہلی بار قومی تعلیمی پالیسی (National Policy of Education 1968) میں پیش کیا گیا۔

ہندوستان کے طرز پر اور بھی دوسرے ممالک میں سیاہ فام لوگوں کو تعلیم وتربیت سے دور رکھا گیا۔سیاہ فام لوگوں کو بھی سفید فام کی اکثریت نے صدیوں تک تعلیم سے محروم رکھا۔

امریکی شہری حقوق کی تحریک جسے Civil American Rights Moment کہا جا تا ہے۔یہ تحریک سیاہ فام لوگوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے چلائی جانے والی ایک کامیاب اور طاقتور تحریک مانی جاتی ہے۔اس تحریک کا بنیادی مقصد (Institutional Racial Segregation) یعنی اداراتی سطح پر سفید فام لوگوں کا سیاہ فام لوگوں کے ساتھ رنگ ونسل کی بنیاد پر سماجی امتیازات، سماجی علیحدگی اور حق رائے دہی سے محرومی کا خاتمہ تھا۔

امریکی شہری حقوق کی تحریک کا ہی نتیجہ ہوا کہ کل تک جو سیاہ فام لوگوں کے لیے اسکول اور کالج کے دروازے بند پڑے تھے وہ کھل گئے۔سیاہ فام لوگوں تک تعلیم کی رسائی ہونے لگی بڑی تعداد میں سیاہ فام لوگ تعلیم یافتہ ہونے لگے۔ کچھ سماجی رسوم ورواج اور اداراتی قوانین بھی تعلیمی سرگرمیوں کو متاثر کرسکتے ہیں۔حالیہ برسوں میں فرانس نے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے طلبا و طالبات مذہبی لبادے میں کسی بھی تعلیمی مراکز میں داخل نہیں ہو سکتے ہے۔اس طرح کے قوانین کی وجہ سے روایت پسند طلبا و طالبات کا ایک بڑا طبقہ تعلیم سے محروم ہوسکتا ہے۔ دنیا میں بہت ساری قومیں ایسی ہیں جنھیں اپنے شعائر اپنی تہذیب وثقافت حد درجہ عزیز ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی ثقافت سے مصالحت کرنے کو تیار نہیں۔ بہت سارے عیسائی طلبا ایسے ہیں جنھیں صلیب سے حد درجہ عقیدت ہے وہ اسے اتار نہیں سکتے۔اس طرح بہت سارے ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے طلبا ہیں جو تلک لگانا پسند کرتے ہیں اسی طرح سکھ برادری سے تعلق رکھنے والے طلبا کے لیے پگڑی بڑی اہمیت رکھتی ہے ایسے خیالات رکھنے والوں کے لیے فرانس میں تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا۔تعلیم وتربیت کے دوران انھیں طرح طرح کے سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی تعلیمی مسائل کی سماجی بنیاد بہت پرانی ہے۔

Coeducation sysytem طلبا و طالبات کے لیے کس حد تک مفید ہے یہ ایک الگ بحث ہے اس سلسلے میں دو طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں ایک وہ طبقہ ہے جو مخلوط تعلیمی نظام کی وکالت کرتا ہے جب کہ دوسرا طبقہ اس تعلیمی نظام کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے۔ Edward Clark کا ماننا ہے کہ ''مخلوط تعلیمی نظام انسانیت اور خدا کے روبرو ایک جرم ہے''۔روشن خیال طبقہ مخلوط تعلیمی نظام کی افادیت گناتے ہوئے تھکتا نہیں۔ بہرحال جو بھی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوط تعلیمی نظام قدامت پرست گھرانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے تعلیمی دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ روشن خیال طبقے کو مخلوط تعلیمی نظام سے کوئی پرہیز نہیں ہے وہ اپنی لڑکیوں کو ایسے تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے لیے بھیجنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا وہیں پر دوسرا طبقہ قدامت پرستوں کا ہے جو اپنے لڑکیوں کو ایسے تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے لیے بھیجنے سے گریز کرتا ہے جہاں مخلوط تعلیم دی جاتی ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آج ہر مذہب میں کثیر تعداد ہی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کا تعلق قدامت پرست طبقے سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہند نے بذات خود پورے ہندوستان میں Kanya Vidyalaya کے نام سے سیکڑوں کی تعداد میں ایسے اسکول اور کالج قائم کیے جس میں صرف اور صرف لڑکیوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ دہلی میں Govt. Sarvodaya Kanya Vidayala کے نام سے بہت سارے اسکول قائم کیے گئے ہیں۔ Kanya Vidayalaya کا لڑکیوں کی شرح ناخواندگی کو دور کرنے میں اہم رول رہا ہے۔

اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی مجموعی شرح خواندگی اوسطاً قومی سطح سے کم ہے خاص کر مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیمی شرح خواندگی نہایت کم ہے۔کم ہونے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہے۔ اس میں ایک اہم وجہ سماجی اسباب بھی ہیں۔تقریبا آج بھی 50 فیصد سے بھی زیادہ مسلمان عورتیں ناخواندہ ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق 51 فیصد مسلم خواتین ناخواندہ ہیں۔ 15.14 پرائمری، 5.45 میٹرک، 1.9 انٹر، فیصد ٹیکنیکل ایجوکیشن اور 2.07 فیصد مسلم خواتین گریجوٹ ہیں۔کرناٹک ہندوستان کا ایک اہم صوبہ مانا جاتا ہے وہاں کے مسلمانوں میں شرح خواندگی بہار کے مسلمانوں سے بہتر ہے۔ وہاں کی مسلم عورتوں میں بھی شرح خواندگی بڑی حد تک بہتر ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سماجی تناظر میں تعلیمی مسائل کا مطالعہ اور ان کا تجزیہ کیا جائے تاکہ تعلیم کی ترویج واشاعت وسیع پیمانہ پر بلاتفریق قوم وملت، ذات پات اور رنگ ونسل کے ہوسکے۔ ماہرین تعلیمات کو چاہیے کہ تعلیم کو سب کے لیے آسان بنانے اور تعلیمی دشواریوں کو کم کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر اس اقدامات کیے جائیں تاکہ ہر طرح کی رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے۔

■

Mohd Shadab Alam
Research Scholar, Dept of Education & Training
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025

روہتاس
آدیباسیوں کی قدیم جائے پناہ

شمیم قاسمی

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ قلعہ روہتاس جب شیر شاہ کے تصرف میں آیا تو یہ عوام الناس میں ایک مضبوط اور محفوظ قلعے کے طور پر از حد مقبول ہوا اور تبھی سے تاریخی دستاویز کا حصہ بننے لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ صدیوں سے سورج ونشی خاندان کے راجہ ہرش چندر کے شہزادے روہتسوا کے نام سے یہ منسوب رہا ہے اور رواں صدی میں بھی اپنی نمایاں پہچان رکھتا ہے۔ قلعۂ روہتاس پر راجہ روہت یا روہتسوا (Rohitasva) کی مدت حکمرانی کا کوئی واضح منظر نامہ نہیں۔کوئی شہادت نہیں ملتی۔ دراصل اس کی تاریخ بڑی پیچیدہ ہے۔

زمانۂ قدیم سے کیمور کی سُرمئی پہاڑیوں کے دامن میں بسے علم وعرفان،صوفیوں سنتوں اور حکمرانوں کے شہر سہسرام کی تاریخی وتہذیبی اور ثقافتی اہمیت رہی ہے۔اس شہر سیف وقلم کی شہرت کا ایک اہم سبب تو یہ ہے کہ یہ شہنشاہِ وقت یعنی ہندوستانی حکمراں شیر شاہ کی جائے پیدائش ہے علاوہ ازیں دیگر سلاطین سوری کی جنگی فتوحات، عادلانہ نظامِ حکومت (کل مدت تخت شاہی 15 سال) اور ان کے عروج وزوال سے منسوب ہے۔اسی تاریخی سرزمین کی گود میں پرورش پاکر سوری سلطنت (Suri dynasty- 1540-55) کے بنیاد گزار شیر شاہ سوری کے حوصلے جوان ہوئے۔اپنی کم عمری میں ہی جوانمردی کے جوہر دکھانے کے لیے شیر شاہ نے کیمور کی دیو قامت پہاڑیوں، چٹانوں، پہاڑی نالوں، خاردار اور ریتیلے راستوں کو عبور کرنے کا نہ صرف ہنر سیکھا، اپنے قوتِ بازو کا مظاہرہ کیا، چھاپہ مار دستے بنائے، جنگی حکمت عملی سیکھی، بلکہ ایک چھوٹے سے شہر میں رہ کر پورے ہندوستان کو تسخیر کرنے کا خواب بھی اپنی پلکوں پہ سجونے لگا۔وہ یہ بھول گیا کہ اس کا باپ حسن شاہ سوری ایک معمولی جاگیردار ہے اور جس کا دائرہ عمل سہسرام، چاند اور خواص ٹانڈہ وغیرہ تک محدود ہے۔اپنی زندگی کی اول معرکہ آرائی کے دنوں میں اس نے بنگال (گوڑ) جس میں موجودہ ریاست بہار بھی شامل تھی، کو اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور جنگی حکمت عملی سے اپنے زیر نگیں کرلیا تھا۔کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں مختلف علاقوں کو فتح کرنے کے بعد شیر شاہ نے 1539 میں سہسرام شہر سے دور، وادیِ کیمور کی سطح زمین سے تقریباً ڈیڑھ ہزار فٹ کی بلندی پر سطح لب دریائے سون ایستادہ، ناقابل عبور ایک قدیم قلعے کو اپنے زور بازو اور محاذ جنگ میں رائج چالاکیوں کے بل بوتے پر فتح کرلیا۔کہتے ہیں کہ 1525 میں مقبرہ حسن شاہ سور کی تعمیر ہوئی اور اس کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی 1526 میں بابر نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔بہرحال 1525-30 کے آس پاس شیر شاہ کی خود مختار حکومت کا جھنڈا اس علاقے میں لہرانے لگا تھا۔ 1538-39 میں جس قلعے کی مضبوط گھیرا بندی شیر شاہ نے کرائی۔اسی قلعے کا معروف نام ہے 'روہتاس فورٹ' (Rohtas fort) جو عوام الناس میں روہتاس گڑھ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مذکورہ قلعے کو شیر شاہ نے کس راجہ سے حاصل کیا تھا،یعنی شیر شاہ سے قبل اس پر کس راجہ کا اختیار تھا؟ کیونکہ اس کی کوئی مستند تاریخ نہیں ملتی۔البتہ یہ روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہے کہ یہ قلعہ کسی راجہ کے بیٹے روہت یا روہتاسوا (Rohtasva) کے نام پر قائم ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کی عوامی مقبولیت عہد شیر شاہی میں ہوئی۔کچھ لوگ موروثی روایت کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ روہت ستیہ وادی راجہ ہریش چندر کی اولادوں میں تھا۔اس قلعے کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے کی گئی مضبوط تعمیر سے شیر شاہ حد درجہ متاثر تھا۔اس کی ذہنی وفکری وابستگی اس حد تک شدید رہی کہ جب دریائے جہلم کے کنارے (پاکستان) 1542 میں اس نے حیرت انگیز اور ایک ناقابلِ عبور قلعے (Castle) کی بنیاد رکھی تو اپنے ہم

وطن روہت کے نام پر اس قلعے کا نام بھی قلعۂ روہتاس رکھا۔روہتاس گڑھ، سہسرام بہار برٹش دور حکومت میں 'روہتاس فورٹ' کے نام سے جانا جانے لگا تھا۔اسی زمانے میں حکومت برطانیہ کے ایک آئی۔سی۔ایس آفیسر قدرت اللہ شہاب کی تاریخی شہر سہسرام میں ایس ڈی او کے عہدے پر پوسٹنگ ہوئی تو انہوں نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'شہاب نامہ' (سوانحی ڈائری) میں روہتاس فورٹ اور سہسرام کی ایک جھلک دکھلائی ہے، جس کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس زمانے کے قلعۂ روہتاس کو سیر سپاٹے کا مرکز یا تفریح گاہ کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔یہاں آس پاس کی شکار گاہیں اور گھاٹیاں بڑی خطرناک اور پُر فریب ہیں۔

یہ غارِ شیر ہے کیمور کی پہاڑی ہے
یہاں ابھی بھی بھیانک بہت درندے ہیں

'شہاب نامہ' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اُن دنوں فرانسس موڈی صوبہ بہار کے قائم مقام گورنر مقرر ہو کر نئے نئے آئے تھے۔انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کرسمس منانے کے لیے روہتاس فورٹ کو منتخب کیا۔سہسرام سے کچھ دور ایک دشوار گزار پہاڑی پر گھنے جنگلات میں گھرا ہوا یہ پُر فضا مقام تھا، جس کی تسخیر کے لیے شیر شاہ سوری اور راجہ روہتاس کے درمیان جنگی معرکوں کے عجیب و غریب افسانے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے اپنے رنگ میں مشہور تھے۔انگریز افسروں میں یہاں کی شکار گاہیں بڑی مشہور تھیں اور صوبے کا گورنر ہر دوسرے تیسرے سال یہاں کرسمس کیمپ لگایا کرتا تھا.....اس کیمپ کے عموماً انچارج عبدالکریم خان صاحب (ڈپٹی کلکٹر) ہوا کرتے تھے......صوبائی گورنر یا دوسرے بڑے افسر روہتاس فورٹ میں کیمپ لگاتے تھے۔شکار کھیلتے تھے اور کچھ گفتنی اور ناگفتنی دادِ عیش دے کر ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے تھے۔" (بحوالہ شہاب نامہ، ص 202)

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہندوستان کے قدیم قلعوں میں سے یہ ایک عجوبہ اور مضبوط قلعہ ہے۔ 1857 کے غدر کے زمانے میں بابو ویر کنور سنگھ کے بھائی امر سنگھ اور خانوادۂ مرزا دلدار بیگ کے سپوت دلاور خان وغیرہ نے اسی قلعے میں محفوظ رہ کر ملک کی آزادی اور انگریز بھگاؤ تحریک کو جلا بخشی تھی۔اس گڑھ پر اراؤں اور کھروار راجاؤں کے درمیان زمانۂ قدیم میں زورِ بازو کا مظاہرہ کیا گیا پھر عہد شیر شاہی سے عہد اکبری تک اپنی اپنی بالا دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں بے دریغ انسانی خون بہائے گئے اور پھر آزادی کے متوالوں نے بھی کئی خون ریز جنگیں لڑیں۔کہتے ہیں کہ روہتاس گڑھ کی سنگلاخ دیواروں سے آج بھی خون ٹپکتا ہے اور راجہ روہتاس کی بے چین روح بھٹکتی ہے۔شیر شاہ نے 1539 میں تقریباً دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر کو اسی محفوظ قلعے میں رکھا۔کئی مضبوط عمارتیں تعمیر کرائی گئیں۔مقبروں کے علاوہ یہاں سرنگیں بھی بنوائیں جس کا ایک سرا شیر گڑھ تک جاتا تھا۔عہد شیر شاہی کے ایک وفادار جنرل ہیبت خاں نامی نے روہتاس گڑھ میں ایک خوب صورت مسجد کی بنیاد رکھی، جسے شیر شاہی مسجد کہا جاتا ہے۔بیرون قلعہ حبش خاں نیازی کا مقبرہ، صوفی سلطان بلاول شاہ کا مقبرہ، لال دروازہ کے آثار و باقیات عہد شیر شاہی کے ہیں۔شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اس کے نورتنوں میں سے ایک رتن جنرل مان سنگھ بھی یہاں بحکم بادشاہِ وقت قابض ہوا۔جس نے روہتاس گڑھ قلعہ کی از سر نو تعمیر کرائی۔(سہسرام کا نورتن بازار اسی کے نام پر ہے) اور حسب ضرورت کئی شاہی عمارتیں بنوائیں جن میں آئینہ محل، تخت شاہی، کچہری، حمام، رانی محل، راجپوتانہ طرز کی چھتری کے ساتھ 84 زینوں والا مندر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس قلعے کی فصیل جو تقریباً چودہ کوس تک پھیلی ہے وہ عہد شیر شاہی کی دین ہے۔

نیلگوں آسمان کا بوسہ لیتی ہوئی کیمور کی پہاڑی کے دامن میں راجہ مان سنگھ نے اپنے ہر دل عزیز حکمراں بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے نام پر اس بستی کا نام اکبر پور رکھا جو آج بھی آباد ہے۔اس بستی کے آس پاس کئی منہدم ہوتے ہوئے تاریخی مقامات، عبادت گاہیں اور دیگر آثار قدیمہ دیکھے جا سکتے ہیں جو بلاشبہ اکبر پور بستی کے شاندار ماضی کی یادوں، وراثتی سرمایوں کو تازہ کرتے نظر آتے ہیں، ساتھ ہی فکر و فن کی سطح پر ہماری توجہ کا مرکز بھی بنتے ہیں۔بطور نمونہ ایک نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔دبستان شاہ آباد/سہسرام کے معروف بزرگ شاعر اردو مدرس اوج اکبر پوری نے اپنی اس یادگار تاریخی پس منظر کی نظم میں 'روہتاس فورٹ' کو موضوع سخن بنا کر اس کے عروج و زوال کو مؤثر ڈھنگ سے اجالا ہے۔میرے خیال سے قلعۂ روہتاس پر اتنی خوب صورت، خرد افروز نظم شعرائے سہسرام نے آج تک نہیں لکھی۔

قلعۂ روہتاس اے دیرینہ عظمت کے نشاں
وادیِ کوہسار میں کیمور کا ہے پاسباں
ہر کشن کے دور میں آیا یہاں جب شیر شاہ
فخر ہے تجھ کو بنا سلطان کی جائے پناہ
تجھ کو بخشیں عظمتیں اکبر نے اور اپنا جمال
حسن بخشا شہ جہاں نے اور صنعت کا کمال
عشق کا گنگ و جمن ہے حسن کا سنگم ہے تُو
قلعۂ روہتاس کیوں میرا شریکِ غم ہے تُو
وقت کی ہے بات کہ اب تُو کھنڈر سا ہو گیا
پھر بھی سورج کی طرح روشن ہے ہر ذرّہ ترا
مان سنگھ جو اک سپہ سالارِ اعظم تھا یہاں
دل دیا اس نے تجھے اپنا بنایا رازداں
بادشاہوں نے ہی چاہا ہو فقط ایسا نہیں
اولیا و اتقیا کا بھی رہا مرکز یہیں

کہتے ہیں کہ شیر شاہ کے ایک جنرل عیسیٰ خاں نیازی ابن ہیبت خاں نیازی کو اس سرزمین سے خاص نسبت رہی ہے جنہوں نے دہلی میں ایک ایسے مقبرے کی بنیاد رکھی جسے دور سے دیکھتے ہی آپ کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو سہسرام کے حسن شاہ سور کا روضہ ہے، جو عوام الناس میں 'سوکھا روضہ حسن شاہ' معروف ہے۔تاریخ سلاطین اور اپنے اسلاف کے تعمیراتی نمونوں کا معائنہ مقصود ہو تو جب کبھی دہلی جائیں، ہمایوں کے مقبرے میں داخل ہونے سے پہلے دائیں جانب اس کا دیدار کر سکتے ہیں۔سند رہے کہ ہمایوں کے مقبرے سے بیس سال پہلے ہی اس کی تعمیر ہو چکی تھی۔

زمانۂ قدیم میں روہتاس گڑھ پر آدی باسیوں کی رہائش گاہیں (کھوہ) رہی ہیں جنھیں ان کی وراثت و ثقافت کا پہلا مرکز و منبع کہا جا سکتا ہے۔ بہار تھرو ایج (Bihar through Age) کے مصنف و تاریخ داں آر آر دیواکر کے مطابق اوراؤں جاتی کے قبائل جن میں چیرو، کھروار وغیرہ نمایاں قبیلے آباد رہے ہیں، ان کی ایک بڑی تعداد روہتاس گڑھ سے بختیار خلجی کے لشکر میں شامل ہو کر چھوٹا ناگ پور یا جھارکھنڈ کے پہاڑی، جنگلی علاقوں میں منتقل ہو گئی تھی۔زمانہ گزرنے کے ساتھ روہتاس گڑھ کے ان قدیم خاندانوں کی موروثی تہذیب و شناخت بھی گم ہوتی گئی۔اب اتنا تو تسلیم کیا ہی جا سکتا ہے کہ اُوراؤں یا مذکورہ آدی باسیوں کے آبا و اجداد کا مسکن (Origin) یہی روہتاس گڑھ رہا ہے۔اسی گڑھ پر زمانۂ قدیم میں بودھ مت کے مبلغین کی آمد و رفت کا سراغ ملتا ہے۔کہتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی میں کھروار کے راجاؤں کی حکومت تھی۔"اس نسل کی بہار کے شاہ آباد والے علاقوں پر حکمرانی تھی۔پہلا راجہ نریش جس کا لڑکا رن دھول اور پوتا پرتاپ دھول ہوا۔پرتاپ دھول کے کئی شیلیکھ اس علاقے میں دستیاب ہوئے ہیں۔"
(ویکیپیڈیا)

یہ حقیقت پسندانہ اظہار ہے کہ ان آدی باسیوں کی جبلت و فطرت میں 'بھلے مانس' ہونے کے عناصر آج بھی پائے جاتے ہیں جنھیں دور سے ہی اور کبھی دوران گفتگو ان کی سادہ لوحی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔بقول ضلع

روہتاس کے نمائندہ تاریخ داں شیام سندر تیواری ”روہتاس گڑھ کے راجہ روہت (روہتاسوا) نے ایک جن جاتی (اوراؤں قبیلہ) مہیلا سے بیاہ رچالیا تھا۔“ شاید اسی بنا پر آدی باسی سماج کا کہنا ہے کہ روہتاس گڑھ کا یہ قلعہ ان کے پُروجوں (Ancestors) کا ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ راجہ کے وقت میں تقریباً اٹھارہ ہزار کی تعداد میں وہ تھے۔ اس سماج کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کے آباواجداد کی جڑیں انہی پہاڑیوں اور فورٹ سے نمو پذیر ہوئی ہیں۔ کھروار سماج کی بعض اہم سیاسی وسماجی شخصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے شریمتی وندنا وجے پرساد نے اپنی کتاب ’The great Kharwar‘ کی تقریب اجرا (ہندی بھون، نئی دہلی) کے موقع پر اس کا انکشاف کیا تھا کہ رام گڑھ کے راجہ پریوار بھی کھروار جاتی کے ہیں۔ کھرواروں کا ایک شاندار ماضی رہا ہے۔ پکوڑی لال کول (ایم پی، سون بھدر) نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے بتایا کہ یہ سماج کے پچھڑے، مالی طور پر خستہ حال اور اَن پڑھ لوگوں کی داستان ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ آج کے پڑھے لکھے معاشرے میں آدیباسیوں کے حقوق کا تحفظ ہو، ان کی وراثت کی شناخت ہو۔ یہی بھارت کے مُول نواسی ہیں۔ جھارکھنڈ کی کھروار جاتی خونخوار کہلاتی ہے۔ ان کا مُول استھان روہتاس، بہار ہے۔ (بحوالہ دلی درپن سماچار)

زمانہ قدیم میں اوراؤں قبیلہ میں ہی راجہ چیرو اور کھروار کی حکومت تھی جس کا ڈاکٹر فرانسسکا کو بُور نے بھی اپنی کتاب ’اوراؤں کی اتہاسک وراثت روہتاس گڑھ‘ میں کسی حد تک ذکر کیا ہے۔ آدی باسی سماج اب دھیرے دھیرے اپنی قدیم تہذیب وثقافت اور اپنے گم شدہ ماضی سے جڑے بہت سارے حقائق سے پردہ اٹھانے کا جتن کرنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اپنی وراثتوں اور قبائلی روایتوں کو تازہ کرنے کے لیے ہر سال روہتاس فورٹ پر ماگھ پورنیما میلہ بھی لگنے لگا ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے بہار اور بیرون بہار یعنی بطور خاص پلاموں، جھارکھنڈ ریاست کے قرب وجوار سے آدی باسیوں کی ایک قابل ذکر تعداد اس میلے میں شامل ہوتی ہے۔ قلعے کے مین گیٹ (Hathia Pol) جس کی تعمیر 1597 میں ہوئی، کے قریب ایک درخت جسے ’کرم کا پیڑ‘ کہا جاتا ہے اس کے اطراف باری باری چکر لگایا جاتا ہے، پوجا کی جاتی ہے، آدی باسی رقص وسرود کی محفلیں سجتی ہیں، دعائیہ کلمات پڑھے جاتے ہیں۔ یوں اپنی مذہبی آستھا اور وشواس کو صیقل کیا جاتا ہے۔ مذکورہ سماج روہتاس گڑھ کو آدی باسیوں کا گڑھ کہنے پر فخر محسوس کرتا ہے اس کا ایسا ماننا ہے کہ ہمارے پُرکھے صدیوں پہلے صرف گھنے جنگلوں میں ہی نہیں رہتے تھے بلکہ انھوں نے پتھروں کی مضبوط پناہ گاہیں اور محلات بھی بنائے تھے۔ ان کا ایسا کہنا ہے کہ پلاموں میں بھی ’چیرو‘ یعنی آدیباسی راجہ کا ہی قلعہ ہے، جو اب کھنڈر میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آدی باسی سماج کا یہ یقین کامل ہے کہ ان کے پُرکھوں کا تعلق کئی واسطوں سے راجہ روہت سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو دہائی سے یعنی اکیسویں صدی میں آدی باسیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے گمشدہ ماضی اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے خطۂ کیمور میں صدیوں سے ایستادہ دیو ہیکل روہتاس قلعے کے اطراف کا عقیدت مندانہ چکر لگاتی رہی ہے۔

تاریخ داں بتاتے ہیں کہ اس قلعے کا قدیم راجہ روہت یا روہتاسوا کے ہی خاندان یا پُرکھوں میں سے کوئی ہوسکتا ہے جسے روہتاس قلعے کا اول بنیاد گزار تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روہت ستیہ وادی راجہ ہریش چندر کا لڑکا تھا اسے بآسانی ذہن تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ ستیہ وادی راجہ کی داستان تو میرے خیال سے Prehistoric Era یا قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ فلم راجہ ہریش چندر اور دیگر ذرائع ابلاغ (Wikipedia) وغیرہ سے معلوم ہوا کہ ستیہ وادی راجہ کا تعلق Solar clan سے ہے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل دی گئی ہے۔

" 32 generation before Rama ,Raja Satya Harish Chandra was the ruler of the Solar Clan" (Wikipedia)

کیا شیر شاہ سے قبل اس قلعے کا راجہ ہرکشن تو نہیں تھا؟ جس کا ذکر صادق سردھنوی کے تاریخی ناول ’شیر شاہ‘ میں ملتا ہے۔ بہرحال مختصر یہ کہ بعض روایتیں جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں ان سب کا کوئی معتبر حوالہ نہیں ملتا ہے۔ روایتیں زندہ ہیں لیکن کیا علاقائی روایتوں، تصوراتی داستانوں، کہانی قصوں کو ہم تاریخ کا مستند حصہ مان سکتے ہیں؟....... شہزادہ روہت کیا واقعی ستیہ وادی راجہ کا لڑکا/ جانشیں تھا؟ جس کی حکمرانی میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ ضلع روہتاس کے نوجوان مؤرخ شیام سندر تیواری (آکاشوانی سہسرام) کے اس خیال کو جدید ہندی ساہتیہ کے نامور کتھا کار، ادبی صحافی، ممتاز ترقی پسند ادیب (آنجہانی ابھئے کمار سنگھ، وکیل) نے بھی تقویت پہنچائی ہے کہ روہت (جس کے نام پر روہتاس قلعہ ہے) دراصل ستیہ وادی راجہ کا ہی لڑکا ہے۔ حسب ذیل تحریر (ہندی سے ترجمہ، بحوالہ ’چوار‘ 2015 ص 19-18) دل چسپی سے خالی نہیں ہے، قیاس آرائیاں اپنی جگہ ہیں:

”سولہویں صدی کے ہندوستانی حکمراں شیر شاہ کی بنائی ہوئی اس چھوٹی سی نگری میں داخلے کے تین راستے ہیں۔ داخلے کے ہر مقام پر مقامی میونسپلٹی ان الفاظ میں آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔ ”شیر شاہ کی نگری میں سہسرام میونسپلٹی کی جانب سے آپ کا پُرخلوص خیر مقدم ہے۔“

... ہمایوں کے ساتھ قنوج کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد شیر شاہ نے وینا ندی سے سات کیلومیٹر اور جہلم ندی سے شمال مغرب 16 کیلومیٹر (آج پاکستان) پہاڑیوں کے دوآبہ پر ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ یہ تقریباً 5 کیلو میٹر کے احاطے میں ایک عظیم الشان قلعہ ہے جس کا نام شیر شاہ نے روہت (روہتاس) قلعہ رکھا۔ آج کے پاکستان میں شیر شاہ کے ذریعے تعمیر کرایا گیا یہ روہت (روہتاس) قلعہ فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد یا ہندو مسلم بھائی چارے کا بے مثال نمونہ ہے۔ حکومت پاکستان نے روہت قلعہ پر ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا، (سند رہے کہ ہندوستانی حکومت نے بھی شیر شاہ پر ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے) اور 1997 سے اسے ورلڈ ہیری ٹیج میں شامل کیا گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ روہتشوا (روہتاس) راجہ ہریش چندر کے لڑکے تھے۔ راجہ ہریش چندر نے ایک قلعے کی (روہتاس، کیمور کی پہاڑی پر) تعمیر کرائی تھی اور اس کا نام اپنے لڑکے روہت کے نام پر رکھا جو آج روہتاس گڑھ (روہتاس فورٹ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔“

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روہتاس کا فورٹ یا قلعہ روہتاس کا شناخت نامہ زمانہ قدیم سے راجہ روہت یا روہیتشوا (Rohitashva) کے نام سے موسوم رہا ہے۔ اس علاقے کے بیشتر لوگوں کی آستھا ہے کہ سورج ونشی راجہ ہرش چندر کے لڑکے روہت کا یہ قلعہ رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کے اس عہد میں بہت کچھ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے پردۂ راز سے باہر آنے لگا ہے۔ گم شدہ ماضی کے اوراق طشت از بام ہونے لگے ہیں۔ لاشعوری طور پر بہت تیزی سے ہم سب گلوبل ولیج اور کلچر کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ اب تو ناقابل تسخیر دنیا اور صدیوں پر محیط تاریخی، تہذیبی وثقافتی، یہاں تک کہ تصاویر پر مبنی معلومات کا خزانہ ہماری یادداشت کے جنگل میں صد رنگ جلوے بکھیرنے لگا ہے۔ ہماری آنکھیں پروسے گئے جھوٹ اور سچ سے چکا چوند اور ذہن ’ہے اور نہیں ہے‘ کے جال میں گھرا ایک حیرت زا فضائے بسیط میں معلق ہے۔ اکیسویں صدی کی نئی نسل کے لیے بھی یہ حیرت انگیز اطلاع ہے کہ روہتاس فورٹ کے راجہ کا

تعلق آدی باسی قبائل سے تھا یعنی زمانۂ قدیم سے قلعۂ روہتاس کے بنیاد گزار آدیباسیوں کے خانوادے سے ہی رہے ہیں۔ایسا آدی باسی سماج کا ماننا ہے۔ان آدیباسیوں کی آستھا ہے کہ راجہ روہت اصل میں ان کے ہی پُروج ہیں۔وکیپیڈیا پر دستیاب تحریری اطلاع کے مطابق کھروار ایک قدیم جاتی (ذات) ہے جو ملک کی مختلف ریاستوں جیسے آسام، بہار، اترپردیش، جھارکھنڈ، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔یہ سورج ونشی ہوتے ہیں اور یہ سورج ونشی چھتریہ کھروار کہے جاتے ہیں۔ان کھرواروں کی تاریخ نہایت قدیم ہے،جس کا ثبوت بہار میں روہتاس قلعہ ہے جو کھروار راجاؤں کی ایک قدیم وراثت ہے۔اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ قلعہ روہتاس اس ملک کا سب سے قدیم قلعہ ہے۔اس کی تاریخ بڑی قدیم اور قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔حقیقت اور فکشن کی آمیزش نے اسے اور بھی پُراسرار بنا دیا ہے۔بہر حال مسموع شواہد اور موروثی روایتوں کو ہم اپنے عقیدت مندانہ اظہار کا ذریعہ بنانے کے لیے آزاد ہیں۔راجہ روہتسوا کے نام سے منسوب اس قلعے کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔

یہ بھی سچ ہے کہ سلطنتِ سور کی باضابطہ بنیاد رکھنے سے قبل ہی یعنی 1539 میں خودمختار حکمراں کے طور پر شیر شاہ نے اس قلعے پر اپنی حکمرانی کا پرچم لہرا دیا تھا تب اس نے اس قلعے کی نہ صرف قلعہ بندی کرائی تھی بلکہ دس ہزار سپہ سالاروں کو بھی تعینات کر دیا تھا۔اس کے ایک فوجی جنرل ہیبت خاں نیازی نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، غالبًا یہی مسجد، مسجد شیر شاہی کے نام سے معروف ہوئی۔

بعض تاریخ داں کا ایسا ماننا ہے کہ اس قلعے کو اہمیت وشہرت عہدِ شیر شاہی میں ہی ملی۔اس طرح یہ قلعہ سولہویں صدی میں ہی Limelight میں آیا۔اور پھر سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد یہ ہماری یادداشتوں کا محض ایک خوشگوار حصہ بن کر رہ گیا۔وقت کے گرد وغبار میں روپوش ہوتے ہوئے اس قلعے کی نئی بازیافت برٹش عہدِ حکومت میں ہوئی جب 1812 میں فرانسس بوکانن اور 82-1881 میں گورِک (P.W.Gauvic, Archeologist) بہ نفس نفیس قلعۂ روہتاس اور شیر گڑھ کا معائنہ کرنے آئے تب انھیں روہتاس گڑھ کے ایک راجہ کی سرکاری مہر کا سانچہ ملا۔اس کے علاوہ آثارِ قدیمہ کی مزید جانکاریاں ملیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زمانۂ قدیم سے اس قلعے کا شناخت نامہ راجہ روہتسوا کا نام لیے بغیر نامکمل ہے۔ہر چند کہ یہاں ساتویں صدی یا تریتا یگ (Treta yug) کے آثار و باقیات تو دور کی بات ہے۔دسویں، بارہویں صدی کے تعمیراتی نقوش بھی غیر واضح ہیں۔البتہ روہتاس پہاڑی پر اوراؤں، چیرو اور کھروار قبیلے کی بود و باش کا سراغ ملتا ہے۔یوں آدی باسی سماج کا یہ دعویٰ کہ ان کی اصل جڑ (Point of origin) روہتاس قلعے اور اس کی قدیم پہاڑی سے مستحکم طور پر وابستہ ہے اپنا ایک جواز رکھتا ہے۔ہر چند کہ ان کی اصل شناخت اور ذُرّیت کے گڈمڈ ہوتے ہوئے سلسلوں کا کوئی واضح شناخت نامہ بہ آسانی ترتیب نہیں دیا جا سکتا،لیکن یہ تو ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ بہار بلکہ اس ملک کے تمام آدی باسیوں کی پہچان کا ایک معتبر حوالہ مذکورہ روہتاس قلعے اور اس کے اطراف کے جنگلی پٹھاری علاقے ہو سکتے ہیں۔روہتاس قلعے کے نشیب میں سون ندی ہے اور ندی کے اُس پار دور تک پلاموں کے جنگلات ہیں۔گمان غالب ہے کہ صدیوں پہلے وقت کے بہاؤ میں اس علاقے کے آدی باسی سماج کے لوگ روہتاس پہاڑی کے اسی جانب منتقل ہوتے گئے۔کہتے ہیں کہ چیرو، کھروار جاتی سے منسلک ایک راجہ کا قلعہ پلاموں میں بھی پایا جاتا ہے۔بہر حال فی زمانہ بیشتر باشعور آدی باسیوں کے چہروں پر اپنی اصل جڑ سے اکھڑنے کا کرب عیاں ہے۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ قلعہ روہتاس جب شیر شاہ کے تصرف میں آیا تو یہ عوام الناس میں ایک مضبوط اور محفوظ قلعے کے طور پر از حد مقبول ہوا اور تبھی سے تاریخی دستاویز کا حصہ بننے لگا۔یہ الگ بات ہے کہ صدیوں سے سورج ونشی خاندان کے راجہ ہرش چندر کے شہزادے روہتسوا کے نام سے یہ منسوب رہا ہے اور رواں صدی میں بھی اپنی نمایاں پہچان رکھتا ہے۔قلعۂ روہتاس پر راجہ روہت یا روہتسوا (Rohitasva) کی مدت حکمرانی کا کوئی واضح منظرنامہ نہیں۔کوئی شہادت نہیں ملتی۔دراصل اس کی تاریخ بڑی پیچیدہ ہے۔

تاریخ روہتاس فورٹ اور پھر روہتاس کی وجہِ تسمیہ کے تناظر میں اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ہمارے بعض تاریخ داں اور مصنفین نے مذکورہ قلعے کی تعمیر کا زمانہ قلم بند کرتے ہوئے عجلت پسندی سے کام لیا ہے۔یہاں مستند معلومات کا فقدان ہے۔البتہ درج ذیل سطریں بہت حد تک سند اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں۔ہر چند کہ مختلف روایتوں اور مسموع شواہد کے زیر اثر بطورِ خاص روہتاس واسی اس قلعے کو روہت (Rohtashva) کے عہد حکمرانی کا تعمیر کردہ مانتے ہیں جو ستیہ وادی راجہ کا پُتر تھا۔لیکن ہمارے بعض تاریخ داں حقائق سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ڈی۔آر۔پاٹل کے مطابق:

" The early history of ROHTAS is obscure. According to the local legends, The Rohtas hill was named after The Rohitasva, a son of the legendary King Harishchandra. However, the Legends about Rohitasva make no mention of this area, and no pre - 7th century ruins have been found at the site.

(The antiquarian remains in Bihar(1963) by D. Rajaram Patil Pub. Kashi Prasad Jayaswal Research Institute. Bihar.)

کیمور کی پہاڑی کا یہ سدا بہار (Evergreen) سلسلہ وندھیا چل کی پہاڑیوں سے جا ملتا ہے۔اسی کے درمیانی علاقے اور گنگا کی آغوش میں قدیم روحانی شہر بنارس ہے جسے بھگوان شیو کی نگری بھی کہا جاتا ہے۔کہتے ہیں کہ کھروار راجاؤں کا تعلق زمانۂ قدیم میں بنارس کی سرحد سے لے کر بودھ گیا تک تھا۔سہسرام روہتاس کے آدم پور نامی گاؤں میں ایک زیر تعمیر مکان کے نیو کی کھدائی میں کھروار راجہ ساہس دھول دیو کے ذریعے جاری کیا گیا ایک تام پتر (Coppersheet) ملا ہے جو بارہویں صدی کا ہے۔سند رہے کہ 12ویں صدی میں سلطنت دہلی کا بگل بج چکا تھا۔کہا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی کے ابتدائی عشرے تک اُوراؤں اور کھروار ونش کے راج گھرانوں کی اس پٹھاری علاقوں پر حکمرانی رہی ہے۔یہ بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ مختلف القاب (Titles) سے اپنی اور اپنے گھرانوں کی شناخت قائم رکھنے والے (Gahadavalas dynasty) راجاؤں، نرماؤں کا سلسلۂ نسب چھتریہ ونش کو فوکس کرتا ہے۔ گیارہویں صدی سے سولہویں صدی کے آس پاس تک کھروار قبیلہ کے راجاؤں (چھتریہ) کی حکمرانی کے نقوش ملتے ہیں۔علاوہ ازیں سلطنتِ سُور سے عہدِ مغلیہ تک کے شہنشاہوں کی عظمتوں کا بکھان کرتے ہوئے کیمور کی پہاڑیوں کے یہ پُراسرار (Mythical) سلسلے اور ان کی آغوش میں بسا تاریخی شہر سہسرام روہتاس (Capital of Sur dynasty) سچ پوچھیے تو ہر صدی میں آثار و باقیات کا مخزن اور علم و آگہی کا سرچشمہ رہا ہے۔ساتھ ہی دیوی دیوتاؤں سے جُڑی آستھاؤں اور سادھناؤں کا مرکز بھی۔

اس میں شک نہیں کہ مناظر فطرت کی دل فریبی کے ساتھ سرسبز وادیِ کہسار کے درمیان ایستادہ روہتاس فورٹ پہلی ہی نظر میں دلوں کو موہ لیتا ہے۔تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی زمانۂ قدیم میں یقیناً اس کی خاص اہمیت رہی

ہوگی اور پھر کیمور پہاڑیوں کی جٹاؤں سے پھوٹتے کئی جھرنے چٹانوں کا سینہ چیرتے ہوئے روہتاس کی دھرتی کی پیاس بجھاتے ہیں اور ان کی آغوش میں ہمارے مذہبی عقائد کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ مذکورہ پہاڑی کے دامن میں ہی روحانی روشنی بکھیر رہے ہیں گپتا دھام، ماں تلا بھوانی اور قدیم ماں تاراچنڈی وغیرہ منادر، جہاں عقیدت مندوں کا ہر موسم میں میلہ لگتا ہے۔ اسی پہاڑی کی ایک چوٹی سے پھوٹتا ہے ایک ایسا آبشارِ حیات جو عوام میں 'کشش جھرنا' سے معروف ہے اور جو واقعی اسم بامسمّٰی ہے۔ ان سب کے علاوہ اسی پہاڑی کے دامن میں عہدِ مغلیہ کی ایک تاریخی عالمگیری مسجد بھی ہے۔ شہر سہسرام سے قریب تر اسی سلسلہ وار کیمور کی پہاڑی کی ایک بلند و بالا چوٹی پر آرام فرما ہیں میر حسن مدنی جن کی درگاہ 'پہاڑی چندن شہید پیر' (582ھ) کے نام سے موسوم و معروف ہے.....

عہدِ شیر شاہی میں قلعۂ روہتاس پر تقریباً 14 کیلو میٹر کی گھیرابندی کے لیے کھڑی کی گئی دیواریں، آج بھی موجود ہیں۔ بیرون قلعہ ہیبت خاں نیازی کا مقبرہ (1543) شیر شاہی مسجد اور حبش خاں نیازی کے روضے کے آثار و باقیات آج بھی موجود ہیں ہر چند کہ بے توجہی کا شکار ہیں۔ اسی قبیل کی ساری تاریخی یادگاریں دھیرے دھیرے اپنا وجود کھونے لگی ہیں۔ ان کے محراب و در جھڑنے لگے ہیں۔ جب کہ عہدِ اکبری میں راجہ مان سنگھ کے ذریعہ مذکورہ قلعے کی جو تعمیراتی و توسیعی سرگرمیاں تھیں ان کے آثار واضح طور پر آج بھی نگاہوں کا مرکز ہیں۔ اس میں شیو کا مندر یا چوراسی مندر بھی راجپوتانہ طرزِ تعمیر کا دل کش نمونہ ہے۔ دراصل کائناتی حسن کی نیرنگیاں سمیٹے یہ شاداب خطہ کیمور مان سنگھ کو دل و جان سے بھایا اور اپنے عہد حکمرانی میں واقعی قلعۂ روہتاس کے حسن میں اس نے مزید دلکشی پیدا کرنے کے لیے خوبصورت طرزِ تعمیر کے کئی نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ فنی نمونے بلاشبہ عہدِ مغلیہ اور راجپوتانہ شیلی کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ راجہ مان سنگھ کی اس قلعے سے ذہنی وابستگی اور فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس نے یہاں اپنی بیگم کے نام پر ایک خوب صورت عمارت بنوائی اور جس کا نام 'آئینہ محل' رکھا۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ قلعۂ روہتاس میں آج تک جو آثار و باقیات موجود ہیں، ان میں سے بیش تر تعلق عہد اکبری کے راجہ مان سنگھ کی حکمرانی سے ہے۔ اپنے زمانے کے معروف تاریخ داں و شاعر سید اولاد حیدر فوق بلگرامی نے راجہ مان سنگھ کی قلعۂ روہتاس پر کی گئی تعمیری سرگرمیوں کا کچھ یوں اعتراف کیا ہے:

''قلعۂ روہتاس کی قدرتی خوش منظری اور اس کی مستحکم عمارت کی کاریگری دیکھ کر راجہ مان سنگھ اس کا فریفتہ ہو گیا۔ اس نے اس کی مرمت کا فوراً حکم دیا۔ اس کی دیوار اور فصیل درست کر کے بہت بڑا اور اونچا و عالیشان دروازہ بنوایا۔ عماراتِ قلعہ کے اندر راجہ نے اپنے رہنے کے لیے متعدد مکانات بنوائے۔ دربار عام کا کمرہ بڑا طویل و عریض تعمیر کروایا۔ ان تمام محل و مکانات کو قیمتی اور نفیس سامانوں سے سجا دیا۔ غرض کہ ہر طرح راجہ مان سنگھ نے قلعۂ روہتاس کی قدرتی خوش منظری میں اپنی خوش پسندی اور حسن انتظامی سے بہت کچھ قابل قدر اضافات کر کے اس کی شان و شوکت کو اعلیٰ اور اس کی قدر کو دوبالا کر دیا۔ جو آج تک راجہ کے نام کو دنیا کی زبان پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس قلعے کے آثار قدیمہ میں جو کچھ بھی باقی رہ گیا ہے اور اس وقت تک پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر راجہ مان سنگھ کی یادگار ہے۔''

(تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ و بہار، مطبوعہ 1915)

یہ کوئی مبالغے کی بات نہیں کہ قلعہ روہتاس ہمارے ملک کا سب سے قدیم اور میلوں تک پھیلا ہوا ایک نہایت ہی حیرت انگیز اور مضبوط قلعہ ہے جس کے سینے میں ہماری تاریخی روایت و ثقافت، بہادری، جنگجوئی اور جاہ و جلال کی ان کہی کہانیاں (Untold stories) دفن ہیں۔ یہی وہ تاریخی قلعہ ہے جس میں عہدِ مغلیہ کا ایک شہزادہ خُرم اپنے باپ (شہنشاہِ وقت جہانگیر) سے کسی بات پر ناراض ہوا تو باغی بن کر اپنے تحفظ کے لیے اسی قلعے کی پناہ میں آیا۔ دوسری دفعہ ارجمند بانو سے شادی کے بعد کسی جنگی معرکہ آرائی میں پسپا ہو کر وہ قلعۂ روہتاس میں وارد ہوا۔ گویا اس قلعے کو وہ اپنی محفوظ پناہ گاہ تسلیم کر چکا تھا۔ اسی درمیان ارجمند بانو (ممتاز محل) نے ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام مراد بخش تھا۔ گردشِ وقت نے ایک دن اسی شہزادہ خرم کو سلطنت مغلیہ کا تاج پہنایا اور پھر وہ ہماری تاریخ میں پانچویں شہنشاہ مغلیہ سلطنت کے طور پر متعارف ہوا جسے دنیا شاہ جہاں (شہاب الدین محمد خرم- عہدِ حکومت 58-1628) کے نام سے جانتی ہے، جس کے عہد میں فن تعمیر کے عمدہ نمونے پیش کیے گئے، جو آج بھی ہماری جمالیاتی حس اور ذوق لطیف کو بیدار کرتے ہیں، ان میں تاج محل کو اولیت حاصل ہے۔

بہر حال ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ عہدِ اکبری سے عہدِ شاہ جہانی تک بطور حکمراں راجہ مان سنگھ کی اس قلعے کی باگ ڈور سنبھالنے تک وادیِ کیمور میں جشن چراغاں کا ماحول رہا ہوگا۔ راجہ مان سنگھ یہاں کی آب و ہوا اور مناظر فطرت سے حد درجہ متاثر رہا ہوگا۔ مذکورہ قلعہ اور اس کے اطراف کی من موہک پہاڑیوں نے یقیناً شہزادہ خرم کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا ہوگا جبھی تو وہ اپنے والد شہنشاہ جہانگیر کے بعض احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے باغیانہ تیور کے ساتھ قلعۂ روہتاس کا رُخ کرتا ہے۔ یہاں نہ صرف اسے تحفظ ملتا ہے بلکہ اس کا ذہنی خلفشار بھی قلعے کے اطراف میں بکھری خوش منظری سے خوشگواری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شہنشاہ وقت شاہ جہاں کا بحیثیت شہزادہ خُرم قلعۂ روہتاس کم از کم دوبارہ آنا تاریخ میں درج ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قلعۂ روہتاس کی بنیاد کا پہلا پتھر کھروار راجاؤں کے دورِ حکومت میں ہی رکھا گیا اور اس کی وجہ تسمیہ راجہ روہت سے ان سب کی عقیدت کا والہانہ اظہار ہے۔ ان راجاؤں کا خاندانی سلسلہ (Shashanka Kharwar dynasty) اس قبیلے سے جا ملتا ہے جسے فی زمانہ ہم راجپوت یا چھتریہ نسل کہتے ہیں۔ غالباً اسی نسل کے آخری حکمراں راجہ ہرکشن کا قلعۂ روہتاس پر تصرف تھا۔ جو 1539 عیسوی صدی میں شیر شاہ کی جنگی حکمت عملی سے مسلوب الاختیار ہوا۔ اس کے ٹھیک تین سال بعد 1542 میں شیر شاہ نے بھی اپنے وطن سہسرام روہتاس میں ایستادہ قلعۂ روہتاس اور راجہ روہت کی یاد کو تازہ دم کرتے ہوئے اپنی وسیع القلبی اور وسعت نظری کا مظاہرہ کیا۔ گویا 1947 کے پہلے تک کے ہندوستان کا یہ دوسرا قلعہ روہتاس جو اَب پاکستان میں دریائے جہلم کے کنارے ایستادہ ہے۔ وہ جو عہدِ شیر شاہی کی تعمیرات و عجائبات یعنی سلطان الہند شیر شاہ کے نظامِ عدل کی عمدہ مثال پیش کر رہا ہے۔ البتہ قلعۂ روہتاس (بہار) کا حقیقی معمار جو بھی رہا ہو لیکن اس کا آخری تاجدار یا راجہ ہرکشن ہی تھا جس کا شجرۂ نسب ان ہی کھرواری راجاؤں سے نسبت رکھتا ہوگا جو روہتاس پہاڑی سے پندرہ ہزار فٹ نشیب میں بہتے دریائے سون کے کنارے آباد جیلا پلاموں (جھارکھنڈ) کے اطراف میں زمانۂ قدیم سے مسندِ حکمرانی پر جلوہ افروز رہے ہیں۔

جا کے لایا آسماں سے یہ زمینِ سنگلاخ
ہو گئی حل میری مشکل قلعۂ روہتاس پر

(ظفر علی خاں)

■

Shamim Qasmi
Sector D, Shershah Street,
New Azimabad Colony
Patna- 800006 (Bihar)
Mob.: 9304009026

اردو کے معروف ادیب
ڈاکٹر شکیل احمد سے ادبی گفتگو

ظہیر حسن ظہیر

ڈاکٹر شکیل احمد کا شمار اردو کے بہترین ادبا میں ہوتا ہے۔ موصوف اردو کے بے لوث خادم ہیں، اور تقریباً چار دہائی سے زبان و ادب کی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ موصوف نے کئی نثری اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک ان کی ایک درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی' یہ ان کی پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔ مئو ناتھ بھنجن کی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے تعلق سے ان کی اہم کتاب 'مئو شہر ہنروراں' شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔ 'نشاط قلم' اور 'طرازِ قلم' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ دو خاکوں کے مجموعے 'سمٹتا سائبان' اور 'بادل چھائوں' شائع ہوکر اردو قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ 'حساب جاں' کے نام سے ان کی خود نوشت سوانح بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ 'سفر کی خوشبو' ان کا سفرنامہ ہے۔ 'کتاب یاری' اور 'مٹھی بھر خطوط' بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ ابھی ان کا قلم رواں ہے، کئی کتابوں کی اشاعت کے امکان روشن ہیں۔ ڈاکٹر شکیل احمد نثر بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت آسان زبان کا استعمال کرتے ہیں تاکہ اردو کا عام قاری بھی ان کی تحریر سے مستفیض ہوسکے۔

ظہیر حسن ظہیر: آپ کی اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے تعلق سے گفتگو کا آغاز مناسب معلوم ہوتا ہے۔ قاری کو کیا بتانا چاہیں گے؟

شکیل احمد: اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے بارے میں اپنی خودنوشت سوانح 'حسابِ جاں' میں اہم باتیں ذکر کردی ہیں۔ پھر بھی آپ کے سوال اور قاری کی واقفیت کے لیے عرض کردوں کہ سرٹیفکٹ کے مطابق میری پیدائش 6 جنوری 1953 کو مئوناتھ بھنجن کے ایک دستکار کنبے میں ہوئی۔ مشکل حالات میں تعلیم پائی، یہاں تک کہ کسی مرحلے پر شخصی اور سرکاری وظائف نے میری تعلیم کی راہ آسان کردی۔ میں نے بغدادی قاعدہ سے جامعہ مفتاح العلوم کی شاخ ڈومن پورہ سے جس تعلیم کا آغاز کیا تھا، وہ دارالعلوم مئو سے امتحان منشی، مسلم انٹر کالج سے ہائی اسکول، ڈی اے وی انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ، ڈی سی ایس کے پی جی کالج سے بی اے، شبلی نیشنل کالج (اعظم گڑھ) سے ایم اے اور گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے ساتھ مکمل ہوئی۔ حالانکہ مکمل تو اب بھی نہیں ہوئی، پوری زندگی سیکھنے اور طالب علم بنے رہنے میں ہی اچھا لگتا ہے۔

ظ ح ظ: میں نے آپ کی خودنوشت سوانح 'حسابِ جاں' پڑھی ہے، آپ نے اس میں کہیں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا ہے کہ لکھنے کی ترغیب کہاں سے ملی، اور آپ نے لکھنا کب شروع کیا؟

ش ا: لکھنے کی ترغیب مدرسے میں استاذی ڈاکٹر انیس ادیب اور منشی ممتاز احمد صاحب نے دی۔ جملوں میں استعمال، اشعار کا مطلب اور کسی عنوان پر مضمون گھر سے لکھ کر لانے سے اس کا آغاز ہوا۔ جملوں کو جوڑنے اور اپنی بات کو ترتیب سے لکھنے کے بعد اساتذہ کی شاباشی سے حوصلہ ملا۔ یہ سلسلہ کالج میں پروان چڑھا۔ ایم۔اے اردو کے لیے بہت سے نوٹس میں نے معاون کتابوں سے تیار کیے۔ جو نوٹس اساتذہ نے لکھوائے ان سے بھی رہنمائی ملی، اور جب گورکھپور یونیورسٹی میں 'اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی: ابتدا سے 1947 تک' کے عنوان سے مقالہ لکھنا شروع کیا تو اللہ کا شکر ہے کہ پہلا جملہ اور پہلا اقتباس لکھتے وقت کوئی تذبذب یا کشاکش نہیں پیدا ہوئی۔ جس خوداعتادی کے ساتھ مقالے کا پہلا جملہ لکھا، آخری جملہ لکھنے تک اس میں کہیں کمی نہیں آئی۔ کیونکہ استاذی پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے لکھنے اور لکھنے سے پہلے خوب پڑھ کر لکھنے کی جو تربیت دی تھی، اس نے درمیان میں کہیں قلم کو رکنے ہی نہیں دیا۔ مقالہ کتابی صورت میں 1984 میں منظر عام پر آیا تو مزید حوصلہ ملا۔ اس مرحلے پر ڈاکٹر اختر بستوی صاحب نے بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور متواتر لکھتے رہنے کی ترغیب دی۔ بعض ناگزیر وجوہات سے کچھ عرصہ لکھنے کا سلسلہ موقوف رہا، لیکن اللہ کا کرم ہے کہ احباب و اساتذہ کی ترغیب نے میرے قلم کو زنگ آلود ہونے سے بچالیا۔

ظ ح ظ: آپ نے فرمایا کہ آپ کا تحقیقی مقالہ 1984 میں شائع ہوا، لیکن اس کے بعد طویل خاموشی رہی، برسوں بعد آپ کی کتاب 'مئو شہرِ ہنروراں' (2012) شائع ہوئی، اس طویل وقفے کو کیا قلم کا زنگ آلود ہونا نہ سمجھا جائے؟

ش ا: آپ کا سوال بجا ہے۔ 1984 کے برسوں بعد تک میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، لیکن مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ افسوس یہ رہا کہ ابتدائی برسوں میں جو مضامین لکھے ان میں سے چند ہی شائع ہوسکے۔ کئی مضامین رسائل میں برائے اشاعت ارسال کیے، کئی بار یاددہانی کے لیے خط بھی لکھے، مگر مایوسی ہاتھ لگی۔ دس پندرہ برسوں کے دوران اٹھارہ، بیس سے زیادہ مضامین شائع نہ ہوسکے۔ ملازمت کی تلاش میں قلم بھی متاثر ہوتا رہا۔ برسوں کی جد و جہد کے بعد بھی حسب منشا کوئی تدریسی ملازمت نہ مل سکی، تو غیر علمی معاشی وابستگی کے درمیان بھی گاہے گاہے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ باقی رہا۔ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ میرے حالات نے جونہی اجازت دی قلم سے کمزور ہوتا ہوا رشتہ پھر سے مضبوط ہوگیا۔ اس دوران درجنوں مضامین لکھے جو شائع بھی ہوئے۔ مضامین کی اشاعت سے حوصلہ تو ضرور ملا، لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رسائل میں شائع متفرق مضامین اور مستقل کتاب کی اشاعت میں بہت فرق ہے۔ اس لیے وسائل کی راہ ہموار ہوتے ہی کتابوں کی ترتیب و اشاعت پر میں نے اپنی توجہ مرکوز کی، اور اللہ کا شکر ہے کہ گزشتہ بارہ برس کے دوران میری دسویں کتاب شائع ہونے جارہی ہے۔ علاوہ ازیں میرے لیے اہم بات یہ ہے کہ میرے تحقیقی مقالہ 'اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی: ابتدا سے 1947 تک' اور 'مئوشہرِ ہنروراں' کا دوسرا ایڈیشن

بھی شائع ہو چکا ہے۔

ظ ح ظ : آپ کی نظر میں گزشتہ پچاس برس کے دوران اردو کی تعلیم اور اردو قاری آج کس مقام پر کھڑا ہے۔ اردو قارئین کم ہو رہے ہیں اس کی اہم وجہ کیا ہے؟

ش ا : اپنے دیار کے تناظر میں عرض کروں گا کہ اردو پڑھنے کی شرح اور قاری کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ قدرے مایوسی بھی ہوتی ہے۔ اردو کے تعلق سے والدین کی سوچ میں تبدیلی بھی آ رہی ہے۔ خواندگی کی شرح میں اضافے کے ساتھ ابتدائی درجات میں ہی بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کر دیا جاتا ہے، جہاں اردو بطور زبان کے نہیں پڑھائی جاتی۔ کچھ والدین تو بیدار ہیں اور اپنے بچوں کی دینیات اور اردو کی تعلیم کا انتظام گھروں پر کراتے ہیں۔ انھیں میں کچھ ایسے والدین بھی ہیں جو کہ اپنے بچوں کو ان انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کرتے ہیں جہاں اردو بطور زبان کے جونیئر تک پڑھائی جاتی ہے۔ میری رائے ہے کہ اردو کی بقا اور استحکام کے لیے ان کا فیصلہ درست ہے، اس کی پیروی اور حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے، جو اپنے بچوں کو مدارس میں تعلیم دلاتے ہیں، یا جو اردو کو ایک اختیاری مضمون کے ہائی اسکول یا آگے تک تعلیم دلاتے ہیں۔ یہی بچے اور بچیاں جب گھروں اور عملی زندگی میں اردو اخبارات اور کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیں گے تو موجودہ نسل کی طرح ان کا رشتہ بھی اردو سے باقی رہے گا۔ ضرورت ایسا طریقۂ کار اپنانے کی ہے جو موجودہ فعال اردو قاری اور بہی خواہانِ اردو ہیں ان سے رابطہ رکھیں۔ ادبی پروگراموں میں انہیں مدعو کریں۔ ان کے درمیان اردو کی ضرورت اور اہمیت وافادیت پر گفتگو کرتے رہیں۔ ذہنی اور فکری طور پر انہیں مہمیز کرتے رہیں۔ اردو سے محبت کرنا سکھائیں۔ اردو اساتذہ اور معلمات کی دلچسپی سے یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔ اس کے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ پچاس برس قبل کی صورتِ حال تو پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ حالات اور مطالبات بدل رہے ہیں، اس کا اثر ہر زبان کے قاری پر پڑا ہے۔ کتابوں کے مطالعے میں کمی ضرور آئی ہے، لیکن ہم صدق دل سے کوشش کریں، عملی قدم اٹھائیں، ماتم کرنا چھوڑ کر اردو کو اپنی عملی زندگی سے جوڑیں، تاکہ اردو کی خراب ہوتی صورت حال سے بچا جا سکے۔

ظ ح ظ : آپ نے ایک دہائی تک اردو میں تدریسی خدمات بھی انجام دی ہیں، کئی تعلیمی اداروں اور اردو پڑھاؤ تحریک جیسی فعال تنظیم سے بھی وابستہ رہے ہیں، اور اپنی بساط بھر کام بھی کرتے ہیں، اپنے تجربات کی روشنی میں کیا تاثر پیش کریں گے؟

ش ا : تدریس، تعلیمی اداروں اور اردو زبان کے فروغ و ارتقا سے بھی میری دلچسپی رہی ہے، اور اب بھی ہے، لوگوں میں ایثار کے جذبے کی کمی ہے۔ ہمیں لینے والا بننے کی جگہ دوسروں اور سماج کو دینے والا بھی بننا چاہیے۔ اپنی وسعت کے مطابق اپنے کنبے کی ضرورت کی تکمیل کے بعد دوسروں کے کام آنے کا جذبہ بھی ہمارے اندر ہونا چاہیے۔ شکوہ کے بجائے شکر ادا کرنے کا مزاج ہوگا تو دوسروں کی مدد کر کے، اردو کی کتابیں خرید کر، اردو پڑھنے والے ضرورت مند طلبہ کی خاموشی سے مدد کر کے ہمیں خوشی اور اطمینان کا احساس ہوگا۔ اپنی استطاعت کے مطابق دوسروں کی اخلاقی اور مادی مدد کر کے تعلیم کو فروغ، اردو کو ترقی، اور ماحول کو خوش گوار بنانے میں حصے دار بننے کا مزاج پیدا ہو جائے، تو اس کی برکتیں یقیناً ظاہر ہوں گی۔ رہی اردو پڑھاؤ تحریک کی بات تو ہم نے اپنی بساط بھر کوششیں کیں۔ بچوں کو اردو پڑھانے، اردو اخبار خریدنے، دعوت نامے، اشتہار اور سائن بورڈوں پر اردو میں لکھوانے کا کام لوگوں کو کرنا ہے، ہم ذہن سازی کر سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں، عمل کرنا تو لوگوں پر منحصر ہے۔ مگر افسوس کہ نتائج حوصلہ افزا نہیں آ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے طریقۂ کار پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

ظ ح ظ: آپ مشاعروں کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اردو زبان کے فروغ و ارتقا اور اس کو مقبول بنانے میں مشاعروں کا اہم کردار رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ش ا : آپ ماضی بعید کی بات کر رہے ہیں۔ ماضی قریب اور دورِ حاضر میں تو شاعر حضرات دولت کمانے، شہرت پانے اور موقع مل جائے تو خلیجی ممالک اور یورپ و امریکہ میں مشاعرہ پڑھ کر اردو کی نئی بستیاں بسانے میں ضرور مصروف نظر آتے ہیں، لیکن ان کی اپنی بستیوں میں اردو کی کیا صورتِ حال ہے اس کی ان کو کچھ خبر نہیں۔ آپ کوئی مشاعرہ منعقد کر کے اردو شاعر اور شاعرات سے اردو کی خدمت کے نام پر دس کتابیں خریدوا لیں، چار رسالوں کے خریدار بنوا لیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اردو کے کتنے ہمدرد ہیں۔ زادِ راہ میں اردو کی خدمت کے نام پر دو چار ہزار کی تخفیف کرا لیں تو معلوم ہو جائے گا۔ اگر ان کو اچھا خاصا معاوضہ نہ ملے تو وہ مشاعروں میں شرکت بھی نہیں کریں گے۔

ظ ح ظ: آپ تقریباً چار دہائی سے اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے اردو کی متعدد نثری اصناف تنقید، خاکہ، انشائیہ اور سفرنامہ وغیرہ سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کو کون زیادہ عزیز ہے؟

ش ا : مجھے تو سبھی عزیز ہیں۔ عرض کر دوں کہ میں جس موضوع پر کتابیں لکھتا ہوں میرے پیش نظر میرے قاری بھی ہوتے ہیں۔ اپنا ذوق اور قاری کی پسند دونوں مد نظر ہوتے ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ قاری کو میری اکثر تحریریں پسند آتی ہیں۔ میرا ان سے رابطہ رہتا ہے۔

ظ ح ظ : شہروں، قصبوں اور چھوٹی بستیوں میں ادبی و شعری انجمنیں ہیں اور ہر ماہ شعری نشستیں بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کی نظر میں دورِ حاضر میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

ش ا : مشاعروں کے زوال کے ہم قدم، ادبی انجمنیں اور نشستیں ماضی کی طرح اب بھی فعال ہیں۔ اردو شعر و ادب کی تہذیبی آبیاری اب انھیں کے دم خم پر قائم ہے۔ کہنہ مشق شعرا بلکہ نوآموز شعرا اور با ذوق سامع ان نشستوں میں مہذب انداز میں شریک ہوتے ہیں۔ اساتذہ کے مرتبے کو پہنچ جانے والے شعرا، نوآموز شعرا کی اصلاح اور حوصلہ افزائی کر کے مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہاں سب کچھ اعزازی طور پر ہو رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کی سچی خدمت یہی لوگ انجام دے رہے ہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ شعرا کو زبان و ادب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ شعر کہنے کے ساتھ ہی اساتذہ شعرا کے کلام کو بھی پڑھنا چاہیے۔

ظ ح ظ : ڈاکٹر صاحب ایک آخری سوال۔ آپ کے لکھنے کا کوئی وقت مقرر ہے۔ آپ اتنی مصروفیات کے باجود لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کب لکھتے ہیں؟

ش ا : آپ کے اس سوال نے تو مجھے جوڑ گھٹانے پر مجبور کر دیا۔ میرے لکھنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ میری کئی مصروفیات ہیں۔ انھیں میں سے وقت نکال کر لکھتا ہوں۔ دن اور رات کی بھی قید نہیں۔ آفس، گھر اور کارخانے کی بھی قید نہیں۔ آج سے چالیس برس قبل جب ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہا تھا اس کے دو باب میں نے رنگائی کے کارخانے میں مزدوروں سے کام کرانے کے دوران لکھا۔ آج بھی ایسے ہی موقعے کی تلاش رہتی ہے۔ طبیعت میں انشراح ہے تو قلم کو روکا نہیں جا سکتا۔ دعا فرمائیں کہ یہ انشراح باقی رہے، اور قلم سے میرا رشتہ استوار رہے۔ آمین

ظ ح ظ : بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب، آپ نے اپنا قیمتی وقت دے کر مجھے انٹرویو لینے کا موقع فراہم کیا۔

ش ا : آپ کا بھی بہت شکریہ ظہیر صاحب۔

■

Zaheer Hasan Zaheer
Mughal Pura Near Masjid Zubair
Maunath Bhanjan
Distt.: Mau- 275101 (UP)
Mob: 8736992810

آزادی کے بعد ہندوستانی سنیما کے 75 سال

واثق الخیر

جب ہندوستان آزاد ہوا تو اداکاری کی دنیا پر دلیپ کمار، دیو آنند اور راج کپور کا اسٹارڈم ابھر رہا تھا۔ وی شانتارام، گرو دت، راج کپور، بمل رائے، بی آر چوپڑا جیسے فلمساز سماجی عزم کے ساتھ فلمیں بنا رہے تھے۔ اس وقت سنیما ناظرین کو آگاہ کرنے کا بہترین ذریعہ تھا کیونکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی اتنی رسائی نہیں تھی۔ سنیما کے جادوئی اثر نے ناظرین پر گہرا اثر ڈالا۔ پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائی کو ہم ہندوستانی سنیما کا سنہرا دور مان سکتے ہیں اگرچہ فلمیں تکنیکی طور پر اس وقت کمزور تھیں لیکن کہانی، اداکاری اور گیت و موسیقی پہلے سے زیادہ بہتر تھی، بہت سے فلمساز اپنی فلموں کے ذریعے عوام میں تفریح کے ساتھ شعور بیدار کرنے کا کام بھی کر رہے تھے۔

سنیما، پردۂ سیمیں پر متحرک تصاویر کا ایک سلسلہ ہے۔ جو کسی واقعے یا کہانی کو بیان کرتا ہے۔ ٹامس ایڈیسن (Thomas Edison) نے 1889 میں ایک مشین ایجاد کی جس سے متحرک تصاویر دیکھی جاسکتی تھیں۔ 1894 میں دیوار کے ساتھ پردہ لگا کر اس پر متحرک تصاویر دیکھی گئیں۔ یہ سلسلہ مقبول ہوا تو اوپین ایئر تھیٹروں اور بڑے ہالوں میں اسکرین پر متحرک تصاویر دکھائی جانے لگیں۔ یہ خاموش تصاویر کسی مربوط کہانی پر مشتمل نہیں ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ آواز شامل نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مربوط کہانیاں شامل ہونے لگیں۔ 1903 میں The great train robbery نامی فلم ایک مکمل کہانی کی صورت میں پیش کی گئی۔ دنیا کی پہلی بولتی فلم 1926 میں بنائی گئی۔

ہندوستانی سنیما 100 سال سے زیادہ پرانا ہے۔ ان سو سے زیادہ برسوں میں بہت سے لوگوں نے کئی طریقوں سے ہندوستانی سنیما میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ تاہم اگر اس سفر کے آغاز کا سہرا دادا صاحب پھالکے اور اردشیر ایرانی کو دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تاریخ کی نظر میں پہلی ہندوستانی فلم بنانے کا کریڈیٹ دادا صاحب پھالکے کو 3 مئی 1913 کو 'راجہ ہریش چندر' کی وجہ سے ملا، جبکہ اس دور میں دوسرے ہدایت کار بھی فلم بنا رہے تھے۔ راجہ ہریش چندر ایک خاموش اور سیاہ وسفید (Black & White) فلم تھی۔ اس وقت سنیما بولتا نہیں تھا۔ بولنے والا سنیما 14 مارچ 1931 میں اردشیر ایرانی کی 'عالم آرا' سے بنا۔ 1931 میں 'عالم آرا' سے فلمی جگت میں کرانتی آئی۔ فلمیں بولنے لگیں۔ اس کے ہدایت کار امپیریل فلم کمپنی کے مالک اردشیر ایرانی تھے۔ 1929 میں انھوں نے ایک بولتی امریکن فلم دیکھی جس کا نام تھا 'میلوڈی آف لائف' جوان کے لیے مثال بنی۔ وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ امریکہ گئے تین مہینے بولتی فلم کی ٹریننگ لی۔ 1930 میں فلم 'عالم آرا' کی شوٹنگ شروع کی۔ اس فلم میں اس وقت کے مشہور اسٹار پرتھوی راج کپور، ماسٹر جے رام وٹھل، زبیدہ اور ایم ڈبلیو خان نے کام کیا۔ ہندوستانی سنیما میں 'دے دے خدا کے نام پر بندے' پہلا ہندوستانی سنیما کا گیت رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اردشیر ایرانی نے ہندوستانی سنیما میں رنگ بھرنے کا کام بھی کیا۔ ہندوستانی سنیما کو 1937 میں پہلی رنگین فلم کا تحفہ دیا گیا تھا۔ فلم کا نام 'کسان کنیا' تھا۔ اپنے آپ کو 1913 سے 1931 تک لے کے جایئے اور اس جادو پر حیرت کیجیے جب چلتی پھرتی فلم بولنے لگی۔ بولنے ہی نہیں بلکہ گانے بھی لگی۔ ہندوستانی سنیما نے 1913 سے 2023 تک کئی رنگ بدلے، جہاں ایک طرف فلمیں بنانے کا انداز بدلا، وہیں دوسری طرف فلمیں دیکھنے کا انداز بھی بدلا۔ ہندوستانی سنیما کے اس سفر میں نہ صرف فلم سازوں نے بلکہ ناظرین نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا تو اداکاری کی دنیا پر دلیپ کمار، دیو آنند اور راج کپور کا اسٹارڈم ابھر رہا تھا۔ وی شانتارام، گرو دت، راج کپور، بمل رائے، بی آر چوپڑا جیسے فلمساز سماجی عزم کے ساتھ فلمیں بنا رہے تھے۔ اس وقت سنیما ناظرین کو آگاہ کرنے کا بہترین ذریعہ تھا

کیونکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی اتنی رسائی نہیں تھی۔ سنیما کے جادوئی اثر نے ناظرین پر گہرا اثر ڈالا۔ پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائی کو ہم ہندوستانی سنیما کا سنہرا دور مان سکتے ہیں اگرچہ فلمیں تکنیکی طور پر اس وقت کمزور تھیں لیکن کہانی، اداکاری اور گیت وموسیقی پہلے سے زیادہ بہتر تھی۔ بہت سے فلمساز اپنی فلموں کے ذریعے عوام میں تفریح کے ساتھ شعور بیدار کرنے کا کام بھی کر رہے تھے۔ شری 420، کاغذ کے پھول، مدھومتی، مغل اعظم، مدر انڈیا، پیاسا، حقیقت، نیچا نگر، چلتی کا نام گاڑی جیسی ثقافتی اور کلاسیکی فلمیں اس عرصے میں تیار کی گئیں۔ ہندوستانی سنیما سیاہ وسفید کی جگہ رنگین بھی اسی دور میں ہوا۔ اس دور میں فلموں کا کاروبار خوب پھلا پھولا اور بہت سے نئے سنیما ہال بنائے گئے۔

سینما تفریح کا سستا ذریعہ تھا۔ ایک ہی فلم ایک ہی شہر میں کئی بار سنیما ہالوں میں لگائی جاتی تھی۔ ستر کی دہائی کے اواخر اور اسی کی دہائی کے اوائل سے تجارتی سنیما معیار کے لحاظ سے پستی کی طرف جا پہنچا۔ ان بیس بائیس برسوں میں بننے والی زیادہ تر فلمیں متوازی اور سطحی تھیں۔ کہانی اور اداکاری کے نام پر ایکشن اور اشتعال انگیز مناظر کی بھرمار تھی۔ وی سی آر سنیما ہال کے سامنے ایک چیلنج بن کر ابھرا۔ امیر طبقے نے گھر بیٹھے وی سی آر پر سنیما دیکھنا شروع کیا۔ اس لیے اس طبقے کی پسند کے مطابق سنیما بننے لگے۔ اس دوران وی سی آر کے طوفان کی وجہ سے کئی سنیما ہال بند ہونے کے دہانے پر پہنچ گئے اور فلم ڈسٹری بیوٹر معاشی مشکلات کا سامنا کرنے لگے۔

سنیما نے ستر اور اسی کے دور میں ایک نئی شناخت بنائی۔ شیام بینیگل، مرنال سین، ستیہ جیت رے، منی کول، گووند نہلانی، کیتن مہتا، گوتم گھوش جیسے فلمسازوں نے تجارتی فلموں کے علاوہ مختلف قسم کی فلمیں بنا کر عالمی سنیما میں ہندوستان کا نام بلند کیا۔ بھلے ہی ان کی فلمیں پورے ہندوستان میں ریلیز نہ ہو پاتی ہوں لیکن یہ فلمیں فلم سوسائٹی کے ذریعے ناظرین تک پہنچتی رہیں اور ناظرین میں سینما دیکھنے کی سمجھ کو بیدار کرتی رہیں۔ یہ عمل گرچہ سست رہا لیکن آج اس کا اثر دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ہندی سنیما میں علاقائی فلموں نے بھی حصہ لینا شروع کیا۔ بنگالی، مراٹھی، ملیالم، آسامی اور دیگر زبانوں کے فلمسازوں نے بھی یادگار فلمیں دیں۔ لیکن ہندی سنیما نے اپنی پہچان کو باقی رکھا، یہ ضرور ہوا کہ اس میں علاقائی زبانیں داخل ہونی شروع ہوئیں جس کی وجہ سے ناظرین ہندی سنیما سے مزید جڑتے چلے گئے۔ 1947 سے 2000 تک ہندی سنیما کا جھنڈا بلند ہوتا رہا۔ اس دور میں ہندی سنیما میں بہترین ہدایت کار، فنکار، تکنیکی ماہرین آئے اور یادگار فلمیں دیں۔

نئی صدی شروع ہوتے ہی ہندوستانی سنیما جو اپنے کانٹینٹ کی وجہ سے زوال کی طرف جا رہا تھا، دوبارہ عروج پر پہنچ گیا۔ نئی صدی کے آغاز کو دو دہائی گزر چکے ہیں اور ان دو دہائیوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ انٹرنیٹ نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور چیزوں کو آسان بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ کچھ روایات وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑ چکی ہیں۔ ٹیکنالوجی کی تبدیلی کی وجہ

سے بہت سی چیزیں اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔ لیکن ان دو دہائیوں میں سینما زیادہ ایڈوانس ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں جب ٹی وی آیا تو سینما کو ختم تصور کیا جانے لگا تھا لیکن سینما نہ صرف مضبوطی سے کھڑا رہا بلکہ آج ٹی وی کے لیے ایک مضبوط بیساکھی ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ جب او ٹی ٹی پلیٹ فارم وجود میں آیا تو سنیما کے سامنے ایک چیلنج کھڑا تھا، لیکن اس میڈیم کو بھی سنیما کی ضرورت ہے۔ دراصل سنیما، ٹی وی سیریلز اور ویب سیریز میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ویب سیریز بھی سنیما کا ہی ایک میڈیم ہے جو ایک طویل فارمیٹ میں ہوتا ہے۔

انٹرنیٹ نے سنیما کو نئی بلندیاں دیں۔ فلموں کو معاشی طور پر مضبوط کیا۔ آج یوٹیوب کے ذریعے 50 سال پرانی فلموں سے بھی پیسہ کمایا جا رہا ہے۔ برسوں پہلے سنیما ہال فلمیں دیکھنے کا واحد ذریعہ تھے۔ ٹیلی ویژن میں فلموں پر اتنا زور نہیں تھا، لیکن گزشتہ دو دہائیوں میں سنیما دیکھنے کے کئی میڈیم نے جنم لیا ہے۔ موبائل ایک شاندار انقلاب لایا۔ ساڑھے پانچ انچ کے اس ہینڈسیٹ میں پورا سنیما ہال موجود ہے۔ انٹرنیٹ نے سنیما کو ذاتی بنا دیا ہے۔ ٹی وی پر جو بھی فلم دکھائی جا رہی ہے وہی آپ کو دیکھنی ہوتی ہے لیکن انٹرنیٹ کی وجہ سے آپ اپنی پسند کے مالک بن گئے ہیں۔ آپ جو بھی فلم دیکھنا چاہتے ہیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹی وی کی مقبولیت کم ہو رہی ہے اور انٹرنیٹ پر دستیاب سائٹس کی ڈیمانڈ بڑھ رہی ہے۔ ویب سیریز سامنے آئی ہیں۔ یہ بھی سنیما کی ایک شکل ہے۔ سنیما کو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ پروڈیوسر نے اپنے ہدف کے ناظرین کے مطابق فلمیں، ٹی وی سیریل اور ویب سیریز بنانا شروع کر دی ہیں۔ اب سنیما ہمارے لیے مختلف شکلوں میں دستیاب ہے۔

اگر ہم دو دہائی پہلے کے سنیما پر نظر ڈالیں تو سینما فارمولوں میں بندھا ہوا تھا۔ پانچ فائٹ سین، پانچ گانے، پانچ کامیڈی اور پانچ جذباتی مناظر اور فلم تیار، لیکن آج ایسی فلمیں دیکھنے والے بہت کم ناظرین ہیں۔ اب اگر فارمولا فلمیں بن رہی ہیں تو اس میں ناظرین کے لیے بہت کچھ نیا مواد دینا ہوتا ہے۔ اگر دو دہائیوں میں سنیما کے موضوعات اور ہیئت میں بہتری آئی ہے تو اس کی بڑی وجہ انٹرنیٹ ہے۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے شائقین دنیا بھر کی فلموں سے باخبر ہو چکے ہیں۔ جیسے ہی ناظرین سمجھدار ہوئے، ہندوستانی سنیما بھی سمجھدار ہو گیا۔ میرا ماننا ہے کہ اگر ہندوستانی سنیما نے پچھلی دو دہائیوں میں بہتری کی راہ لی ہے تو اس کی وجہ ناظرین کی سمجھ بوجھ اور انٹرنیٹ کا اہم کردار ہے۔ اگر دیکھا جائے تو متوازی اور کمرشیل سنیما کے درمیان کی لکیر دھندلی ہوتی جا رہی ہے۔ عام سینما برسوں پہلے بنتا تھا لیکن ان فلموں کے شو صرف بڑے شہروں میں دکھائے جاتے تھے۔ فلم سوسائٹیاں اپنے شوز کا انعقاد چھوٹے شہروں میں کرتی تھیں۔ لیکن اب ہر قسم کی فلموں کو سنیما ہال مل رہے ہیں کیونکہ ناظرین ان فلموں کو دستیاب ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مواد پر مبنی فلموں کا بازار بڑھ رہا ہے۔

آج ناظرین ستاروں کی بجائے مواد کو اہمیت

دینے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹار نے بھی مواد کے ساتھ فلمیں کرنا شروع کردی ہیں۔ انھیں یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ اگر وہ کچھ نیا نہیں دیں گے تو شائقین ان کی فلم بھی دیکھنے نہیں آئیں گے۔ عامر خان دنگل، تھری ایڈیٹس، پی کے جیسی فلمیں کرتے ہیں۔ سلمان خان بجرنگی بھائی جان کرتے ہیں یا سلطان؟ اکشے کمار ٹوائلٹ ایک پریم کتھا اور پیڈ مین جیسی فلمیں کرتے ہیں۔ دو دہائی پہلے اگر کوئی ان فلموں کا سکرپٹ لے کر ان ستاروں تک پہنچتا تو وہ انھیں فوراً باہر کا راستہ دکھا دیتے۔ چنانچہ نئی صدی میں سینما میں جو بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی ان میں سے ایک یہ تھی کہ اسٹار کی فلموں میں بھی کہانی، اسکرپٹ اور پیغامات کو اہم سمجھا جاتا تھا۔ بڑے اسٹار نے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لی کہ اگر اسے زندہ رہنا ہے تو سامعین کو کچھ الگ اور منفرد دینا ہوگا۔

اس وقت ہر کوئی روزانہ فلمیں دیکھتا ہے۔ چاہے یہ ٹک ٹاک پر آنے والی 15 سیکنڈ کی فلم ہو۔ مختصر فلمیں ہوں، ٹی وی پر دکھائی جانے والی فلمیں، او ٹی ٹی پر دکھائی جانے والی فلمیں، ویب سیریز، سینما ہال میں دکھائی جانے والی فلمیں، یوٹیوب پر دستیاب فلمیں، مختلف کمپنیوں کی لائبریریوں میں دستیاب فلمیں، ہالی ووڈ کی فلمیں، عالمی فلمیں ہوں۔ اگر آپ اس سے بھی مطمئن نہیں ہیں تو پھر بھی Tiktok جیسی ایپس موجود ہیں جہاں لوگ ویڈیو بنا کر پوسٹ کر رہے ہیں اور کچھ بہترین کام کر رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ فلمیں چاروں طرف دستیاب ہیں۔ جس کی وجہ سے ناظرین سنیما سے بہت زیادہ امیدیں لگائے ہوئے ہیں۔

اگر ہم کمرشل سینما کی بات کریں تو گزشتہ دو دہائیوں میں ایسا سینما بنایا گیا ہے جو پہلے کبھی نہیں بنا تھا۔ آنند کمار جیسے عام نظر آنے والے انسان پر بائیو پک بنی۔ بیس سال پہلے اتنے عام آدمی پر فلم بنانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ نئی صدی کا سینما ہے۔ ہمیں ایک سے زیادہ بایو پک دیکھنے کو ملی ہیں۔ سربجیت، نیتا جی سبھاش چندر بوس: دی فارگوٹن ہیرو، پان سنگھ تومر، مانجھی دی ماؤنٹین مین، نرجا، رنگ رسیا، پیڈ مین اور علی گڑھ آج کے دور کی فلمیں ہیں۔ آج کے دور میں کھیل اور کھلاڑی بھی سینما میں داخل ہو چکے ہیں اور شائقین نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ میری کوم، ایم ایس دھونی دی ان ٹولڈ اسٹوریز، بدھیا سنگھ بورن ٹو رن، بھاگ ملکھا بھاگ، چک دے انڈیا، دنگل اور 83 جیسی کھیلوں پر مبنی فلموں نے شائقین کو مسحور کیا ہے۔

اس صدی سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہیروئن پر مبنی فلمیں نہیں چلیں گی۔ اگر ہیروئن پر مبنی فلمیں بنتی بھی تو وہ انتقامی موضوع پر فلمیں ہوتیں۔ مگر یہ تصور ٹوٹنے لگا۔ تنو ویڈز منو ریٹرنز اور رازی جیسی ہیروئن پر مبنی فلمیں بھی سو کروڑ کلب میں شامل ہونے لگیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں نے ان فلموں کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ دپیکا پدوکون، کرینہ کپور، پرینکا چوپڑا، تاپسی پنو اور عالیہ بھٹ نے بھی اپنے طور پر کامیاب فلمیں دینا شروع کر دیں۔ نرجا، کہانی، تمھاری سولو، عشقیہ، بیگم جان، نو ون کیلڈ جیسیکا، مردانی، ویرے دی ویڈنگ، سات خون معاف، گنگو بائی کاٹھیاواڑی، بدلہ، پنک جیسی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ گزشتہ بیس بائیس برسوں میں راجکمار ہیرانی جیسے فلمساز نے سب سے زیادہ کامیاب فلمیں دیں۔ منا بھائی سیریز کی دو فلمیں، پی کے اور تھری ایڈیٹس کسی بھی زاویے سے کمرشل فلمیں نہیں لگتی ہیں۔ رشی کیش مکھرجی، گلزار اور باسو چٹرجی جس طرح کی فلمیں بنا رہے تھے راج کمار ہیرانی نے اسی سلسلے کو آگے بڑھایا اور کامیابی حاصل کی۔ تفریح کے مناظر میں ہیرانی نے سماج کے تلخ حقائق کو ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ ناظرین نے اسے قبول کیا اور ظاہر کیا کہ وہ ایسی فلموں کے لیے تیار ہیں۔

نئی صدی میں فلموں کی پیشکش میں بھی کافی تبدیلی دیکھی گئی۔ کہانیاں سنانے کا انداز بدل گیا ہے۔ جب ہم انوراگ کشیپ کی دیو ڈی، انوراگ باسو کی برفی، نیرج پانڈے کی اسپیشل 26، سری رام راگھون کی اندھادھن دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تکنیکی صلاحیت کی وجہ سے کہانی کو بالکل مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ رنگوں کا تال میل، سنیماٹوگرافی، ایڈیٹنگ، ساؤنڈ کا طریقہ بہت بدل گیا ہے۔ اگرچہ مواد اب بھی ٹیکنالوجی پر بھاری ہے اور یہ ہمیشہ ہونا چاہیے کیونکہ مواد کے بغیر سنیما کی روح مر جاتی ہے۔

ہندی اور علاقائی زبان کے سنیما کے درمیان فاصلہ بھی کم ہوا ہے۔ آج ساؤتھ انڈین اسٹار فلمیں جیسے پربھاش، الو ارجن، یش، رام چرن تیجا، جونیئر این ٹی آر جیسے جنوبی ہند کے ستارے کی فلم باہوبلی، کے جی ایف، آر آر آر، پشپا کے طور پر پورے ہندوستان میں کامیابی ملتی ہے۔ ان فلموں کی ریلیز ہندی فلموں کی طرح ہوتی ہے۔ ملٹی پلیکس کا بھی اہم کردار ہے۔ ملٹی پلیکس کی متعدد اسکرینوں کی وجہ سے ہندی بولنے والے علاقوں میں دیگر زبانوں کی قابل ذکر فلمیں بھی دکھائی جارہی ہیں اور اس کی وجہ سے اچھی فلموں کی تلاش میں بھٹکنے والے شائقین کی پیاس کسی حد تک بجھ جاتی ہے۔

> سنیما نے ستر اور اسی کی دور میں ایک نئی شناخت بنائی، شیام بینیگل، مرنال سین، ستیہ جیت رے، منی کول، گووند نہلانی، کیتن مہتا، گوتم گھوش جیسے فلمسازوں نے تجارتی فلموں کے علاوہ مختلف قسم کی فلمیں بنا کر عالمی سنیما میں ہندوستان کا نام بلند کیا، بھلے ہی ان کی فلمیں پورے ہندوستان میں ریلیز نہ ہوپاتی ہوں لیکن یہ فلمیں فلم سوسائٹی کے ذریعے ناظرین تک پہنچتی رہیں اور ناظرین میں سینما دیکھنے کی سمجھ کو بیدار کرتی رہیں، یہ عمل گرچہ سست رہا لیکن آج اس کا اثر دیکھنے کو مل رہا ہے، ہندی سنیما میں علاقائی فلموں نے بھی حصہ لینا شروع کیا۔

آج کا سنیما حقیقت کے قریب تر ہے۔ ناظرین اب نامکمل کرداروں کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ فلمیں روایتی ناظرین اور نئے شائقین میں توازن رکھ کر بنائی جا رہی ہیں۔ ٹی وی روایتی ناظرین کے لیے پروگرام بنا رہا ہے اور ویب سیریز نئے شائقین کو راغب کر رہی ہیں۔ فنکاروں اور تکنیکی ماہرین کے لیے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو بھی مواقع مل رہے ہیں۔ اسّی اور نوے کی دہائی ہندوستانی سنیما کے لحاظ سے بہت اچھا تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ آج ہمیں اس دور سے آزادی ملی ہے۔ وکی ڈونر، مدراس کیفے، آئی ایم، انگلش ونگلش، پان سنگھ تومر، گینگ آف واسے پور، علی گڑھ، برفی، لنچ باکس، کوئین، حیدر، پیکو، پنک، مسان، این ایچ 10، اڑان، نیل بٹے سناٹا، نیوٹن، مکتی بھون ہمیں آنکھیں دیکھی جیسی بہترین فلمیں دیکھنے کو ملیں۔ ان کے موضوعات اتنے منفرد تھے کہ 20 سال پہلے کوئی ان پر فلم بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہندوستانی سنیما نے چین سمیت کئی ممالک میں اچھا بزنس کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔

■

Dr. Wasiqul Khair
Flat No. 302, Third Floor
Plot No. R 213/1, Sir Syed Road,
Joga Bai Extention, Jamia Nagar
Delhi-110025
Email.: wasujnu@gmail.com
Mob.: 9810383617

عبدالسمیع

اردو زبان پر سنسکرت کے اثرات

(طب کے حوالے سے)

ہم ملک ہندوستان کے باشندے ہیں ہمارے ملک میں جو طریقہ ہائے علاج موجود ہیں۔ان میں طب یونانی اور آیوروید نہایت قدیم ہیں۔طب یونانی آج اردو زبان میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔اس کے نسخے بھی اردو زبان میں لکھے جاتے ہیں جبکہ آیوروید ہندی زبان میں لکھا اور پڑھا جاتا ہے لیکن آیوروید کی ہندی زبان پر سنسکرت کا غلبہ ہوتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ طب یونانی کی بقا اردو کے دم سے ہے جبکہ آیوروید کو سنسکرت زندہ کیے ہوئے ہے۔یہ دونوں طبی علوم نہایت قدیم ہیں۔ یونان کو طب یونانی کا اولین گہوارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔اسقلی بوس طب یونانی کا بانی مانا جاتا ہے۔اس فن کو باقاعدہ مدون اور مرتب شکل میں بقراط نے پیش کیا۔ جالینوس اور دیگر اطبا نے اس فن کو یکتائے روزگار بنا دیا۔ ارسطو کی خدمات بھی طب یونانی میں نہایت اہم ہیں۔ اس نے علم تشریح اور علم الادویہ میں نہایت اہم معلومات پیش کیں۔جالینوس نے تمام طبی شعبوں پر کتابیں لکھی۔وہ صفِ اول کا ماہر تشریح البدن ومنافع الاعضا تھا۔جالینوس طبی علوم وفنون کا بہت بڑا ماہر گزرا ہے۔[1]

جالینوس کے بعد یونان میں جب طب کی طرف سے غفلت اور سرد مہری کا مظاہرہ ہوا اس وقت طب یونانی کے طبی و علمی سرمایے کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔عرب اور ایران کے اطبا نے طب یونانی کی بقا اور ترقی میں اہم خدمات انجام دیں۔بیت الحکمت میں طب یونانی کی کتابوں کے عربی زبان میں تراجم ہوئے۔ہندوستان میں پیدا ہونے والی طب جسے آیوروید کہا جاتا ہے۔اس کی ابتدا ویدک دور ہی میں ہوگئی تھی۔اتھروید میں بہت سی بیماریوں اور ان کے علاج کا ذکر موجود ہے۔ویدک دور ہی میں علم تشریح کے کافی تجربات کیے گئے یہیں سے آیوروید کی ابتدا ہوئی۔آیوروید کے ماہرین نے کئی صدی قبل مسیح دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی تھیں۔

چھٹی صدی قبل مسیح سے بہت دنوں پہلے اتریہ اور کیتھل نامی دو طبیبوں نے آیوروید کی باقاعدہ تعلیم شروع کر دی تھی۔ان کے چھ شاگرد بھی تعلیم و تعلم میں مشغول رہے جن میں اگنی ویش بڑی شہرت کا حامل ہے۔مشہور طبیب چرک، اگنی ویش ہی کا شاگرد تھا۔چرک کو فن طب کا امام مانا جاتا ہے یہ تکشیلا کے دارالعلوم سے وابستہ تھا۔ فن طب پر اس کی کتاب سام ہت ایک عظیم الشان تصنیف ہے جس میں جملہ طبی علوم وفنون کے ساتھ ہی مثالی شفاخانے کی خصوصیات اور کشتہ جات کا بیان ہے۔فن جراحی بھی آیوروید میں قدیم زمانے سے موجود ہے کاشی کے دارالعلوم میں سشرت نامی طبیب سرجری کا درس دیا کرتا تھا۔اس نے فن طب اور جراحی پر ایک کتاب لکھی جس میں فن جراحی کے ایک سو ستائس آلات کا ذکر کیا ہے۔ہندوستان کے اطبا نباتی ادویہ کے ساتھ معدنیات کا بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا کرتے تھے۔کشتہ سازی میں انھیں امامت کا درجہ حاصل تھا۔چرک اور سشرت کے علاوہ پتنجلی، ناگ ارجن، ساگر ہوترا وغیرہ آیوروید کے اہم اطباء گزرے ہیں۔سید نجی حسن نقوی آیوروید کی ترقی اور اہم تصانیف کا ذکر کرتے ہوتے رقم طراز ہیں:

''چھٹی صدی عیسوی تک فن طب وجراحی میں خاطر خواہ اضافے ہوگئے۔خصوصاً دواسازی یا عطارے کے فن کی تدوین اسی زمانہ میں ہوئی۔کیمیا نباتات (باٹنی) اور طب نے مل کر ترقی کی راہیں طے کیں۔تعلیمی درس گاہوں میں طب اور جراحی کا درس برابر دیا جاتا رہا۔طلباء لاشوں کو چیرتے پھاڑتے، مختلف تجربات کرتے اور مریضوں کے آپریشن کرتے۔ بودھ خانقاہوں اور جین مذہب کے تعلیمی مرکزوں میں طب کی تعلیم خصوصیت کے ساتھ دی جاتی تھی۔ملک میں جگہ جگہ اسپتال قائم تھے جن کی نگرانی قابل وید اور طبیب کرتے تھے۔اس دور میں فن طب پر کئی اہم کتابیں تصنیف کی گئیں۔فن طب کے ایک ماہر مادھو اکر نے ایک کتاب 'رگونی ون چیہ' تصنیف کی۔اسی دور میں دھنو ونتری نے جو چندر گپت وکرمادتیہ کے نورتنوں میں سرفہرست تھا، طب کی ایک فرہنگ تیار کی جسے دھن ونتری نگھنٹو کہتے ہیں۔اس فرہنگ کی طبی دنیا آج تک قدر کرتی ہے۔''[2]

طب یونانی اور آیوروید کا آپسی رشتہ اسلامی دور کے اولین مرحلے ہی میں قائم ہوگیا تھا۔عہد عباسی میں یہ

رشتہ اور بھی مستحکم ہوا، عہد عباسی میں عربوں نے سنسکرت میں لکھی گئی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ چرک سمہتا اور سشرت سمہتا کے عربی زبان میں تراجم ہوئے۔ خلیفہ ہارون رشید نے اسلامی مملکت کی راجدھانی بغداد میں طب کی درس گاہ اور اسپتال قائم کرنے کے لیے ہندوستان سے اطبا کو بلایا۔ ان اطبا میں منکہ، کنکہ، ہندی، صالح بن بہلہ، شاناق ابن دہن وغیرہ شامل ہیں۔

سنسکرت میں تصنیف کردہ کتابیں عہد منصور میں ہی بغداد پہنچ چکی تھیں اور عربی زبان میں علوم وفنون کے تراجم پہلی صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو چکے تھے جب تک اہل عرب کا مرکز شام تھا یونانی سریانی زبانوں سے تراجم ہوئے جب بغداد دارالخلافہ بنا تو ہندوستان وایران کی زبانیں بھی تراجم کا حصہ بن گئیں۔ اس طرح ہندوستانی آیوروید سے طب یونانی کو مستفید ہونے کا موقع ملا اور سنسکرت سے بھی عربی میں اہم تراجم ہوئے یہ سارا کام عہد عباسی میں انجام پایا۔ طب یونانی اور آیوروید کے حسین امتزاج کے بارے میں

حکیم آغا اشرف رقمطراز ہیں:

"دولت عباسیہ کا سب سے بڑا طبی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے معاشرتی احتیاجات وضروریات کے پیش نظر یونانی اور آیورویدک کو یکجا کر دیا۔ طب یونانی کی رگوں میں آیورویدک کا خون داخل کر کے مستقبل میں اسے مکمل طب مشرق بن جانے کی پوری صلاحیت بخش دی اور یوں گنگا جمنا اور دجلہ وفرات کا سنگم بنا دیا۔ علوم وفنون کسی ملک وقوم کی میراث نہیں۔ ہر زندہ قوم اس کی وارث ہے۔ وہ کسی فن کو اپنا کر اس میں ترقی کی گنجائش پیدا کر سکتی ہیں۔"[3]

خلیفہ منصور کے زمانے میں اہل ہند سے جو علمی تعلقات قائم ہوئے اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ہارون رشید کے زمانے میں یہ تعلقات وسیع اور مزید مستحکم ہو گئے۔ ہارون رشید مبتلائے مرض ہوا، بیماری شدت اختیار کر گئی بغداد طبیبوں کی آماجگاہ تھی مگر کسی کے علاج سے افاقہ نہ ہوا، اس وقت ہندوستان کا ایک طبیب جو فلاسفر بھی تھا عام شہرت رکھتا تھا اور چونکہ دربارِ خلافت اور فرمان روایاں ہندوستان سے دوستانہ مراسم قائم تھے اور باہم خط وکتابت رہتی تھی، سب نے اس طبیب کو بلانے کی رائے دی غرض وہ طبیب طلب کیا گیا اور بغداد میں برامکہ کے ہسپتال میں مہتمم اور افسر مقرر کیا گیا سنسکرت کی علمی کتابیں اکثر اس نے ترجمہ کرائیں۔ چنانچہ سشرت کی کتاب 'سشرت سمہتا' جو دس بابوں میں اور سامیکا جس میں زہروں کے علاج کا بیان ہے اس نے ترجمہ کیا۔

رشید کے دربار سے کئی اور اطبا وابستہ تھے معالج کی حیثیت سے انھیں مہارت حاصل تھی اور وہ کامیاب بھی تھے ان کی مہارت وقابلیت کا فائدہ یہ ملا کہ وہ دارالترجمہ میں شامل کر لیے گئے اور دربار عباسی میں ان کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ ہندوستانی اطبا میں منکہ الہندی، کنکہ الہندی، جوارالہندی، ابن دہن الہندی، صالح بن بہلہ الہندی، حسن بن صالح بہلہ، خاطف الہندی وغیرہ مشہور ہیں۔ ان اطبا کی عربی میں ترجمہ کردہ کتب کا ذیل میں مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

منکہ الہندی نے کتاب السموم چانکیہ کی مشہور کتاب جو سنسکرت میں تھی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا یہ کتاب بعد میں عربی میں منتقل کی گئی، چرک سمہتا ہندوستان کے مشہور رشی وید چرک کی سنسکرت زبان میں کتاب ہے منکہ نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا بعد میں عبداللہ بن علی نے عربی میں ترجمہ کیا، سشرت سمہتا مشہور جراح وطبیب سشرت کی سنسکرت کتاب کا منکہ نے عربی میں ترجمہ کیا، تفسیر اسما عقاقیر الہند کے نام سے یہ سنسکرت میں تھی۔ اس کا منکہ نے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ایک دوا کے مختلف ناموں سے بحث کرتی ہے، کنکہ الہندی کی تصنیف کردہ کتابوں کے بھی عربی تراجم کیے گئے یہ بھی اہم ہندی طبیب تھا۔ کنکہ کی کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے جن کے عربی تراجم ہو چکے ہیں۔ کتاب النموفی الاعمار، کتاب القرانات الصغیرۃ، کتاب القرانات الکبیرۃ، کتاب اسرار الموالید، اس کی ایک اہم کتاب ستاروں کی گردش کے بارے میں 'کتاب فی احداث العالم والدور فی القران' بھی ہے۔[4]

ہندی/سنسکرت سے عربی فارسی تراجم کے سلسلے میں طبقات الاطبا، کتاب الفہرست کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، دیگر علوم وفنون کے تراجم سے قطع نظر یہاں صرف تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان اطبا اور ان کی تصنیفات وتراجم نے طب یونانی پر گہرا اثر چھوڑا، عربوں نے ہندی طب سے بھرپور استفادہ کیا جس کی گہری چھاپ واثرات مشہور عربی مصنفین واطبا کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ زکریا رازی کی الحاوی، ابن طبری کی فردوس الحکمت، ابن بیطار کی کتاب الجامع، نوح القمری کی غنی منی جیسی کتابیں ان کتابوں کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں۔ علم الادویہ میں تو خاص طور پر ہندی طب کا گہرا اثر ورسوخ نظر آتا ہے۔ صیدلہ، اطریفل، سام پٹ گجریٹ جیسی اصطلاحیں ہندی طب سے ماخوذ ہیں اور کئی ادویہ کے نام خالص ہندی ہیں کشتہ بھی ہندی طب کی ایجاد ہے۔

عرب اطبا نے سنسکرت کی تصانیف سے بھرپور استفادہ کیا زکریا رازی چرک کو فن طب میں سند مانتے ہیں، اپنی کتاب الحاوی الکبیر اور دوسری کتب میں چرک کا ذکر بھی کیا ہے بعض مقامات پر حوالے کے طور پر اس کی عبارت بھی نقل کی ہے۔ شیخ بو علی سینا نے سشرت کی کتاب سے استفادہ کیا ہے جونکوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن سینا نے اپنی کتاب القانون کی کتاب اول فصل 23 میں سشرت کی بتلائی ہوئی چھ قسموں کا ذکر کیا اور وہی نام لکھے ہیں۔

طب یونانی عربی اور فارسی کے واسطے سے اردو زبان میں منتقل ہوئی ملک ہندوستان میں طب یونانی نے آیوروید سے بھرپور استفادہ کیا خاص طور پر ویدک دواؤں سے یونانی اطبا نے کافی استفادہ کیا طب یونانی میں ابن بیطار کی جامع الادویہ میں چودہ سو مفرد دواؤں کا تذکرہ ہے لیکن جب ماضی قریب میں حکیم اعظم خاں اور حکیم نجم الغنی کی کتابیں منظر عام پر آئیں تو ان میں ہزاروں دواؤں کا مفصل ذکر موجود ہے۔ حکیم اعظم خاں کی محیط اعظم اکسیر اعظم اور حکیم نجم الغنی کی خزائن الادویہ میں ہزاروں دوائیں نظر آتی ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ طب یونانی میں ادویہ کے ہزاروں نام شامل ہوئے ہیں۔ وہ آیوروید اور ہندوستانی جڑی بوٹیوں کے ہیں جن میں سے اکثر سنسکرت زبان سے بعینہ لے لیے گئے ہیں۔ اس بات کی تصدیق علم الادویہ کے سلسلے میں لکھی گئی کتابوں میں درج ناموں سے بھی ہوتا ہے۔ آج طب یونانی میں تقریباً ہزاروں دوائیں مستعمل ہیں لیکن اس کا ذخیرہ نہایت وسیع ہے اس ذخیرے کی وسعت کے لیے آج اردو زبان میں موجود طب یونانی کو سنسکرت کے ناموں سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ طب یونانی کا تو یہ مزاج رہا ہے کہ اسے جہاں بھی جو چیز اپنے فائدے کی ملی جس کے ذریعے طب کو ترقی حاصل ہو سکے، اسے اپنانے میں اطبا نے کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے حکیم عبدالحمید اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"جہاں تک طب یونانی کا تعلق ہے اسے شدھ اور اشدھ کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے جدید وقدیم کا امتیاز اس کے لیے بے معنی ہے وہ فطرتاً ہمیشہ اشدھ رہی ہے ہر براعظم اور ہر بڑے خطہ اور عظیم تہذیبوں سے اس کا واسطہ رہا ہے اور ہر جگہ اور ہر تہذیب کا اثر وہ قبول کرتی رہی ہے

جہاں تک طب یونانی کا تعلق ہے اسے شدھ اور اشدھ کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے جدید وقدیم کا امتیاز اس کے لیے بے معنی ہے وہ فطرتاً ہمیشہ اشدھ رہی ہے ہر براعظم اور ہر بڑے خطہ اور عظیم تہذیبوں سے اس کا واسطہ رہا ہے اور ہر جگہ اور ہر تہذیب کا اثر وہ قبول کرتی رہی ہے اس کے طریقہ ہائے علاج اس کا علم الادویہ اور دواسازی سب اس کی بین الاقوامیت کا واضح ثبوت ہیں اس کی دواؤں کے اکثر نام ان ممالک سے منسوب ہیں جن سے اس طب کا تعلق رہا ہے ہند سے قدیم تعلق نے اس کو بہت سے ہندی خدوخال دیے ہیں اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ شدھ کی تنگنائے میں داخل بھی ہو سکے جو ہمیشہ اور ہر جگہ سے غذا حاصل کرتی رہے گی۔

اس کے طریقہ ہائے علاج اس کا علم الادویہ اور دواسازی سب اس کی بین الاقوامیت کا واضح ثبوت ہیں اس کی دواؤں کے اکثر نام ان ممالک سے منسوب ہیں جن سے اس طب کا تعلق رہا ہے ہند سے قدیم تعلق نے اس کو بہت سے ہندی خدوخال دیے ہیں اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ شدھ کی تنگنائے میں داخل بھی ہو سکے جو ہمیشہ اور ہر جگہ سے غذا حاصل کرتی رہے گی۔"[5]

آج طب یونانی میں کشتہ جات بنانے کا جو عمل موجود ہے یہ مکمل طور پر آیوروید اور سنسکرت ہی سے ماخوذ ہے۔ کشتہ جات کی تیاری میں جو اصطلاحات والفاظ طب یونانی میں موجود ہیں اور اردو رسم الخط میں استعمال ہو رہے ہیں وہ سنسکرت ہی سے ماخوذ ہیں مثلاً پٹیا یا پٹ، گج پٹ، بھانڈ پٹ، بودھر پٹ، کپوت پٹ، لکھ پٹ، ککٹ پٹ، کنبھ پٹ، مرد بھانڈ پٹ وغیرہ اردو زبان میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ادویہ کی تیاری میں جن آلات کا استعمال ہو رہا ہے ان میں عرق وروغن کشید کرنے یا طلا بنانے کے لیے بھی خالص سنسکرت کی ویدک اصطلاحیں مستعمل ہیں پتال جنتر، بالو جنتر، ڈول جنتر، جل جنتر، بودھر جنتر، کچھپ جنتر، گربھ جنتر، اپ دھات وغیرہ اصطلاحات سنسکرت سے آئی ہیں اور اردو زبان میں استعمال کی جا رہی ہیں اسی طرح حکیم کبیر الدین نے لغات الادویہ کے نام سے ایک علم الادویہ کی طبی لغت لکھی ہے جس میں ہزاروں ایسی دواؤں کے نام موجود ہیں جو سنسکرت کے ہیں بطور نمونہ کچھ ایسی سنسکرت ادویہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جسے اب طب یونانی میں پڑھا اور لکھا جاتا ہے جس طب یونانی کی تعلیم وتعلم کا ذریعہ اردو زبان ہے اور نسخہ نویسی بھی اردو زبان ہی میں کی جا رہی ہے کچھ ادویہ کے نام ملاحظہ کریں:

"آریوت، املتاس، آرکتمول، گڑہل، آسوری، رائی، آلابو، کدو، آشوک، آلا پالا، آکلی، نرور، آمرا، آم، آمل، ترش، ملکی، آملہ، آملکیدل، تیج پات، آنڈہا، منڈہا، آدرتی، مروڑ پھلی، آدنتی، کانجی، آرس، اپرسا، آوانک مکھی، برمنڈی۔"[6]

جہاں تک آیوروید کی سنسکرت طبی تصانیف کا ترجمہ بلاواسطہ اردو زبان میں کیے جانے کا تعلق ہے تو کسی اہم کتاب کا سراغ نہیں ملتا جبکہ عربی اور فارسی کے واسطے سے ان کتابوں سے اخذ کی گئی باتیں اردو زبان میں منتقل کی گئی ہیں۔ ایک کتاب امرت ساگر جو بھاشا زبان میں لکھی گئی تھی پنڈت پیارے لال نے منشی نول کشور کی خواہش پر امرت ساگر کو اردو زبان میں منتقل کیا تھا 564 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں امراض اور دواؤں کے نام اس طرح منتقل کیے گئے ہیں کہ اصل نام سنسکرت بھاشا اور ہندی زبان کے ہیں ان کی تشریح وتوضیح یونانی اصطلاحات والفاظ کے ذریعے کی گئی ہے ایک مفید اور اہم ذخیرہ سنسکرت ہندی اور بھاشا زبان کے ساتھ اردو زبان میں منتقل ہوا ہے کچھ اصطلاحات والفاظ ملاحظہ کریں:

مرگانگ (سونے کی راکھ)، ناس (نک چھنکنی)، گٹکا (گولی)، رس (کشتہ)، آمو (عرق)، چورن (پھنکی)، پاگ (معجون)، برن (گھاؤ زخم)، ادھو بایو (پیٹ کی ہوا کو روکنا، وشا بادھا (پاخانہ روکنا)، موتر بادھا (پیشاب روکنا)، بھوکھ (بھوک، بید (وید، حکیم)، زور (قوت)، عارضہ (درد)، سنپات (تین اخلاط، اجیرن جیر (تپ کہنہ)، بل جور (فساد خون)، پر سوتکا (پرسوتی بخار)، ایشار (اسہال)، دم (خون)، اشلشما (بلغم)، شوک (رنج)، روگ (بیماری)، پیلیا (یرقان)، سوانس (دمہ)، اونمار (خفقان)، اردت (لقوہ)، کشٹ روگ (مرض جذام) وغیرہ صدہا اصطلاحات سنسکرت کی ہیں۔ یہ صرف باب اول سے بطور نمونہ درج کی گئیں۔"

امرت ساگر میں اوزان کے پیمانے بھی ہندی اور سنسکرت زبانوں کے استعمال ہوئے۔ مثلاً تانبا 2 شان (تولہ)، کشتہ ابرک 4 شان، کشتہ لوہا 8 شان اور نشک، قرش (تولہ)، ثار، پل، پنیری، ٹنک کے علاوہ گھریلو دیسی اوزان کے مقداری پیمانے مثلاً دھیلہ بھر، ٹکہ بھر، پیسہ بھر بھی امرت ساگر کے اسلوب تحریر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی امرت ساگر میں طب یونانی کی اصطلاحات اور الفاظ کے پہلو بہ پہلو سنسکرت ہندی اور مقامی بھاشا کے ہزار ہا الفاظ کا ایک نیا گنجینہ اردو زبان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جن میں اکثر الفاظ اور مصطلحات معمولی صوتی اور صرفی تبدیلی کے عمل سے گزر کر اردو میں رواج عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔"[7]

مذکورہ بالا تفصیل سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آج اردو زبان میں پھلنے پھولنے اور ترقی پانے والا علم طب یونانی اور سنسکرت زدہ ہندی یا خالص سنسکرت کا مرہون منت آیوروید کا رشتہ قدیم اور مستحکم ہے طب یونانی نے آیوروید سے علم الادویہ خصوصاً مفردات، علم کشتہ سازی اور صیدلہ میں بھرپور استفادہ کیا ہے اور سنسکرت کے الفاظ واصطلاحات اردو زبان میں ترقی پذیر ہیں۔ سنسکرت کے یہ نام اردو زبان وادب میں ترقی کر رہی طب یونانی کے لیے کوئی اجنبیت نہیں رکھتے اردو رسم الخط میں ہی انھیں لکھا جاتا ہے اس طرح یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ طب یونانی کے واسطے سے ہزاروں سنسکرت کے الفاظ واصطلاحات اردو زبان میں شامل ہیں اور سنسکرت کے گہرے اثرات اردو زبان پر مرتب ہوئے ہیں۔

حواشی

1 تاریخ طب ابتدا تا عہد حاضر، حکیم سید محمد حسان نگرامی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2009، ص 118

2 ہمارا قدیم سماج، سید نجی حسن نقوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1980، ص 57

3 تاریخ طب، حکیم آغا اشرف، محبوب بک ڈپو، بہرام خاں دہلی، 1996، ص 169

4 تاریخ طب ابتدا تا عصر حاضر، حکیم سید محمد حسن نگرامی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2007، ص 201,202

5 ارشادات محسن طب، حکیم عبدالمجید، مرتب خاور ہاشمی، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی 2005، ص 25

6 لاثانی لغات الادویہ المعروف لغات کبیر حنفی حکیم کبیر الدین، تدوین مرتب، ٹھاکر شرما، عثمان پبلی کیشنز

7 امرت ساگر اردو ترجمہ پیارے لال صاحب کشمیری، تیج کمار پریس وارث نول کشور پریس، لکھنؤ، 1970

■

Dr. Abdus Samee
B N Digree College
Shah Abad
Hardoi- 241124 (UP)
Mob.:9170389242

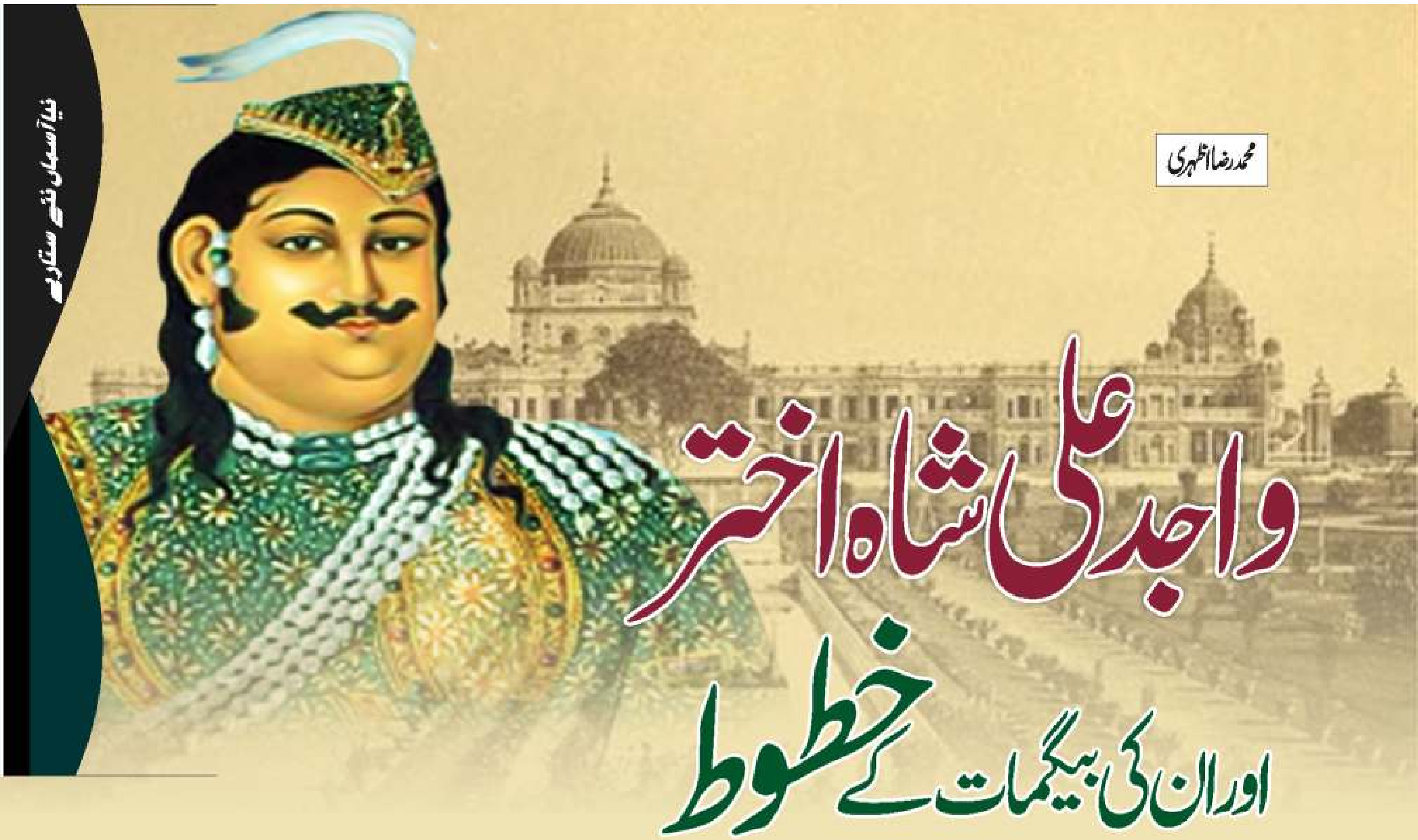

واجد علی شاہ اختر اور ان کی بیگمات کے خطوط

محمد رضا اظہری

اردو میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب کے خطوط سے ہوتی ہے۔ ان سے پہلے بھی یہ ذوق عام تھا،لیکن خواص کی ادبی زبان فارسی تھی چنانچہ رقعات عالمگیری کے علاوہ جو مکاتیب شمالی ہند کے بزرگوں نے لکھے ہیں وہ فارسی میں ہیں ان میں القاب و آداب کی ایک انجمن ہے۔غلام احمد شہید،غلام غوث بے خبراور قتیل وغیرہ دوسرے ادیبوں کے مکاتیب جو کتاب کی صورت میں موجود ہیں، مکاتیب نہیں مہمات ہیں۔

فارسی اصناف ادب کی تقلید میں اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز ہوا اور دیگر اصناف ادب کی طرح اردو میں بھی مکتوب نگاری کے اولین نمونے دکن میں ملتے ہیں، لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلا خط کس نے اور کب تحریر کیا تھا۔ پروفیسر عنوان چشتی کے مطابق اردو کا پہلا خط دسمبر 1922 میں تحریر کیا گیا تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط 6 دسمبر 1922 کا ہے جس کے لکھنے والے بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے حسام الملک بہادر ہیں انھوں نے یہ خط اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم صاحبہ کو لکھا تھا۔“ عام طور سے مرزا غالب کو اردو میں مکتوب نگاری کا موجد سمجھا جاتا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ غالب سے پہلے بھی اردو میں مکتوب نگاری کی روایت موجود تھی یہ اور بات ہے کہ ان مکاتیب میں سادگی اور بے تکلفی نہیں تھی۔ غالب سے پہلے مکتوب نگاری کے سلسلے میں دو نام اہمیت کے حامل ہیں ایک 'رجب علی بیگ سرور' اور دوسرا 'غلام غوث بے خبر' کا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے مجموعہ مکاتیب 'انشائے سرور' کو مرزا احمد علی نے مرتب کر کے 1886 میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ سرور ایک باکمال مکتوب نگار تھے وہ خطوط نویسی کے فن پر مہارت رکھتے تھے اور موقع کی مناسبت سے مختلف اسالیب استعمال کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں کہیں سادگی و پرکاری نظر آتی ہے تو کہیں مسجع مقفی عبارت کی فراوانی۔ غلام غوث بے خبر کے دو مجموعہ مکاتیب کا پتہ چلا ہے ایک 'فغان بے خبر' ہے اور دوسرا 'انشائے بے خبر'، پہلا ناپید ہے اور آخر الذکر کو مرتضی حسین بلگرامی نے 1960 میں علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔

مرزا غالب جتنے اردو کے اہم شاعر تھے اتنے ہی اہم نثر نگار بھی تھے۔ اگر انھوں نے شاعری نہ کی ہوتی اور صرف اردو خطوط لکھے ہوتے تب بھی تاریخ ادب اردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ غالب کے خطوط کے مجموعوں میں مہر غالب، خطوط غالب، عود ہندی، اردوئے معلیٰ، مکاتیب غالب، نادرات غالب کے علاوہ ان کے اور بھی بہت سے خطوط مختلف رسالوں اور کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں سب سے زیادہ شہرت 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کو حاصل ہوئی۔ اردو مکتوب نگاری میں مندرجہ ذیل شخصیات نے اہم کردار ادا کیا ہے:

(1) سرسید احمد خان کے خطوط کا مجموعہ 'مکاتیب سرسید' کے نام سے (2) علامہ شبلی نعمانی کے خطوط 'مکاتیب شبلی' کے نام سے (3) ابوالکلام آزاد کے خطوط 'مکاتیب ابوالکلام آزاد' اور 'غبار خاطر' کے نام سے (4) مولانا حالی کے خطوط 'مکاتیب حالی' کے نام سے (5) مرزا رجب علی بیگ سرور کے خطوط 'انشائے سرور' کے نام سے (6) صفیہ اختر کے خطوط 'زیر لب' کے نام (7) مولانا مودودی کے خطوط (8) جناح کے خطوط (9) مکتوبات اقبال (10) مولانا امتیاز علی خان عرشی کے خطوط (11) نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط۔

مقالے کے عنوان کے پیش نظر اس تحریر کا اصل مقصد بیگمات اودھ اور نواب واجد علی شاہ کے درمیان جو خط و کتابت کا سلسلہ و رشتہ رہا ہے اس کو اجاگر کرنا ہے، مگر اس سے پہلے مختصراً نواب کی زندگی اور اس پرآشوب دور کے زیر و بم کا علم بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مکاتیب جبراً اور ناخواستہ مگر اردو کی ایک گراں بہا میراث اور اس دور کے لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی بن کر سامنے آئے:

واجد علی شاہ کی ولادت 30 جولائی 1822 کو اس وقت ہوئی جب غازی الدین حیدر اودھ کے بادشاہ تھے۔ جب وہ پانچ سال کے ہوئے تو غازی الدین بادشاہ کی وفات ہوگئی اور ان کی جگہ نصیر الدین حیدر 1827 میں بادشاہ بنے۔ ان کے بعد محمد علی شاہ 1837 سے 1842

تک اور پھر امجد علی شاہ 1842 سے 1847 تک اودھ کے سلطان رہے اور ان کی موت کے بعد واجد علی شاہ آخری تاجدار بنے۔

واجد علی شاہ کے والد کا نام امجد علی شاہ اور والدہ کا نام ملکہ کشور تھا۔ واجد علی شاہ کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان کے استاد و اتالیق امین الدولہ امداد حسن تھے جن کے نام پر لکھنؤ کا خاص بازار 'امین آباد' آج بھی موجود ہے۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کی شادی لکھنؤ کے ایک معزز رئیس نواب یوسف علی خاں بہادر صمصام جنگ کی بیٹی عالم آرا بیگم سے ہوئی۔ عالم تخلص تھا۔ ان کی شعر گوئی کی ابتدا اٹھارہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی اور انھوں نے تین مثنویاں اور پہلا دیوان اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ہی مرتب کرلیا تھا والد امجد علی کی تخت نشینی کے بعد 1842 میں ولی عہد نامزد کیے گئے تھے حالانکہ ان کے ایک بڑے بھائی میر مصطفیٰ حیدر موجود تھے۔ واجد علی شاہ کی سلطنت کو نو سال ہی ہوئے تھے کہ انگریزوں نے ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر معزولی کے اسباب فراہم کیے اور 1856 میں تخت و تاج سے محروم کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ وہ کسی مزاحمت یا خون خرابہ کیے بغیر حکومت سے دست بردار ہوگئے اور اپنی زندگی کے آخری 31 سال مٹیا برج میں جلاوطنی میں گزارے۔ انگریزوں نے جب واجد علی شاہ پر الزام لگائے اور ان کی معزولی کے اسباب فراہم کیے تو انھوں نے ہر الزام کا مدلل جواب دیا لیکن ان جوابوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ واجد علی شاہ کی معزولی کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کا اثر ان پر، لکھنو پر اور ان کے متعلقین پر بہت گہرا ہوا کل تک جس کے 1700 اہل قلم، 500 طبیب، 1500 چوبے دار ملازم تھے وہ دفعتاً شہریاری و سروری سے محروم کر دیا گیا اور وطن سے دور دیار غیر میں پھینک دیا گیا۔ جس وقت وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے لکھنو سے رخصت ہوئے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

تو سننے والوں کے کلیجے شق ہوگئے۔ بچے، بوڑھا، عورت، مرد، ہندو مسلمان کوئی ایسا نہ تھا جو رو نہ رہا ہو۔ ان کی یاد میں غزلیں لکھی گئیں اور گیت گائے گئے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں عورتیں یہ شعر نہ پڑھتی ہوں۔

واجد علی پیارا کلکتے کو سدھارا
سڑکیں نکل رہی ہیں، سونی گلی گلی ہے

معزولی کے بعد واجد علی شاہ ایک بجھے ہوئے انسان تھے، لیکن زندگی کا یہ دور تخلیقی اعتبار سے ان کے لیے نعمت ثابت ہوا۔ وہ اس زمانے میں زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرتے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں لکھیں جن میں عروض جیسے خشک موضوع پر بھی ان کے دو رسالے موجود ہیں۔ واجد علی شاہ کی وفات 21 ستمبر 1887 میں ہوئی۔ اسی تاریخ کو رات گیارہ بجے انتقال سے تقریباً اکیس گھنٹے بعد اپنے تیار کردہ امام باڑے سبطین آباد مبارک مٹیا برج کلکتہ میں دفن کیے گئے۔

انیسویں صدی کا لکھنؤ علم و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ اسی لکھنؤ میں تحسین کی 'نو طرز مرصع' لکھی گئی۔ 'فسانۂ عجائب' کا پسندیدہ اور رائج الوقت نثری اسلوب اسی عہد کا معیاری انداز نگارش ہے۔ اسی لکھنؤ میں واجد علی شاہ کی طرح ان کی تصنیفات بھی شہرت رکھتی ہیں۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط ایک ایسے اسلوب کو پروان چڑھاتے ہیں جو اپنے پیش رووں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ لکھنو میں مکتوب نگاری کے ایسے نمونے دستیاب ہوتے ہیں جو اپنے طرز فکر کے آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نثری اسلوب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

واجد علی شاہ کی بہت سی بیگمات ان کے ہمراہ کلکتہ نہ جاسکیں تو بیگمات اور واجد علی شاہ میں صرف خط و کتابت کا ہی تعلق رہ گیا۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے جو مجموعے دستیاب ہیں وہ کسی نہ کسی نام سے منسوب ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے مجموعوں کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

1 مخزن اسرار سلطانی معروف بہ رقعات بیگم (قلمی) آصفیہ حیدرآباد
2 رقعات اہلیہ واجد علی شاہ (قلمی) خدابخش لائبریری پٹنہ
3 تاریخ غزالہ، مطبوعہ مطبع مفید عام، آگرہ، کتب خانہ پروفیسر مسعود حسین رضوی
4 تاریخ نور (قلمی) خدابخش لائبریری، پٹنہ
5 انشا راحت روح، مطبوعہ مطبع اثنی عشری، لکھنؤ، پروفیسر مسعود حسین رضوی
6 تاریخ ممتاز، مخطوطہ برٹش میوزیم، یہ کتاب 1953 میں لاہور سے شائع کی گئی ہے۔
7 تاریخ بدر (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن
8 رقعات بدر، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔ یہ دراصل تاریخ بدر ہی ہے جس کو نام کے ادنی تغیر کے ساتھ سید محمد علی عرشی ملیح آبادی سے قائم پریس واقع چنچل گوڑہ میں چھپوایا ہے۔
9 بیگمات اودھ کے خطوط، مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی، مطبوعہ فاروقی پریس، دہلی، اس میں مرتب نے خطوں کے حوالے نہیں دیے ہیں اور بعض جملے نکال دیے ہیں اور شوقیہ، نظموں کے اشعار کم کردیے ہیں۔

خطوط کے مطالعے سے چند نکات برآمد ہوتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

تاریخ نور کے ایک خط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کی فرمائش پر ترتیب دیا گیا. واجد علی شاہ ایک خط میں نور زماں بیگم کو لکھتے ہیں: ''مجھے منظور ہے کہ تم صاحبوں کے محبت ناموں کی نقلیں میں بھی اپنے پاس رکھوں، کس واسطے کہ جو کچھ نظم و نثر لکھ بھیجتا ہوں اس کا مسودہ میرے پاس نہیں رہتا، اکیلا آدمی کیا کیا کروں اور کلام نظم و نثر یقینی بہت ہوگیا ہوگا جو کچھ ہمارا کلام نظم تمھارے پاس موجود ہو اس کی نقل مہارت الدولہ اور امیر علی خاں ہلال اور نثر کاتب املاک کو دے دینا اور ایک کتاب اپنے محبت ناموں کی تاریخ اور جس طرح ہم نے بھیجے ہوں خوش تقطیع بین السطور اچھا مطلا منقش کروا کے ہمارے پاس بھیجواؤ مگر جس طرح سے ہم نے لکھا ہے مع نظم و نثر اسی ترتیب سے اور دیباچہ اس کا اپنے نام پر کرنا کہ یہ محبت نامہ مرسلہ جان عالم ہم نے اپنے فرط محبت سے جمع کیے اور اس کا نام تاریخ نور رکھا اور بعد اس کے تحفہ اس کا بنوا کے ہمارے پاس بھجواؤ اور پھر ہر مہینے کے بعد بھی شغل جاری رکھنا کہ اس تقطیع اول کے موافق درست کروا کے بعد انقضائے ماہ ہمراہ محبت نامہ وہ اوراق روانہ کردیا کرو. تا ہم دل کو سرور اور آنکھوں کو نور رہے اور جو کچھ اس میں صرف ہوگا وہ ہم سے متعلق ہے۔'' تاریخ نور کے خطوں کے مطالعے سے جہاں بہت سی نجی باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ واجد علی شاہ قید و بند کے زمانے میں اپنی مصیبتوں کا زیادہ اظہار نہیں کیا کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے تھے: ''اب کہاں تک داستان مصیبت بیان کروں، ایک دفتر میں بھی نہ سماوے۔''

واجد علی شاہ کے خط بیگمات کے نام محبت نامے تو ہیں ہی لیکن ان کے خطوط میں اپنے بچوں کے علاوہ متعلقین اور ملازمین کی جو مزاج پرسی کی گئی ہے اس سے ان کے خطوط کی فکری خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں اس سے متعلق کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے: ''ہمیں موچی کھولی تک کا حال و احوال نہیں معلوم کہ وہاں زنان و فرزندان پر کیا گزرتی ہے۔ فقط اتنا سنا ہے کہ اختر محل سے شاہزادہ متولد ہوا شاید برس دن کا ہوا اور ہماری والدہ اور بھائی نے

لندن میں انتقال کیا، امید کہ ہمیشہ ارقام رقائم سے دل مقید کو شاد کیا کرو اللہ بہت سا سلامت رکھے''۔ ''والدین کو اور بھائی آغا علی کو میری طرف سے بہت بہت پوچھ دینا اور اچھی صاحبہ کو بہت بہت سلام و اشتیاق دوبارہ پہنچے۔'' 'والدہ صاحبہ اور ابا جان اور بہن اچھی صاحبہ اور بھائی آغا علی ان سب کو درجہ بہ درجہ ہماری طرف سے پوچھ لینا۔''

واجد علی شاہ کی بیگمات نے اکثر منظوم خطوط لکھے ہیں جو ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں: بیگمات کے خطوط کا کچھ حصہ 1857 سے پہلے اور بیشتر حصہ اس کے بعد کا ہے۔ لکھنؤ ان دو سالوں میں ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس کی مثال اس شہر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ بیگمات جو بادشاہ کے ساتھ کلکتہ نہ جا سکیں انھوں نے ان خطوط میں اپنے اشتیاق و محبت کا اظہار تو کیا ہی ہے، درد فصال اور جدائی کی کربناکیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

بنام جانِ عالم۔

سوز تپ فرقت سے عجب رنگ ہیں دل کے
تحریر نہیں ہوتے ہیں جو ڈھنگ ہیں دل کے

آشنائے دریائے موانست و اخلاص، شناور قلزم مصادقت مرزا جان عالم بلکہ جان جہاں سے بڑھ کر سلطان عالم زید اللہ لطفہ۔

ترے فراق میں کیوں کر یہ دردناک جیے
مرے تو مر نہیں سکتا، جیے تو خاک جیے

چرخ ناہنجار مستعد آزار ہے، کوئی مونس ہے نہ غم خوار ہے۔ زندگی کی یاس ہے، جینے کی کسے آس ہے۔ دل میں درد ہے آہ سرد ہے، سینہ ماتم سرا ہے، جسم خشک، جگر ہرا ہے۔ جوش وحشت کی شدت ہے، جینے سے جی بیزار، دنیا سے نفرت ہے۔

کاش کہ دو دل بھی ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

پیا جان عالم جب سے آپ لکھنؤ سے سدھارے، خواب و خور حرام ہے، رونا دھونا مدام ہے۔ یہاں شب و روز آہ و بکا میں گزرتی ہے۔ سرکار سلطان عالم پناہ اپنا حال لکھیے۔ (شیدا بیگم)

جواب:

جان جان عالم نواب شیدا بیگم صاحبہ زاد حسنہا و جمالہا!

دو تشفی نامے تمھارے انجم الدولہ بہادر نے نویں رجب کو لا کر دکھائے، دل شاد ہوا، طبیعت میں قوت آئی، جان تازہ پائی۔ مگر اے جانی اب ہم وہ نہیں رہے۔ ہم اپنا حال لکھتے ہیں، اس کے معلوم ہوگا ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ عشق و عاشقی سب مفقود ہے۔ رنج نے حالت تباہ

واجد علی شاہ کے خط بیگمات کے نام محبت نامے تو ہیں ہی لیکن ان کے خطوط میں اپنے بچوں کے علاوہ متعلقین اور ملازمین کی جو مزاج پرسی کی گئی ہے اس سے ان کے خطوط کی فکری خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں اس سے متعلق کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے: "ہمیں موچی کھولی تک کا حال و احوال نہیں معلوم کہ وہاں زنان و فرزندان پر کیا گزرتی ہے۔

کی۔ اٹھے تو نالہ کیا، بیٹھے تو آہ کی۔ ہم قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند ہیں۔ لارڈ لنگ صاحب کا میرے پاس خط آیا کہ افسران آپ کے اعزاز میں فرق نہ کریں گے۔ مگر میری زندگی دشوار ہو رہی ہے۔ آٹھ دن بعد قلعے میں ایک کوٹھی ہے اس میں اٹھ آئے۔ 23 آدمی ہمراہ ہیں۔ پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔ قید خانہ کے دروازے بند کر لیے گئے، ہمارا دم گھٹتا ہے۔ مجاہد الدولہ، مرزا زین العابدین، دیانت الدولہ، متدین الملک محمد معتمد علی خاں، امانت جنگ کمیدان ہر وقت پروانہ وار جاں نثار تھے۔ فتح الدولہ بخشی الملک ضعیفی کے سبب چراغ سحری تھے۔ وہ 28 صفر 73ھ کو ہم سے رخصت ہو گئے۔ ہم کو کلفت میں چھوڑ کر خود راہی جنت ہو گئے۔''

ساتھ میں ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگمات کس کسمپرسی اور پریشانیوں کے دور سے گزریں۔ ایسے ایسے واقعات کا پتہ چلتا ہے کہ دل کانپ اٹھتا ہے: ''بے گھر بے در ہو گئی، بیٹھنے کے ٹھکانے نہ رہے... حیثیت ظاہری کا بالکل خاتمہ ہو گیا... زیور اسباب لباس کچھ نہ رہا، کچھ حضرت محل کی بدولت لٹ گیا، کچھ نکلنے کے وقت چھٹ گیا، جھاڑی زمین پر بیٹھے ہیں، ٹوٹے مکان میں رہتے ہیں، نہ وہ محل ہے نہ باغ ہے، خانۂ دل چراغ ہے۔''

خطوط میں القاب و آداب میں بھی بڑی جدتیں برتی گئی ہیں۔ کہیں کہیں لمبے لمبے القاب ہیں تو کہیں خط کی ابتدا غزل یا مثنوی سے کی ہے۔ بدر عالم لکھتی ہیں: ''اے میرے قدردان! اے میرے مہربان! اے میرے معین و مددگار! اے میرے ہمدم و غم خوار! اے میرے یوسف، اے میرے قیدی، اے میرے زندانی، اے میرے جان عالم، اے میرے اختر پیارے میں صدقے تمھارے'' شیدا بیگم لکھتی ہیں: ''مہر پیشانی، چہرہ نورانی، ابرو کمان، تیر مژگان، بادام چشم، بہرام حشم، گل کی خوشبو، بلبل کی گفتگو، فرشتہ زیب، زاہد فریب، حسینوں کے رنگ، زہرہ جبینوں کے ڈھنگ، شاہد کی سج، عزیز کی دھج۔''

یہ خطوط اس زمانے میں لکھے گئے جب ایک بساط الٹ چکی تھی اور دوسری بچھائی جا رہی تھی، جاگیردارانہ نظام کا زوال ہو رہا تھا لیکن اس کی تہذیبی اقدار باقی تھیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے ایک مٹتے ہوئے درباری ماحول کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ ان میں جذبے کی دہکتی ہوئی آگ ہے، کوئی ہلکی آنچ نہیں بلکہ ایک سسکتا رومانی انداز ہے۔ کوئی بلند تصویر یا دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں۔ اس کے پیچھے جو معاشرتی زندگی ہے وہ ہوسناکی اور سطحی قسم کی ہے۔ لکھنؤ کا لوچ، بانکپن اور اس کا ابتذال ہے۔ شوہر بیوی نے اپنے فراق کی داستان کو درد انگیز پیرایے میں بیان کیا ہے۔

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط ان کی نثر نگاری کی واحد یادگار ہیں اور ان کا مرتب ہونا بھی کچھ جرأت اور جدت طرازی کا کام تھا کیونکہ اس سے پہلے اس طرح کے مجموعے اردو زبان میں مرتب نہیں ہوئے تھے۔ خطوط میں بالمشافہ گفتگو کا انداز نمایاں ہے۔ ان خطوط کی امتیازی خصوصیات ان کی سادگی، صاف گوئی، صفائی اور مکالماتی انداز تحریر ہے۔ یہ خط لکھنوی زبان اور تہذیب، معاشرت اور سیاست اور تاریخ کے اہم دستاویز ہیں۔ انھیں خطوط کے ذریعے ایک غیر معمولی انسان کی شکل سامنے آتی ہے جو اپنے ادنیٰ سے ملازمین کو بھی دعا سلام سے یاد کرتا ہے اور اپنے متعلقین کو صبر و تحمل کی تلقین کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

منابع و مآخذ:

1 واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات؛ کوکب قدر سجاد علی مرزا، ص 54 بہ حوالہ اسرار واجدی، الحسن المتین، تقویم سلطانی، اختر جنان؛ تاریخ اودھ، واجد علی شاہ

2 ذوق جستجو؛ خواجہ احمد فاروقی ص 49-148، ادارہ فروغ اردو، امین آباد، لکھنؤ، فروری 1967

3 اردو مکتوب نگاری (سر سید اور ان کے رفقا کے خصوصی حوالے سے)؛ شاداب تبسم، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، دسمبر 2012

4 اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب؛ ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد، ناشر موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، 2007

■

Mohd Reza Azhari
Research Scholar, Dept of Persian
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 7985371677

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت

مرتب: شیخ عقیل احمد

صفحات: 145، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عظمت النساء، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

آئین ہند میں اردو زبان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے قومی کونسل فروغ برائے اردو زبان نے مارچ 2017 میں 'ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت' کے عنوان سے دو روزہ قومی اردو سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ اس سیمینار میں ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین قانون، وکلا اور شعبۂ قانون سے وابستہ دیگر مندوبین نے تفصیلی اور معلومات افزا مقالات پیش کیے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب انھی مقالات کا مجموعہ ہے جس کے مرتب پروفیسر شیخ عقیل احمد ہیں جو فی الحال قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'مرکزی / ریاستی قوانین اور قانونی مواد کی اردو میں دستیابی' ہے جس میں چار مضامین ہیں، دوسرا باب 'انتظامیہ اور عدلیاتی اداروں میں اردو کی معنویت' پانچ مضامین پر مشتمل ہے جبکہ تیسرا باب 'اردو کا فروغ اور اردو جاننے والوں کے لیے روزگار کے مواقع' میں چار مضامین شامل ہیں۔ کلیدی خطبہ پروفیسر فیضان مصطفیٰ جبکہ کتاب کے مرتب شیخ عقیل احمد کا مختصر 'پیش لفظ' شامل ہے۔

مرتب نے پیش لفظ میں اردو اور قانون کے درمیان جو رشتہ ہے اس پر مختصر روشنی ڈالی ہے، وہ اردو زبان کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کوئی بھی زبان جو کسی بھی دور حکومت میں دفتری یا قانونی زبان رہی ہو وہ کبھی نہیں مٹ سکتی، اس کا معتبر دستاویزی ثبوت یہ ہے کہ آج بھی پولیس اور مالگذاری کے ریکارڈ میں اردو کے الفاظ باقاعدہ استعمال کیے جا رہے ہیں جبکہ ہندی کو سرکاری درجہ حاصل ہے۔"

کتاب کے پہلے حصے کا پہلا مضمون پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم کا (عدالتی زبان کی حیثیت سے اردو کا ارتقا اور دوامی معنویت) ہے انھوں نے اردو کی قانونی حیثیت پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے عدالت کے ذریعے اردو کا ارتقا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "مغلیہ دور میں اس طرح کی دستاویزات ابتداءً فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ دستاویزات اردو کے ارتقا کے دوران فارسی و اردو یعنی ملی جلی زبان میں لکھی جانے لگیں۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب یہ دستاویزات صرف اردو میں لکھی جانے لگیں لیکن اردو میں لکھی جانے والی دستاویزات میں بھی بیشتر الفاظ عربی و فارسی کے ہی رہے۔"

پروفیسر سید محمد افضل قادری نے مضمون 'ریاست جموں کشمیر کی عدالتوں میں اردو کا استعمال' میں ریاست کی عدالتوں میں اردو کے استعمال کا جائزہ پیش کیا ہے ساتھ ہی عدالتوں میں اردو کے استعمال کے زوال کی وجہ اور عدالتوں میں کام کرنے والے عملہ، جج صاحبان وغیرہ کی اردو زبان سے ناواقفیت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ اخیر میں سرکار اور قومی کونسل کو اردو کی ترقی کے لیے کچھ تجاویز پیش کی ہیں۔

پروفیسر محمد ظفر محفوظ نعمانی کا مضمون 'اردو کی دستوری و قانونی حیثیت کا تعین اتر پردیش ہندی ساہتیہ سمیلن کے فیصلے کی روشنی میں' کے عنوان سے ہے، انھوں نے اردو کی لسانی حیثیت، تاریخی اور ثقافتی پس منظر، قانونی اور دستوری بنیاد، اردو زبان کی تنفیذ، اتر پردیش میں اردو کی صورت حال اور اردو کی دستوری حیثیت پر عمدہ گفتگو کی ہے ساتھ ہی الہ آباد عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر شوکت اللہ خاں نے اپنے مضمون 'قانون کی تاریخ اور ہندوستان کے نظام تعلیم میں اردو کا رول اور معنویت' میں برٹش نظام میں اردو، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اردو، لسانی سیاست، قوانین کے منفی اثرات، سرکار کے قانون اور ہندی تحریک، ہندوستانی سے ہندی، آزاد ہندوستان میں اردو، مرکزی قوانین اور اردو، صوبائی تصویر، اردو کی ثانوی حیثیت کے لیے جدوجہد، اضافی زبان سے متعلق صوبائی قانون، غیر ہندی صوبوں میں اردو جیسے ضمنی موضوعات پر بھرپور بحث کی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مشتاق احمد 'اردو اقلیتی مسائل سے متعلق نظیری قوانین' وی کے مہیشوری 'عدالتوں میں اردو کا استعمال' مصباح الدین صدیقی 'اردو میں قانونی ادب کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کے عملی اقدامات اور مرکزی قوانین کا اردو ترجمہ و اشاعت' تیج بہادر ہانڈو 'ریاست جموں کشمیر کے قوانین کی ڈرافٹنگ' خلیل احمد 'ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت' تیسرے باب میں شمیم الدین کا مضمون 'مسابقتی امتحانات میں اردو کی اہمیت' حسن ضیا 'سرکاری اور نجی سیکٹر میں اردوں داں افراد کے لیے روزگار کے مواقع' سید ساجد علی 'قانونی افسران و پیشہ وران اور اردو' اور سعود احمد 'کارپوریٹ سیکٹر میں اردو کی اہمیت' کے مضامین ہیں جنھوں نے متعلقہ موضوعات پر مفید گفتگو کی ہے۔

مجموعی طور پر شامل کتاب تمام مضامین معلوماتی اور قانونی ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے یکساں مفید اور کارآمد ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کے علم میں اضافے کا سبب بنے گی اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

تحقیق و تنقید

شاعرہ مصورہ پروین شیر

مصنف: نذیر فتح پوری
صفحات: 128، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: اسباق پبلی کیشنز، پونے (مہاراشٹر)
مبصر: حقانی القاسمی، نئی دہلی

زندہ شخصیات میں بہت کم ایسے خوش نصیب ہیں جن کی زندگی میں ہی ان کی فنی فکری اور تخلیقی قوتوں کا مکمل اعتراف کیا گیا ہو اور ان پر مطالعات کا سلسلہ بھی جاری ہو، ورنہ ہماری زبان کا تو حال یہ ہے کہ یہاں مرنے کے بعد بھی فنکاروں کو دو سطریں نصیب نہیں ہوتیں۔

پروین شیر اس باب میں خوش بخت ہیں کہ ان کی شخصیت اور فکر وفن کے حوالے سے نہ صرف کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں بلکہ اردو کے مقتدر رسائل نے بھی ان پر گوشے شائع کیے ہیں اور واقعی پروین شیر اس کی مستحق ہیں کہ ان کی فکر اور فن کے تمام زاویوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے کیونکہ وہ ایک بڑی فنکارہ ہیں اور ان کی فکر اور فن نے ایک جہان کو متاثر کیا ہے۔ ان کا طرزِ احساس اور طرزِ اظہار بھی ان کے معاصر فنکاروں سے بہت مختلف ہے۔ وہ دل سے سوچتی ہیں اور دل سے ہی لکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں کا اثر براہِ راست دل پر پڑتا ہے۔

پروین شیر کی شناخت کے کئی حوالے ہیں۔ وہ شاعرہ، مصورہ، موسیقار، افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق عظیم آباد کے ایک علمی اور ادبی خانوادے سے ہے۔ 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است' کی ایک مثال۔ ان کے والد سید فضل اللہ قادری اپنے عہد کے دانشور تھے۔ والدہ شکیلہ قادری کا ادبی ذوق بلند تھا۔ بڑے بھائی پروفیسر ڈاکٹر شمس الضحیٰ نہ صرف اردو اور انگریزی کے شاعر بلکہ سائنس داں بھی تھے اور ان کے خسر سید احسن شیر خدابخش لائبریری کے سکریٹری تھے اور ان کے علامہ اقبال اور مولانا آزاد سے گہرے مراسم بھی تھے۔ پروفیسر اختر اورینوی جیسے ناقد ان کے خالو اور ڈاکٹر محمد محسن نفسیات کے ماہر اور افسانہ نگار ان کے نانا تھے۔ شریک حیات وارث شیر ریاضیات اور سیاسیات کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

کناڈا میں مقیم پروین شیر کا تخلیقی کینوس بہت وسیع ہے۔ جہاں ان کی شاعری کو مشاہیر ادب نے سراہا ہے وہیں ان کی مصوری کی ستائش کرنے والوں میں بڑے فنکار شامل ہیں۔ ان کی تخلیقات کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ روس کی مشہور اسکالر لڈمیلا واسیلیوا نے اپنی کتاب میں ان پر ایک خصوصی باب بھی شامل کیا ہے، جس میں ان کی نظموں کے ترجمے روسی زبان میں ہیں۔ پروین شیر کا دائرہ تعارف صرف اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی تخلیقات کی رسائی دوسری زبانوں تک بھی ہے۔

یوں تو پروین شیر پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نذیر فتح پوری نے بھی پروین شیر کی تخلیقی خدمات کا یہ اعترافیہ تحریر کیا ہے اور پروین شیر کی شخصیت اور فکر وفن کے تمام زاویوں کے احاطے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ 'شاعرہ مصورہ پروین شیر' میں پروین شیر پر کئی تحریریں شامل ہیں۔ ان میں تحریری مصاحبہ بھی ہے جس سے ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ میرے لیے پروین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ماں کے وجود کو شاعری، نثر اور مصوری میں ڈھالا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا بہت ہی اہم روپ ہے جس کا اثر ان کی فکر اور اسلوب پر بھی ہے۔ 'پروین شیر کی شاعری میں رشتوں کی اہمیت' میں نذیر فتح پوری نے ان کی شخصیت کے اس جلی عنوان کو بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ پروین شیر کی تخلیق میں 'ماں' کو مرکزیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے مجموعے 'کرچیاں' کا انتساب بھی ماں کے نام کیا ہے۔ نثر اور شاعری دونوں میں ماں کو خراجِ محبت پیش کیا ہے۔ کتاب میں ایک تحریر 'پروین شیر آغوشِ مادر میں' شامل ہے جس میں نذیر فتح پوری نے ماں سے عقیدت و محبت کے پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ 'نہال دل پر سحاب جیسے' کتاب میں ماں کے تعلق سے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اسے پڑھنے کے بعد کوئی بھی فرد جذباتی ہو سکتا ہے۔ پروین شیر لکھتی ہیں:

''ماں... وہ ہوا ہے جس کی لہروں میں دعائیں تیرتی ہیں، وہ شاخ ہے جو اپنے وجود سے قطرہ قطرہ لہو نچوڑ کر اپنے پھولوں کی آبیاری کرتی ہے۔ اس وقت تک جب تک اس کے جسم سے زندگی کی آخری بوند نہ نکل جائے۔'' (ص 11) ماں کے تعلق سے ایسی نظمیں ہیں جنھیں پروفیسر وہاب اشرفی نے ممتا کا غنائی رزمیہ قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں ماں کے سارے روپ نظر آتے ہیں۔ مقدس، پاکیزہ، محبت اور معصومیت سے بھرے ہوئے رنگ۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیگر رشتوں کے حوالے سے بھی نظمیں کہی ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں رشتوں کا پورا احترام ہے اور اپنی شاعری اور مصوری کے ذریعے انھوں نے رشتوں کو نئی زندگی دی ہے۔

نذیر فتح پوری نے پروین شیر کی مصوری پر بھی گفتگو کی ہے کہ وہ ایک بہترین مصور ہیں اور ان کی تمام کتابوں میں مصوری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اس تعلق سے ایک نامور مصور اے ڈرکس کی یہ رائے بہت اہم ہے کہ ''پروین شیر کا آرٹ ان کے دردمند دل کے نہاں خانوں میں تخلیق ہوتا ہے، جس کے سبب وہ ایک بہتر دنیا کی تشکیل کی خواہاں نظر آتی ہیں۔''

حمایت علی شاعر نے بھی ان کی مصوری کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''پروین شیر کی ہر پینٹنگ فکر انگیز، معنی آفریں اور ان کے جمالیاتی احساس کی آئینہ دار تھی۔ ہر تصویر کسی شعر کی تفسیر معلوم ہوتی تھی۔ ان کے کلام میں حزن اور جو کرب محسوس ہوتا ہے وہی ان کی تصاویر میں آباد ہے۔ وہ اپنے رنگ وخطوط سے انسان کے لطیف ترین جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔''

اس کتاب کا ایک عنوان ہے 'پروین شیر: مشاہیر ادب کی نظر میں' جس میں نذیر فتح پوری نے پیرزادہ قاسم رضا صدیقی، قمر رئیس، احمد فراز، ستیہ پال آنند، پروفیسر عتیق اللہ اور دیگر مشاہیر ادب کے تاثرات پیش کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین شیر کی فنی اور فکری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے والوں میں ہمارے عہد کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی ہیں۔

نذیر فتح پوری نے پروین شیر کی کتاب 'کرچیاں' کا بھی ایک اچھا زاویہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے تعلق سے پروین شیر نے بڑی معنی خیز اور کرب انگیز باتیں لکھی ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''تپتی دھوپ میں آٹھ سالہ بچی میری ایئر کنڈیشنڈ کار صاف کرنے لگی تاکہ شام کا کھانا کھا سکے۔ میں نے اس کے نوخیز چہرے پر بوڑھی تھکی ہوئی آنکھیں دیکھیں جہاں شرارت کی جگہ حسرتیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خوابوں کی کرچیوں نے 'کرچیاں' کو جنم دیا!''

دوسری جگہ لکھتی ہیں کہ ''کرچیاں کا جنم یوں ہوا جب میری آنکھوں میں ان بچوں کے چہرے سما گئے جنھیں زندگی تو ملی لیکن اس کے حقوق نہیں۔''

نذیر فتح پوری نے 'کرچیاں' میں شامل غزلوں پر گفتگو کی ہے کہ پروین شیر صرف آزاد نظم کی شاعرہ نہیں بلکہ غزل میں بھی انھوں نے اپنے کمال ہنر کا ثبوت دیا ہے اور غزل کے جمالیاتی معیار کا خیال رکھا ہے۔ نذیر فتح پوری نے پروین شیر کی نظموں کا جائزہ

لیتے ہوئے یہ بہت اچھی بات لکھی ہے کہ ''پروین شیر کی نظموں میں کئی کہانیاں پوشیدہ ہیں۔'' 'پروین شیر کی غزل کائنات' کی بھی نذیر فتح پوری نے خوب سیر کرائی ہے۔ 'چہرہ گل دھواں دھواں سا ہے' کا انھوں نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کے تعلق سے پروفیسر خالد محمود کی یہ رائے بہت اہم ہے کہ ''پروین شیر کی غزلوں میں بھی اداسی اور افسردگی کی وہی کسک ہے جو ان کی نظموں کی پہچان ہے، روانی، سلاست اور وارفتگی بھی وہی ہے۔''

نذیر فتح پوری نے پروین شیر کے سفرنامے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی کتاب 'چند سیپیاں سمندر سے' ایک سفرنامہ ہے جو انگریزی - اردو دونوں زبانوں میں ہے۔ جس میں انھوں نے بہت سے ملکوں کے تعلق سے اپنے تجربات اور مشاہدات رقم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ نذیر فتح پوری نے پروین شیر سے متعلق لکھی گئی کچھ کتابوں پر تبصرے بھی تحریر کیے ہیں، جن میں پروفیسر عتیق اللہ کی مرتب کردہ کتاب 'پروین شیر عہد نا تمام کی شاعرہ' اور 'پروین شیر اور نکتہ وران سخن' قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں پروین شیر کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نذیر فتح پوری نے 'شاعرہ مصورہ پروین شیر' کے عنوان سے ان کی شخصی اور فنی جہات کا عمدہ احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب سے پروین شیر کی تخلیقی شخصیت کے مختلف زاویوں کو سمجھنے کی راہیں روشن ہوں گی۔

نگار خانۂ کولکاتا (مضامین کا مجموعہ)

مصنف: ڈاکٹر امام اعظم

صفحات: 200، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2022

رابطہ: تمثیل نو پبلی کیشنز، محلہ: گنگوارہ

پوسٹ: سارا موہن پور، دربھنگہ 846007 (بہار)

مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، محلہ فیض اللہ خاں، حامد کالونی، دربھنگہ 846004 (بہار)

زیر نظر کتاب 'نگار خانۂ کولکاتا' میں 25 مضامین شامل ہیں۔ کولکاتا میں اردو صحافت، عبدالحلیم شرر اور 'فردوسِ بریں'، عبدالغفور شہباز کے خطوط کی اہمیت، مولانا آزاد: فکر و عمل کے چند درخشاں پہلو، پرویز شاہدی: ترقی پسند تحریک کی توانا آواز، شاکر کلکتوی: منفرد احساس کا شاعر، شاہ مقبول احمد: حیات و خدمات: جائزہ، سیّد لطیف الرحمٰن کی ادبی خدمات، مظہر امام کی شاعری 'زخمِ تمنا' کے حوالے سے، مظفر حنفی کی شاعری کا منفرد آہنگ، علامہ شبلی کے مکاتیب میں اظہار کی خوشبو، ظفر اوگانوی: جدید اردو افسانے کا اہم نام، سیّد محمد اشرف کی 'آخری سواریاں': اردو ناول نگاری کا اہم موڑ، صدیق عالم: 'چارنک کی کشتی' اور 'عورتوں کے مسائل'، ف۔س۔ اعجاز کی غزلوں میں زندگی کی نیرنگیاں، 'ظہیر انور کا ''چراغِ رہ گذر'': اردو سفرنامے کا سنگ میل'، 'اردو ڈراما کا ایک مقناطیسی عنوان: جاوید دانش'، 'سجاد شاکری کا 'رقصِ الہام''، 'ادبِ اطفال میں حشمت کمال پاشا کے کمالات'، 'مصطفیٰ اکبر: عصرِ حاضر کا ایک نمائندہ قلم کار'، 'اقبال جاوید کی کتاب 'آغا حشر کاشمیری: حیات اور ڈراما نگاری''، 'سراج دہلوی کی دوہا نگاری کی انفرادیت'، 'شکیل افروز کی ''ملی صحافت'' ایک بصیرت افروز کتاب'، ''ایس ایم آرزو کی مزاح نگاری' اور 'ندرتِ اظہار کی شاعرہ: ڈاکٹر نگار سلطانہ' کے عنوان سے مشمولہ مضامین یوں تو متفرق شخصیات اور ان کے کارناموں پہ محیط ہیں لیکن ان میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے سبھی قلم کاروں کا اردو کے ایک اہم مرکز کولکاتا سے تعلق۔

ڈاکٹر امام اعظم مطالعہ پسند واقع ہوئے ہیں ساتھ ہی ساتھ تخلیقی ادب کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ تبدیل ہوتے ہوئے ادبی ماحول پر بھی ان کی نظر ہے۔ زبان کے رموز سے واقف ہیں اس لیے ان کی تحریریں پس مطالعہ پر قوت اظہاریہ کی مثال ہیں۔ وہ نہ ہی توصیف میں حدیں پار کرتے ہیں نہ ہی تنقیص ان کا لہجہ ہے بلکہ ایماندارانہ اپروچ سے ہی کام لیتے ہیں، معلومات فراہم کرتے ہیں اور شائستگی سے رائے پیش کر دیتے ہیں۔

'کولکاتا میں اردو صحافت' ایک وقیع مضمون ہے جس میں تمام ممکنہ گوشوں کو روشن کرنے کی سعی ملتی ہے۔ پہلا دیسی اخبار 'بنگال گزٹ'، پہلا اردو اخبار 'جام جہاں نما' مولانا آزاد کے ہفتہ وار اخبارات کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ یہاں سے نکلنے والے روز نامے، ہفتہ وار اخبار، ادبی رسائل و جرائد تحقیقی خو کے ساتھ اس مضمون میں شامل کیے گئے ہیں۔ آج کی صحافت کے حوالے سے اپنے خیالات کا دیانت دارانہ اظہار اس تحریر کا خاصہ ہے۔

عبدالغفور شہباز کے خطوط کے حوالے سے مشمولہ مضمون اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے دامن میں مکتوب نگاری کی اہمیت، اردو میں لکھے گئے مراسلے اور ان سب کے درمیان شہباز کے خطوط کی انفرادیت کو احسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی مقناطیسیت ہی تو ہے کہ ان کے حوالے سے تحریریں وافر مل جاتی ہیں۔ ان میں بعض تحریریں اپنے موضوع اور حسن بیان کے سبب متاثر کر جاتی ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کا مضمون 'مولانا آزاد: فکر و عمل کے چند درخشاں پہلو' اسی زمرے میں آتا ہے۔

''مظہر امام کی شاعری 'زخمِ تمنا' کے حوالے سے' کی گئی گفتگو میں فنکار کی عظمت کے اسباب اور شاعری کے حسن کی جلوہ سامانیوں کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق:

''مظہر امام نے نظموں میں جو تجربے کیے ہیں ان کی حیثیت اور انفرادیت مسلم ہے۔ ان نظموں میں جو سلیقہ ہے اس سے وہ تلخی بھی معدوم ہو جاتی ہے جو روایتی اور مثالی تصور کے سبب ان کی حق گوئی کے طفیل جنم لیتی ہے۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام ہے اور فنکارانہ ایمان داری بھی۔'' (ص 105-106)

یہ سچ ہے کہ 'بیچ کا ورق' اردو افسانے کے جدید دور کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں تجرید، علامت، اشارے، معنوی تہہ داری کی ایک الگ دنیا آباد تھی۔ 'ظفر اوگانوی: جدید اردو افسانے کا اہم نام' کے یہ جملے تخلیق اور تخلیق کار کو جاننے میں مددگار ہوں گے:

''ظفر اوگانوی کے یہاں علامت نگاری اور حقیقت نگاری دو متضاد صورتوں میں نہیں ہے بلکہ حقیقت کو پیش کرنے کے لیے علامت ایک اسلوب ہے۔ ان افسانوں میں جگہ جگہ معنی خیز علامتوں نے جو اجتماعی شکل اختیار کی ہے، وہ افسانہ کی اندرونی کیفیات کو بیرونی معنویات سے آشکارا کر رہی ہے...'' (ص 134)

نگار خانہ کولکاتا میں جہاں پرانے قلم کاروں کی کہکشاں آباد ہے وہیں معاصر تخلیق کاروں کی دنیا بھی سجائی گئی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ انھوں نے نئی نسل کی ادبی آبیاری میں بھی حصہ داری نبھائی ہے۔

مضمون نگار نے 'پیش نامہ' میں اپنا تنقیدی موقف واضح کیا ہے۔ اس روشنی میں ان کی تحریریں ایک خوشگوار اظہاریہ کی مثال معلوم پڑتی ہیں اور تنقید کے اصل معنی و مطالب کی ہم آہنگی کے سبب رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے نیز صاحب کتاب کے ادبی نظریے سے مطالعے کی راہ آسان ہوتی ہے۔

'نگار خانۂ کولکاتا' میں شامل مضامین اصناف ادب کے اعتبار سے بھی تنوع رکھتے ہیں۔ صحافت، شاعری، ناول، افسانہ، ادب اطفال، ڈرامہ، مکتوب، سفر نامہ کا مطالعہ صاحب کتاب کی وسیع النظری کہی جائے گی۔ اگر زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو تقریباً

ڈیڑھ سو برس پر محیط عنوانات یہاں موجود ہیں۔ ف س اعجاز، ظہیر انور، جاوید دانش، سجاد شاکری، حشمت کمال پاشا، مصطفیٰ اکبر، اقبال جاوید، سراج دہلوی، شکیل افروز، ایس ایم آرزو، ڈاکٹر نگار سلطانہ کے لیے منتخب عنوانات کے تحت کی گئی گفتگو میں تازگی اور ذاتی کاوشوں کے ساتھ مجموعی ادبی فضا کا بھی ذکر اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کے ادبی مضامین کا یہ مجموعہ اپنے مشمولات اور پیش کش کے لحاظ سے اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ علم و ادب کے شائقین کے لیے کولکاتا کی ادبی شخصیات اور ان کے انفرادی کارناموں کو جاننے میں یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

رباعی تحقیق

مصنف: ڈاکٹر امیر حمزہ

صفحات: 224 قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی

مبصر: محمد شاداب شمیم، ڈی 35، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک مکمل مضمون بیان کیا جاتا ہے، اس کا وزن متعین ہے اور اس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے کو ہم قافیہ لانا ضروری ہے، رباعی میں ہر طرح کے موضوع کو بیان کیا جاتا ہے اور بیان کیا جاسکتا ہے، زیر تبصرہ کتاب 'رباعی تحقیق' ڈاکٹر امیر حمزہ کی تصنیف ہے، یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے رباعی تحقیق کی ایک صدی پر محیط ہے، یقیناً حافظ محمود شیرانی کے بعد سے اب تک رباعی تحقیق پر کئی کتابیں منظر عام پر آئیں اور عوام و خواص میں مقبول ہوئی ہیں۔ ان میں رباعی: فنی و تاریخی ارتقا (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)، اردو رباعیات (ڈاکٹر سلام سندیلوی)، رباعی، مقدمہ رباعی (سید وحید اشرف کچھوچھوی)، رباعی ایک عروضی مطالعہ (عظیم الرحمٰن) وغیرہ اہم کتابیں ہیں اور رباعیات اور فن رباعیات کا احاطہ کرتی ہیں، مگر 'رباعی تحقیق' کے متعلق مصنف کا دعوی ہے کہ یہ کتاب پوری ایک صدی کے فاصلے کو مٹا رہی ہے۔ اس کتاب کے مشمولات کو دیکھ کر واقعی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بہت ہی محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کو تحریر کیا ہے، اور رباعی سے متعلق جتنے بھی موضوعات ہو سکتے ہیں ان سب کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ رباعی تحقیق پر مشتمل ہے اور اس کے آٹھ حصے ہیں، جس میں فارسی شاعری کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے اور ترانہ کا سفر رباعی تک کیسے پہنچتا ہے اس کو قدیم متون سے مدلل و مفصل انداز میں پیش کرنے کوشش کی گئی ہے، پہلا عنوان فارسی کتب سے ہے، جس میں فارسی کتب میں اس موضوع کے شواہد پر گفتگو کی گئی ہے، اور سرود، چکامہ، ترانہ، بیت، قول، بیت عربی یا فارسی، دوبیتی، دوازدہ ہجائی، فہلویات کا وزن، فہلویات پر عروض، صنف ترانہ، چہارگانی، نتائج، رباعی کا ظہور، اقتباسات کے نتائج، لفظ رباعی کا وجود اور رباعی کا سرا پر بات کی گئی ہے۔ دوسرا عنوان شعرالعجم ہے، اس میں اردو رباعی پر بہت ہی مختصر گفتگو کی گئی ہے، لیکن اس پر گفتگو اس لیے ضروری ہے کہ رباعی کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی نے ایک نئی بحث چھیڑ لی تھی، لیکن افسوس کہ بعد کے رباعی ناقدین نے ان کی آرا کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ علامہ شبلی کی بات پر بھی توجہ دی جاتی، لیکن زیادہ تر رباعی ناقدین نے حافظ محمود شیرانی کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے میں ہی عافیت سمجھی، اور ان کے نظریے کی ڈور کو بہت مضبوطی سے تھامے رکھا، تیسرے عنوان کے تحت سید سلیمان ندوی کی مشہور زمانہ کتاب 'خیام' پر گفتگو کی گئی ہے، اس کتاب میں سید سلیمان ندوی نے رباعی پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اس کے مختلف نکات کو بیان کیا ہے، خیام میں سید سلیمان ندوی نے حافظ محمود شیرانی پر کئی اعتراضات کیے ہیں جنھیں مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے، رباعی تحقیق کے مصنف نے اس حصے میں سلیمان ندوی اور حافظ محمود شیرانی کی رائے کو سامنے رکھ کر اپنی رائے قائم کی ہے جو کہ واقعی اس کتاب کا دلچسپ پہلو ہے، مصنف لکھتے ہیں "خیام میں مولانا سید سلیمان ندوی نے فارسی شاعری پر عمومی اور صنف رباعی پر تفصیلی بحث کی ہے، بحث کی ابتدا میں ہی جب معیار الاشعار کا نام آتا ہے تو سید سلیمان ندوی اس کے مصنف کے بارے میں مشکوک ہوجاتے ہیں، لیکن ان کا یہ شک اصل متن میں نہیں بلکہ حاشیے پر سامنے آتا ہے جہاں انھوں نے محمود شیرانی پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے بلا کسی تحقیق کے معیار الاشعار کو طوسی کی تالیف بتایا ہے جب کہ مشرق و مغرب کے فضلا اسے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں جس کی دلیل میں عبدالوہاب قزوینی اور ڈاکٹر ریو کی عبارتوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں، حافظ محمود شیرانی ان کے اس شک کو بہت ہی تفصیل سے دور کرتے ہیں اور تیرہ ایسے دلائل و ثبوت پیش کرتے ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ معیار الاشعار طوسی کی تصنیف ہے۔"

فرمان فتح پوری کی کتاب 'اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقا' پر پانچویں عنوان کے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے، مصنف کے مطابق اس کتاب میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جن کا ذکر حافظ محمود شیرانی نے کیا ہے اور یہ اپنی کتاب میں محمود شیرانی کے متبع نظر آتے ہیں، ساتویں عنوان کے تحت محمد ارشاد کی کتاب 'رباعی: تحقیق و تنقید' کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، اس کتاب میں انھوں نے خاص طور پر رباعی تحقیق کو موضوع بنایا ہے، اس کتاب کے متعلق مصنف لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع نہیں ہو سکی اور نہ ہی علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کے متعلق کوئی بات سنائی دیتی ہے، محمد ارشاد نے اپنی کتاب میں رباعی کی ابتدا کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کئی دلائل بھی دیے ہیں، رباعی تحقیق کے مصنف ڈاکٹر امیر حمزہ نے اس کتاب پر کھل کر بات کی ہے اور ان کے دعووں پر سلسلے وار گفتگو کی ہے، دعوی اور دلیل کو جس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے وہ اس کتاب کا خاصہ ہے۔ آٹھواں عنوان ڈاکٹر سیروس شمیسا کی فارسی کی مشہور کتاب 'سیر رباعی' ہے۔ اس کتاب میں رباعی سے متعلق جو معلومات ملتی ہیں وہ دوسری کتابوں سے یکسر مختلف ہیں، مصنف اس کتاب کے تحت گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اہل فارس نے محسوس کر لیا تھا کہ ترانہ ایک وسیع صنف سخن ہے جبکہ اردو والے اب بھی اس کو محدود صنف سخن سمجھتے ہیں اور ایسا صرف روایت کو مضبوطی سے تھامنے کی وجہ سے ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ترانہ کو وسیع صنف سخن کی حیثیت سے دیکھا جائے نہ کہ اس کو محدود کر کے، محدود کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعد کے حضرات پھر دوسری طرف غور نہیں کر پاتے اور ایک وسیع مفہوم کو کم علمی کی وجہ سے محدود کرنا پڑ جاتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ 'اردو میں رباعی کا فن' ہے، اس میں رباعی کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، موضوعات کے اعتبار سے بھی اس میں کافی تبدیلی ہوئی ہے اور حالی کے بعد سے ہی اس کے موضوعات میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی تھی، جوش اور فراق جیسی قد آور شخصیات نے بھی اس کے موضوعات میں خاطر خواہ تبدیلی کی، اس کے علاوہ رباعی کے اوزان پر بھی نئے نئے تجربے ہوئے، چوبیس مروجہ اوزان کے بعد سحر عشق آبادی نے بارہ نئے اوزان کا اضافہ کیا، اس کے بعد ان کے شاگرد زار علامی نے اٹھارہ مزید اوزان کا اضافہ کیا تو رباعی کے اوزان کی تعداد چون ہوگئی، ان دونوں حضرات کے

بعد ممبئ کے عبید اعظم اعظمی نے رودکی کے اوزان کو بنیاد بنا کر اٹھائیس نئے اوزان مرتب کیے،اس طرح اردو رباعی کے اوزان کی تعداد بیاسی ہوگئی۔اس کتاب میں رباعی کے اوزان پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور ان کی تعداد میں جو اضافے ہوئے ہیں ان پر بھی خاطر خواہ گفتگو کی گئی ہے۔اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ رباعی اردو میں کسی منجمد صنف سخن کا نام نہیں بلکہ یہ بھی تغیر وتبدل کو قبول کرتی ہے، مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے رباعی تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا اور یہ قارئین کے لیے معلومات افزا ثابت ہوگی۔

مضامین

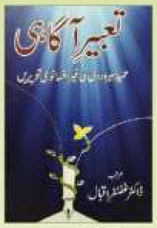

تعبیر آگاهی

مرتب :ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 592، قیمت: 337

زیر اہتمام: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی 2

مبصر: ابوالبشر، شعبہ اردو، اے ایم یو علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب 'تعبیر آگاہی' حمید سہروردی کی غیر افسانوی تحریروں کا مجموعہ ہے ان میں وہ تحریریں ہیں جو رسائل میں شائع ہوئیں ان میں خودنوشت، مضامین، مراسلہ، خاکہ، تاثرات، تبصرہ، تجزیہ،فیچر، مباحثہ، تراجم وغیرہ شامل ہیں۔ان بکھری ہوئی تحریروں کو مرتب کرنے کا سہرا ڈاکٹر غضنفر اقبال کے سر جاتا ہے۔صاحب تحریر اردو ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ان کی غیر افسانوی تحریروں سے متعلق سید محمد اشرف کا تاثر پیش کرتا ہوں، جو اس کتاب میں شامل ہے:

''مضامین پڑھنے کے بعد ایک خوشگوار احساس سے دوچار ہوا کہ آپ کا تعلق صرف تخلیقی فنکار کی حیثیت سے تھا، اب آپ کی تنقیدی بصیرت کے جلوے بھی نظر آئے۔میرے خیال میں تخلیق کاروں کو وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین لکھتے رہنا چاہیے تا کہ ذہن تجزیاتی معاملات سے بالکل بھی غیر مانوس نہ ہوجائے۔''

بیسویں صدی کی آخری دو دہائی کے علاوہ اکیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی کے معروف قلمکاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔حمید سہروردی شش جہات مشہور ومقبول شخصیت کے مالک ہیں۔

پروفیسر حمید سہروردی کی مختلف تصانیف منظرِ عام پر آئیں۔ ریت ریت لفظ (افسانے، 1980)، عقب کا دروازہ (افسانے، 1987)، بے منظری کا منظرنامہ (افسانے 1996)، بین السطور (مضامین 1998)، شش جہت آگ (نظمیں 2002)، شہر کی انگلیاں خونچکاں (افسانے 2015)۔

انھوں نے اپنی تحریروں میں صاف، سلیس، سادہ اور عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے جو قاری کو باسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔

اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف کو سر سید احمد خاں نے متعارف کرایا تھا جس کی پیروی کرتے ہوئے مصنف نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اس کے علاوہ عہد حاضر میں ادبی صحافت کے فروغ کی وجہ سے مراسلہ نویسی کے فن میں اضافہ ہونے لگا۔ حمید سہروردی نے رسائل اور اخبارات کے لیے مراسلے بھی لکھے ہیں۔ خاکہ نگاری میں حمید سہروردی نے خاص دلچسپی لی اور مختلف مشہور شخصیات کے سانحہ ارتحال پر تاثراتی وتعزیتی خاکے تحریر کیے جن میں جوگندر پال، زبیر رضوی، بشر نواز، یوسف ناظم، حمید الماس، احسن یوسف زئی، ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی، ڈاکٹر شکیب انصاری اور رشید جاوید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تبصرہ نگاری کی بھی ایک روایت رہی ہے، اسی روایت کا اہتمام کرتے ہوئے انھوں نے مختلف مشاہیر ادب کی متعدد مشہور زمانہ کتابوں پر تبصرے بھی کیے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ ان تبصروں کے مطالعے سے قاری کو ان کی تبصرہ نگاری اور ادبی روایت کا علم ہوگا، جیسے جوگندر پال، پرفیسر اختر یوسف، فیروز عابد، رشید انور، حیدر قریشی، نثار احمد صدیقی، ذاکر شبنم، سلام بن رزاق، پروفیسر ارتضیٰ کریم وغیرہ۔

حمید سہروردی کی تجزیہ نگاری بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ تجزیہ کسی بھی فن پارے کی تفہیم، تشریح، توضیح اور تفصیل کے لیے ضروری ہے۔انھوں نے محمد علوی، جاوید ناصر، ڈاکٹر کوثر پروین، ضیا کرناٹکی وغیرہ کی نظموں اور افسانوں کا تجزیہ تنقیدی بصیرت کے ساتھ کیا، جس سے انھوں نے بین السطور میں پوشیدہ متن کو آسان بنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری بھی حمید سہروردی کی ادبی وعلمی لیاقت کا مداح ہوجاتا ہے۔ان تمام کارناموں کے علاوہ بھی ان کی اس کتاب میں رپورتاژ، فیچر، مباحثہ اور تراجم شامل ہیں۔ان تمام فنون پر جب بھی حمید سہروردی نے قلم اٹھایا تو کمال کردیا۔فیچر نگاری کے بارے میں حامد اکمل لکھتے ہیں کہ:

''حمید سہروردی کا فیچر 'میں آندھیوں کے پاس تلاشِ صبا میں ہوں' ازلی ڈرامے کو لفظوں کے ذریعے عکسانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔تہذیب وتمدن کا عروج، انسانی زندگی کی آسائشوں کا فروغ لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کو غلام بنانے کی انسان کی کوششیں، اسی صورت حال میں فن کار کے احتجاج کی ہلکی سی جھلک بھی اس فیچر میں موجود ہے... اس فیچر میں حمید سہروردی کی فلسفیانہ فکر بھی مکالموں کی برجستگی میں اپنے جلوے دکھا رہی ہے۔''

حمید سہروردی کی تحریروں کے بے شمار رنگ ہیں، ان کی تحریروں کی زبان صاف، سلیس اور سادہ ہے۔ان کے مطالعے کے دوران قاری کو بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔

انٹرویو

معاصر مشاہیر ادب کا انٹرویونامہ

مرتب: شبیر مصباحی (دراس کرگل)

سن اشاعت: 2022

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی

مبصر: ڈاکٹر ریاض توحیدی، واڈی پورہ، ہنڈواڑہ، کشمیر

''شخصیت خوبصورتی سے زیادہ اہم ہے، لیکن تخیل دونوں پر فوقیت رکھتا ہے۔'' (ٹیلر)

اور.... کتاب 'معاصر مشاہیر ادب کا انٹرویو نامہ' شخصیت اور تخیل کی کارگزاری کا خوبصورت تعارف نامہ ہے، کیونکہ اس میں شخصی کوائف کے ساتھ ساتھ علمی وادبی کام کا جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مشاہیر کے معنی نامور لوگ یا مشہور لوگ، یعنی وہ لوگ جو زندگی کے کسی فن یا شعبے میں شہرت پا چکے ہوں۔تو مشاہیر ادب کے زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں جو ادب میں اپنی علمی وادبی خدمات کی بدولت مشہور ہوئے ہوں اور انٹرویو کے معنی ملاقات یا دوبدو گفتگو کرنا وغیرہ ہیں۔اب سائبر ٹیکنالوجی کی سہولت کے پیش نظر کسی بھی شخصیت کا انٹرویو آن لائن یا آف لائن لیا جاتا ہے اور کبھی کبھی سوال نامہ بھی ارسال کردیا جاتا ہے تا کہ اس شخصیت کی حیات، خدمات، مشاہدات، تجربات اور خیالات کا تعارف نامہ منظر عام پر آسکے۔ انٹرویو کی کئی قسمیں ہیں، جن میں حصول ملازمت، سیاسی اور ادبی انٹرویوز بھی آتے ہیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا، اخبارات اور رسائل وجرائد میں کسی بھی سیاسی، سماجی، مذہبی، علمی

وادبی وغیرہ شخصیات کے انٹرویوز پیش کرنے یا شائع کرنے کی روایت پہلے سے ہی چلی آرہی ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انٹرویو نگاری کی روایت مستحکم نظر آتی ہے۔ادب میں تو اب انٹرویو نگاری ایک صنف بن چکی ہے۔انٹرویو نگاری کے تعلق سے اردو میں کئی کتابیں سامنے آئی ہیں۔اور اخبارات ورسائل میں بھی انٹرویو شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں ان کہی باتیں... انٹرویوز کا مجموعہ (غضنفر اقبال)، گفت وشنید (اکبر زاہد)، سو تکلف اور اس کی سیدھی بات (ڈاکٹر انیس صدیقی)، خانہ تکلم (اکرم نقاش)، مکالمات (جاوید یزدانی)، اردو دنیا، آجکل، ایوان اردو، شیرازہ، استعارہ، فنون، قومی تنظیم، نوائے وقت، انقلاب، رہنمائے دکن، نیا نظریہ، کشمیر عظمیٰ، تعمیل ارشاد وغیرہ شامل ہیں۔

پیش نظر کتاب معاصر مشاہیر ادب کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔جس کا مطالعہ ان شخصیات کی حیات، علمی وادبی خدمات کے علاوہ ان کے تجربات و مشاہدات اور خیالات کا ایک معلومات افزا تحریری منظر نامہ قاری کے سامنے لاتا ہے جو کہ علمی اور ادبی طور پر بڑی اہمیت کا کام ہے۔کیونکہ اتنی شخصیات کی شخصی اور علمی وادبی جانکاری ایک ہی کتاب میں مل جانا کسی قیمتی تحفے سے کم نہیں ہے۔کتاب میں درج ذیل انیس شعرا وادبا کے انٹرویوز شامل ہیں: نورشاہ، رفیق راز، عبدالغنی شیخ، دیپک بدکی، شموئل احمد، عبدالرشید راہگیر، ڈاکٹر بلند اقبال، سید سرور غزالی، دیپک کنول، ڈاکٹر شفق سوپوری، ڈاکٹر نذیر آزاد، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر شیخ اعجاز، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری، محمد شفیع ساگر، عمران ممتاز، عبدالخالق ہمدرد...

چونکہ یہ کتاب کی پہلی جلد ہے اور ایک طرح سے ابتدائی مشق ہے، اس لیے اس میں فی الحال اتنے ہی افراد شامل ہوئے ہیں۔اگر چہ مصنف نے کئی اور لوگوں سے بھی رابطہ کیا تھا تاہم جن کے جوابات موصول ہوئے وہ کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اس میں مشاہیر ادب کا تعارف، ان کی تحریری و تخلیقی کارگزاری، تصانیف، زندگی کے نشیب وفراز، ادبی کام کی روداد، تجربات ومشاہدات، اردو زبان وادب کی موجودہ صورت حال و مستقبل اور نئی نسل کے لیے پیغامات کا ایک معلومات افزا اور قابل غور انٹرویو نامہ جمع ہوا ہے۔ہر ایک کے جوابات میں اس ادیب یا شاعر کی حیات اور ادبی کام کے ساتھ ساتھ زندگی کے اہم واقعات، تجربات اور خیالات کا دلچسپ معروضی خاکہ سامنے آیا ہے۔جو پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ بھی کرتا ہے اور ان کے تجربات و مشاہدات سے فیض یاب ہونے کا باعث بھی بن رہا ہے۔چونکہ مصنف لداخ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہاں پر لداخ کے ایک معروف افسانہ نگار اور تاریخ دان جناب عبدالغنی شیخ لداخی کے انٹرویو سے اقتباس پیش کریں گے تاکہ کتاب کی اہمیت اور ایک ادیب کے ادبی کام کا ایک جامع احاطہ سامنے آسکے:

''میں نے اب تک سترہ کتابیں لکھی ہیں۔جن میں چار افسانوی مجموعے، دو ناول، لداخ کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، لوک ادب، ثقافت وغیرہ پر چھ کتابیں تحریر کی ہیں۔اُن میں تین کتابوں کے مسودوں پر ایوارڈ ملے لیکن یہ کتابی صورت میں نہیں چھپیں۔میں نے اسلام اور سائنس (مذہب) صونم نوربو (سوانح حیات) اور مہاتما گاندھی کا فلسفہ حیات (فلسفہ) کے موضوعات پر تین کتابیں لکھی ہیں۔نیز مذہب، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، سیاست اور سفر نامہ جیسے موضوعات پر مضامین لکھے ہیں اور چھپے ہیں۔لداخ کی تاریخ سے مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے میں نے ادب میں جتنا وقت دیا ہے شاید اتنا ہی وقت تاریخ کے ریسرچ میں دیا ہوگا۔'' (عبدالغنی شیخ لداخی)

مجموعی طور پر دیکھیں تو پیش نظر کتاب 'معاصر مشاہیر ادب کا انٹرویو نامہ' ہمعصر ادیبوں کے شخصی، علمی وادبی تعارف اور ان کی ادبی خدمات اور تجربات ومشاہدات کا ایک خوبصورت ادبی گلدستہ ہے، جو قاری کے ذوق مطالعہ کو مہکاتا ہے۔یہ کتاب جامعاتی سطح پر نوجوان اسکالرز کو تحقیقی کام انجام دینے کے لیے جامع انداز کا ایک تعارفی مواد فراہم کر کے اپنی اہمیت وافادیت کی عکاسی بھی کرتی ہے۔اس نوعیت کا ادبی کام بہت کم لوگ انجام دیتے ہیں، جس کے لیے وقت صرف کرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی توانائی اور و مالی سرمایہ بھی درکار ہوتا ہے۔چونکہ میں ذاتی طور پر مصنف کی اردو زبان وادب اور ادبا وشعرا کے تئیں دلی محبت اور خطہ لداخ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کی فروغ اردو زبان وادب اور سماجی خدمات سے بھی بہت حد تک آگاہ ہوں، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مصنف شبیر احمد مصباحی کا یہ علمی وادبی کام قابل ستائش ہے۔امید ہے کہ قارئین کرام کتاب سے مستفید ہو کر اس کی ستائش بھی کریں گے۔

تاریخ

تاریخ زرنگار برھانپور

مصنف: جاوید انصاری

صفحات: 504، قیمت: 480 روپے،

ناشر: دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہانپور، مہاراشٹر

مبصر: ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی، موظف ناظم کتبات محکمۂ آثارِ قدیمہ حکومت ہند، ناگپور، نیا بازار کامٹی (ناگپور) 441001 (مہاراشٹر)

تاریخ زرنگار برہانپور 650 سالہ تحقیقی جائزہ ہے جس میں ماضی سے لے کر اب تک کی تاریخی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔

جہاں تک برہانپور کی تاریخ کا تعلق ہے اس سلسلے میں جاوید انصاری فرماتے ہیں، برہانپور ہی ایسا شہر ہے جہاں کی کوئی جامع اور مکمل تاریخ مرتب نہیں ہوسکی۔بعض مخلص احباب نے برہانپور کی مکمل تاریخ کے لیے اصرار کیا یہ ایک بے حد دشوار کام تھا جو مجھ ناچیز کے لیے آسان نہ تھا، خدا کا شکر ہے کہ میری محنت کارگر ثابت ہوئی اور تاریخ مکمل ہوئی۔

کتاب کا پہلا باب قدیم صوبہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔اس باب میں صوبہ خاندیش میں جو علاقے شامل رہے ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔واضح کیا گیا ہے کہ مہاراشٹر کے دو اضلاع دھولیہ اور جلگاؤں بھی قدیم صوبہ خاندیش کا حصہ رہے ہیں۔ خاندیش مشرقی اور مغربی دو حصوں پر مشتمل ہے۔

دوسرا باب آسیر گڑھ کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے۔آسیر گڑھ مشہور زمانہ قلعہ رہا ہے۔ عہد قبل مسیح سے جن خاندانوں یا حکمرانوں کے تابع یہ قلعہ رہا ہے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔خاندیش کے فاروقی حکمرانوں نے اس قلعے کی تعمیر ومرمت اور استحکام میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا ہے۔یہ ان کی جائے سکونت بھی رہا ہے۔

تیسرا باب خاندان فاروقیہ کے حالات پر مبنی ہے۔ 890ھ میں ملک راجہ فاروقی نے اس علاقے میں اپنی حکمرانی قائم کی۔ملک راجہ فاروقی کو بعد وفات تھالنیر میں دفن کیا گیا۔آخری حکمراں بہادر خان فاروقی کو اکبر نے خاندیش/آسیر گڑھ پر فوجی کارروائی کر کے 1009ھ میں گرفتار کرلیا۔

چوتھا باب علماء مشائخ کے حالات پر ہے۔یہ باب بہت ہی اہم اور معلوماتی ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے پیر بناں کا ذکر موجود ہے۔یہ شاہباز قلندر کے مرید وخلیفہ تھے۔دوسرا ذکر حضرت برہان الدین غریب سے متعلق ہے۔انھوں نے عہد تغلق میں دہلی سے دولت آباد کا رخ کیا اور اس مقام پر پہنچے جسے بسانا کہا جاتا تھا، وہیں برہانپور آباد ہوا اور انھیں کے نام سے شہر برہانپور وجود میں آیا۔

پانچواں باب آثار وعلائم کے نام سے ہے۔اس باب میں برہانپور کی مسجد کلاں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ہے جسے نصیر خاں فاروقی نے 802ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

چھٹے باب میں شاہی جامع مسجد برہانپور کی مکمل تاریخ اور حقائق بیان کیے گئے ہیں۔اس کی تعمیر صدر دروازہ، صحن، سفیدی مائل سیاہ پتھر کا مسجد تعمیر میں استعمال، اندرونی حصے میں چمکدار سیاہ پتھر سے مسجد کی محرابیں، چھت کی اندرونی خوشنما تعمیر اور نقاشی وغیرہ کو بڑے سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں مغل دور کے امرا، سپہ سالار اور صوبے داروں کے حالات کا ذکر ہے جن کا قیام برہانپور میں رہا۔ان کی دینی تصانیف کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑا۔انہی شخصیات میں عبدالرحیم خانخاناں ابن بیرم خاں تھے، شاعری ادب اور فوجی صلاحیت کے مالک تھے،عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی زبانوں کے ساتھ ساتھ پوربی زبانیں بھی جانتے تھے،ان کی سب سے اہم کتاب مآثر رحیمی ہے۔

آٹھواں باب آصف جاہی دورِ حکومت سے متعلق ہے۔نواب آصف جاہ اول یعنی حیدرآباد کے نظام سے شروع ہوکر نواب احمد علی خاں ناصر جنگ،نواب آصف جاہ ثانی،نواب آصف جاہ سوم،نواب آصف جاہ چہارم،نواب آصف جاہ پنجم،نواب آصف جاہ ششم اور نواب آصف جاہ ہفتم پر مشتمل ہے۔

نویں باب میں مرہٹہ پیشوا اور سندھیا کے دورِ حکومت، مرہٹہ دور کے علما وصوفیائے کرام، مشہور منادر، گرودواروں، جین مندر، ڈگمبر جین مندر، گرودوارہ بڑی سنگت، درگاہِ حکیمی، مسجد دائی انگہ، مسجد سکندر شاہی، مسجد شاہباز خاں، ہندوستانی مسجد اور تارا مسجد سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

دسویں باب میں انگریزی دورِ حکومت میں برہانپور میں پانی کی سپلائی کا نظام برہانپور ممبئی ریلوے لائن، تاپتی مل کا قیام، رابرٹ سن اسکول کا قیام، 1948 میں سبھاس ہائی اسکول کا نام دیا گیا، بوہرہ برادری کے دو اسکول قادریہ جسے ہائی اسکول اور حکیمیہ ہائی اسکول کا قیام، ممبر آف پارلیمنٹ عبدالقادر صدیقی، گنگا چرن دکشت، پرمانند جی گوندوالا، ڈاکٹر فیروزہ علی، سیٹھ محمد ہارون سوت مل، شکر کارخانہ، پاورلوم، صنعت، بیڑی صنعت، قادریہ کالج، جامعہ اشرفیہ اظہار العلوم، مدرسہ فیض العلوم، جامعۃ الطاہرات، دارالعلوم شیخ علی متقی، گورنمنٹ آیورویدک کالج، سیفیہ حمیدیہ یونانی کالج، سیوا سدن کالج اور گورنمنٹ گرلس پولی ٹیکنک کالج کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

گیارہواں باب علمی وادبی گوشہ ہے۔برہانپور میں جنھوں نے تحقیق وتصنیف نظم ونثر کے ذریعے شہرت حاصل کی، ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان ناموران شہر کی ایک لمبی فہرست ہے۔مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علمی اور ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جائے گی۔

ترتیب

ظفر اوگانوی بیج کا ورق کے تناظر میں

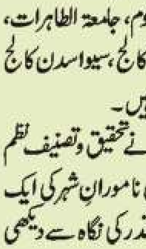

مرتب: دبیر احمد

صفحات: 344، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: مدیحہ پبلی کیشنز، 44بی، کارل مارکس سرانی، کولکاتا۔ 700023

مبصر: محمد منظر حسین، اسسٹنٹ پروفیسر، پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج، کولکاتا۔ 700013 (مغربی بنگال)

ظفر اوگانوی کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، تنقید نگار، محقق، شاعر اور ہردل عزیز استاد تھے۔جدیدیت کے بانی شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کا نظریہ قارئین تک پہنچانے کے لیے رسالہ 'شب خون' جاری کیا۔اس رسالہ میں کسی کی تخلیق شائع ہونا باعث افتخار سمجھا جاتا تھا اور یہ افتخار ظفر اوگانوی کو بھی حاصل تھا۔کیونکہ اس رسالے میں ان کی تخلیقات پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔اسی سے ان کے جدیدی ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انھوں نے کبھی بھی تعداد کو اپنی کامیابی کا ضامن بننے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ 'تعداد' سے زیادہ 'معیار' پر توجہ دی۔اس تعلق سے وہ خود لکھتے ہیں:

''جہاں تک تعداد کا تعلق ہے، میں نے...اس حد تک کم لکھا ہے کہ بعض ناقدین مجھے افسانہ نگار ماننے کو تیار ہی نہیں ہیں، مگر میں کہ خود شناسی کا قائل ہوں، اس لیے سمجھتا ہوں کہ میں [نے] گرچہ بہت کم لکھا ہے لیکن دوسرے بسیار نویس معاصر افسانہ نگاروں سے بہت اچھا لکھا ہے۔'' (ظفر اوگانوی بیج کا ورق کے تناظر میں، ص10)

جدیدیت سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں علامتوں کا خوب استعمال کیا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ علامت نگاری کے نام پر غیر معیاری چیزیں بھی ادب میں پیش کرنے لگے، جس کی وجہ سے جدیدیت کی مخالفت بھی ہونے لگی لیکن ظفر اوگانوی نے معیار کا پورا خیال رکھا۔انھوں نے علامت کے نام پر کبھی بھی ادب سے کھلواڑ نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا صرف ایک ہی افسانوی مجموعہ 'بیج کا ورق' ہے، جو کہ کل گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔لیکن ان افسانوں میں جس طرح کی علامتوں کا استعمال تخلیق کار نے کیا ہے وہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔یہ علامتی افسانے انہیں ہی سمجھ میں آسکتے ہیں، جو ادب کے غواص ہیں۔اس مجموعے کی اشاعت 1977 میں کلکتہ سے ہوئی۔

'بیج کا ورق' میں شامل افسانوں کی مشکل پسندی کو دیکھتے ہوئے دبیر احمد نے ماہرین ادب سے ان افسانوں کا تجزیہ کروا کر کے انھیں افسانوں کے ساتھ شائع کر کے قارئین کے لیے آسانی فراہم کردی ہے۔گرچہ یہ تجزیے حرف آخر نہیں ہیں، ان میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔مرتب نے افسانوں کے تجزیے کے لیے اہم لوگوں کا انتخاب کیا ہے جن میں سے بعض نے معذرت کرلی کیونکہ ظفر صاحب کا افسانہ بہت سے لوگوں کی پہنچ سے باہر ہے۔اس تعلق سے دبیر احمد 'حرف نسبت' میں لکھتے ہیں:

''ظفر اوگانوی کا افسانوی مجموعہ 'بیج کا ورق' میں شامل افسانوں کے تجزیے میں میری پوری کوشش رہی کہ ان اصحاب قلم کے مضامین شامل ہوں، جنہوں نے اردو ادب نیز 'جدیدیت' کو سمجھا ہے۔مجھے شدید حیرت اس وقت ہوئی، جب بعض افراد نے تجزیہ نہ کرنے کے مختلف جواز فراہم کیے۔میرا خیال ہے کہ وہ ظفر اوگانوی کے افسانوں کو سمجھ ہی نہ سکے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔یہ تو وہی بات ہوئی کہ آج بھی بعض حضرات ایسے ہیں، جو غالب اور اقبال کو سمجھنے سے قاصر ہیں، تو اس میں بھلا غالب اور اقبال کا کیا قصور ؟۔'' (ظفر اوگانوی بیج کا ورق کے تناظر میں، ص74)

اس کتاب میں سبھی افسانوں کے تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چھ افسانوں کے تجزیے دو دو لوگوں نے کیے ہیں۔چار افسانوں کے تجزیے تین تین لوگوں نے کیے ہیں، جب کہ صرف ایک افسانہ 'ریس کے گھوڑے' کا تجزیہ چار لوگوں نے کیا ہے۔ان تجزیہ نگاروں میں سبھی نام قابل احترام ہیں بلکہ سبھی اردو ادب کے ماہ وانجم ہیں۔ ان میں تخلیق کار بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔تجزیہ کرنے والوں کا تعلق ترقی پسندی سے بھی ہے اور جدیدیت سے بھی۔ان تجزیہ نگاروں میں شارب ردولوی، افصح ظفر، انیس اشفاق، شافع قدوائی، ابوالکلام قاسمی، علی احمد فاطمی، قدوس جاوید، بیگ احساس، حسین الحق، طارق چھتاری، صغیر افراہیم، جمیل اختر محبی، خالد جاوید، انیس رفیع، کوثر مظہری وغیرہ اہم نام ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بہترین ادب وہ ہے جو سو سال کے بعد بھی باقی رہے۔ظفر اوگانوی کے افسانوی مجموعے 'بیج کا ورق' کی اشاعت کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر اس کے باوجود آج بھی اس میں وہی تر و تازگی ہے۔ان افسانوں کا

تجزیہ نگاروں نے بار بار مطالعہ کرنے کے بعد اس میں موجود علامتوں کی نشاندہی نئے زمانے کے مطابق کی ہے۔ تجزیہ نگاروں نے ان افسانوں کی گہرائی و گیرائی میں پہنچنے کے بعد ہی افسانوں میں موجود علامتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے خامہ فرسائی کی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید افسانہ 'نیا آئینہ' کے تجزیہ کا اختتام کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''ظفر اوگانوی ایک ایسے جدید افسانہ نگار ہیں، جن کے فکری اور جمالیاتی امتیازات، کلاسیکی ادبی روایات، عصری، سماجی و ثقافتی حالات اور ایمانی و ایقانی اقدار و عقائد کے ساتھ گہرا جدلیاتی رشتہ رکھتے ہیں اور یہ ایک ایسا پہلو ہے، جو ظفر اوگانوی کے افسانہ 'نیا آئینہ' کو جدید ہی نہیں مابعد جدید افسانہ بھی ثابت کرتا ہے۔''

(ظفر اوگانوی بیچ کا ورق کے تناظر میں، ص 127)

ادب کی آج تک مکمل تعریف نہیں کی جا سکی ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں ادب کو سمجھا ہے اور اس کی توضیح پیش کی ہے۔ اسی طرح ناقدین ادب بھی اپنے اپنے مطابق کسی بھی تخلیق کو سمجھتے ہیں اور پھر اس کی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ ادب کی یہ خاصیت ہے کہ ایک ہی تخلیق کو مختلف ناقدین ادب اپنے اپنے انداز سے سمجھتے ہیں اور پھر اس کی ناقدانہ تشریح و تجزیہ کرتے ہیں۔ 'بیچ کا ورق' کے افسانوں کا بھی ناقدین ادب نے اپنے اپنے طریقے سے، بہت ہی دلچسپ انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے اور ان تجزیوں کو دبیر احمد نے کتابی شکل میں شائع کر کے اردو کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔

امید ہے کہ اس کے مطالعے سے ہمیں ظفر اوگانوی اور ان کے افسانوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اس کتاب کے ذریعے ظفر اوگانوی کی تحقیق میں ایک نیا در کھلے گا۔

فکشن

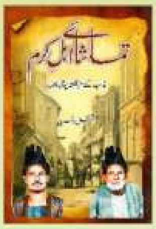

تماشائے اہل کرم

مصنف: شکیل افروز

صفحات: 220، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مطبع: اسکائی پرنٹر اینڈ پبلشر

مبصر: ایس ایم حسینی، 04، ندوہ کیمپس، ڈالی گنج، لکھنؤ، یوپی

شکیل افروز کا شمار کلکتہ کے اہم صحافیوں میں ہوتا ہے، آپ نے اخبار مشرق میں ڈائری لکھ کر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور 'کلکتہ کا کمال' جیسے کالم سے اپنی پہچان بنائی، شکیل افروز بنیادی طور پر صحافی اور فکشن رائٹر ہیں، ان کی قلمی جولانیوں کا محور کلکتہ ہے اور موجودہ دور میں نئی نسل کو کلکتہ سے روشناس کرانے اور اس کی تاریخ کو دلچسپ انداز میں قلمبند کرنے کا امتیاز انھیں کو حاصل ہے، اب تک تیرہ سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سات کتابوں کا موضوع کلکتہ، اس کے بازار، تاریخی عمارتیں، یادگار سڑکیں اور قبرستان ہیں، جن میں یہ چند قابل ذکر ہیں: غالب کلکتہ میں، کلکتہ کے نئے اور پرانے بازار، کلکتہ کی سیر، شہر کلکتہ اور نواح کے قبرستانوں کے حال زار کی دلچسپ روداد۔

'تماشائے اہل کرم' پنشن کی خاطر مرزا غالب کے سفر کلکتہ کی روداد پر مشتمل ہے جس کو شکیل افروز نے افسانوی رنگ میں ترتیب دے کر ناول کا پیکر عطا کیا ہے، ابتدا میں شکیل افروز کی 'اپنی بات' اور پروفیسر صغیر افراہیم کا ایک تبصرہ شامل ہے، خاص بات یہ ہے کہ ناول غالب کے دورہ کلکتہ پر کی گئی تحقیق کے مواد کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے، عام طور پر تاریخی ناولوں کا مطالعہ کریں تو اس میں بہت سی باتیں اور واقعات فکشن کے تقاضوں کی نذر ہو جاتی ہیں اور سچے واقعات و حالات بہت دور کے معلوم ہوتے ہیں، جب کہ شکیل افروز نے حقیقت میں اعتدال پسندی سے کام لیتے ہوئے ناول کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے جو اسے مزید خوبصورت بناتا ہے اور قاری کی یکسوئی اور دلچسپی، حیرت و استعجاب کے ساتھ برقرار رہتی ہے کیونکہ تاریخ کو ناول کا موضوع بنانا مشکل مرحلہ ہے۔

'تماشائے اہل کرم' میں پنشن کی بازیافت کے سلسلہ میں غالب کی کوششوں، مصائب اور مسلسل سفر کے ذکر کے ساتھ بہت سے نئے چہرے منظر پر ابھرتے اور ڈوبتے ہیں، نواب احمد بخش خان والی لوہارو اور لارڈ لیک کے جعلی خط سے وجود میں آنے والا 'خواجہ حاجی' کا کردار غالب کی زندگی کا وہ ناسور بن جاتا ہے جس نے انھیں کلکتہ کے سفر کے لیے مجبور کر دیا، لکھنؤ، کانپور، باندہ، الہ آباد، بنارس، مرشد آباد اور پھر کلکتہ کے شب و روز، راہ میں درپیش صعوبتیں، دوستوں کی عنایات، رقابت، ادبی معرکے، زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضے، ساکت لمحے اور متحرک نغمے غرض سبھی پہلو ناول میں مناسب طرز پر پیش کیے گئے ہیں، کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کوئی ناول نہیں ڈاکومینٹری چل رہی ہے اور ایک کے بعد دوسرا منظر بدل رہا ہے جس میں خوش رنگی بھی ہے اور ایک خاص قسم کی خشکی بھی، باندہ میں نواب ذوالفقار کے یہاں غالب کا چھ ماہ قیام رہا، ان کی ملاقات دیوان محمد علی جیسے ادب نواز سے ہوئی جنھوں نے سفارشی خطوط لکھ کر سفر کلکتہ میں غالب کی ہر طرح سے معاونت کی، دیوان محمد علی نے ہگلی کے نواب کے نام ایک خط دیا تھا کہ وہ پنشن کے سلسلے میں ان کی مدد کریں گے لیکن جب غالب کلکتہ پہنچے اکبر خان طباطبائی کے ہگلی کلکٹر سے تعلقات خراب ہو گئے اور اس طرح بات نہ بن سکی۔ بعد اس کے کلکتہ میں افضل بیگ نے ادبی محفلوں میں غالب کی کلاہ اچھالنے کی ہر ممکن کوشش کی اور علاقائی اخباروں میں پنشن سے متعلق بے بنیاد خبریں شائع کروا کر غالب کے لیے مسائل کھڑے کیے، غالب کے کلکتہ آتے ہی فرنگی طرز زندگی کی تصویر کشی، عوامی زندگی، شہر کی منظر کشی اور تہذیب و ثقافت کے بیان میں ناول نگار کا قلم رواں ہو جاتا ہے، ایک ایک چیز اس باریکی سے بیان کرتے ہیں کہ مکمل تصویر ابھر آتی ہے، ہگلی، کنٹہل بگان، چیت پور، بامن بستی و یگھی، شملہ بازار (جہاں مہینوں غالب کا قیام رہا)، رائٹرز بلڈنگ، سینٹ جان چرچ، ٹاؤن ہال، لال ڈیگھی، پارک اسٹریٹ، گورنمنٹ ہاؤس، کلکتہ کے محلوں، بازار اور سڑکوں تک سے واقفیت ہو جاتی ہے، بنارس میں دیوداسی کو دل دے بیٹھنے کا ذکر اور کلکتہ میں پڑوسی بنگالن کی آواز پر فریفتہ ہو جانا اور اس کے پہلو بہ پہلو ڈومنی کے ابھرتے ہوئے خاکے، غالب کی تڑپ اور اس کی یاد میں مغموم ہونے کا بیان ساتھ ہی میر کی غزلیں ناول میں خواب آور فضا پیدا کرتی ہیں، سید کرم حسین بلگرامی کے گھر ادبی نشستیں، مدرسہ عالیہ کے مشاعرے اور مخالفین کے غالب کے اشعار پر اعتراضات کے جوابات، آشتی نامہ کی اشاعت اور مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش اور محنت سے اردو فارسی کے منتخب کلام گل رعنا کی اشاعت کے پرکشش انداز بیان نے کلکتہ کے قیام کو خوبی سے فکشن کا رنگ دیا ہے، اور اس پورے وقت میں مرزا غالب کے دست و باز و مولوی سراج الدین احمد، ابوالقاسم، مولوی عبدالکریم، میر احمد، مرزا احمد بیگ طپاں منظر نامے پر چھائے رہتے ہیں، غالب کی پنشن کا معاملہ، کلکتہ میں عرضی، پھر کلکتہ سے دہلی عرضی اور پھر وہاں سے کلکتہ منتقل ہونے والی عرضی، پنشن کا مسئلہ اتنا طول پکڑ گیا کہ غالب دلبرداشتہ ہو گئے، اس دوران ناول نگار نے غالب کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت، پریشانی دباؤ اور بے چینی کو بھی بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، بقول پروفیسر صغیر افراہیم: ''تقریباً تین برس کا یہ سفر پنشن کی بحالی کے نقطۂ نظر سے تو ناکام رہا لیکن اسی بہانے غالب نے دنیا دیکھ لی۔''

ناول کی ترتیب میں غالب کے خطوط کی بعض عبارتیں بہت سلیقے سے متن کا حصہ بنائی گئی ہیں جو ناول کی اہمیت میں اضافے کا باعث ہے، شکیل افروز نے کردار و واقعات کے بیان میں جس طرح کلکتہ اور غالب کے رشتے کو فکشن کی زبان عطا کی ہے وہ قابل تعریف ہے، امید ہے یہ تاریخی ناول ادب نواز حلقوں کو اپنی جانب ضرور متوجہ کرے گا۔

شاعری

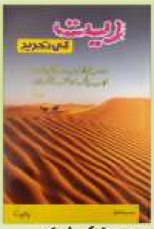

ریت کی تحریر

شاعر: جاوید رانا
صفحات: 192، قیمت: 300 روپے
ناشر: کمال پبلی کیشن، جبل پور، مدھیہ پردیش
مبصر: محمد الطاف انصاری، روشن چونک، مومن پورہ، برہانپور۔ 450331 (ایم پی)

’ریت کی تحریر‘ شہر برہانپور کے نوجوان شاعر جاوید رانا کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ برہانپور کی سرزمین تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی اعتبار سے اپنی منفرد پہچان رکھتی ہے، جہاں سے شعر و ادب کے کئی آفتاب و مہتاب چمکے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی نئی نسل کا روشن خیال شاعر ’جاوید رانا‘ بھی ہے، جس نے اپنی شاعری میں قدامت پسندی کے ہمراہ بزرگوں کی روایت کے ساتھ عہد نو کے تقاضوں کو اپنے حسنِ تدبیر سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے جس میں کلاسیکیت کے ساتھ جدت اور رومانیت کی چاشنی بھی ہے اور ذاتی مشاہدات و تجربات کا بھرپور اظہار بھی ملتا ہے، آپ نے غزل گوئی کی روایت کو عصری جدت سے آمیز کر کے اسے ایک حسین مرکب بنایا ہے۔ کتاب کے سرورق پر کتاب کا نام ’ریت کی تحریر‘ کو شعر میں استعمال کر کے موصوف نے انسانی وجود کی حقیقت یعنی کل نفس ذائقۃ الموت کی ترجمانی کی ہے۔ مجموعے میں غزلوں کے علاوہ قطعات اور آخری صفحے پر ایک عدد آزاد نظم ’سنگِ میل‘ بھی شامل ہے۔ اگر ہم موضوعات کا سرسری جائزہ لیں تو مذہب اور خاندانی رشتوں کا تقدس، عزت و عظمت، رومانی جذبات و احساسات، عصری آگہی، انسانیت کی پامالی، پند و نصیحت، عزم محکم، آپسی اتحاد و محبت، سیاسی انتشار وغیرہ مضامین شاعری کی باریکیوں کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور دیگر صنعتوں کا استعمال بھی جاوید رانا کی شاعری میں جابجا موجود ہے۔

ماں کی بھیگی پلکوں سے باپ کی خموشی تک — گھر کی ساری الجھن کو بیٹیاں سمجھتی ہیں
ہمیں تلاش نہ محفلوں میں دنیا کی — شریف لوگ دلوں میں قیام کرتے ہیں
جھوٹ کے کالے چراغوں کو بجھا دے ورنہ — ترے چہرے سے چمک ساری چلی جائے گی

کتاب کے صفحہ نمبر 13 پر فیروز کمال نے جاوید رانا کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ ”اس (جاوید رانا) نے اپنی اخلاقی مروت اور خودداری کے اجالے میں اپنے لب و لہجہ، جدید رنگ و آہنگ، نوبہ نو لفظیات، تازہ تشبیہات، متنوع استعارات کے ذریعے اپنی شناخت بہت جلد بنالی۔“

واقعی جاوید رانا کی شاعری پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر ہر قدم پر اس کوشش میں ہے کہ کچھ ایسے شعر جائیں، جو قاری و سامعین کو چونکانے والے ہیں۔

مجموعۂ کلام کی طباعت دیدہ زیب ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ شعری مجموعہ حلقۂ ادب میں مقبولیت حاصل کرے گا اور عوام و خواص کی توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہوگا۔

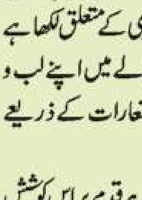

دریچے بات کرتے ہیں

شاعر: عمران عظیم
160 صفحات، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2023
پتہ: چیمبر 694، پٹیالہ ہاؤس کورٹ، نئی دہلی
مبصر: ساحر داؤد نگری 275/6، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 110092

’دریچے بات کرتے ہیں‘ ممتاز شاعر و ناقد عمران عظیم کی تازہ ترین کتاب ہے۔ عمران عظیم ایک زندہ دل شاعر ہیں جو براہ راست قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ عصری منظرنامے میں شاعر خوش فکر، تازہ دم اور روشن خیال نظر آتے ہیں۔ وہ آسان لفظوں میں اپنی بات کہنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایجاز و اختصار کی پرتیں معنی کو پراسرار بنا دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں دل خراش تصویریں بھی ہیں۔ خوف اور دھوئیں کا حسن بھی اور جدید خیالات کی شبنمی ٹھنڈک بھی ہے۔ ان کے لب و لہجے میں پیش کش کے انداز میں اس قدر آہنگی ہے کہ گہرے سے گہرا احساس سرگوشی کے پیرائے میں ادا ہو کر نئی کیفیتوں کا جادو جگاتا ہے۔ ’گفتنی‘ کے تحت شاعر اس طرح اظہار کرتا ہے:

”آج کے مادی دور میں شاعری کارفضول ہے، سماجی انعکاس ہے یا خود کمائی کا ذریعہ۔ یہ بات صرف بات نہیں بلکہ ایک الجھی ہوئی پہیلی ہے، جس کے سلجھانے میں کئی اذہان اور کئی گھنٹے درکار ہیں۔ اس بحث سے ہٹ کر جب میں سوچتا ہوں تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ شاعری ایک سبک احساس ہے جو ذہن و دل کو شادابی اور تازگی بخشتا ہے۔ اور بیجنل شاعری سننے، پڑھنے یا لکھنے سے شاعر کے قلب و روح کے سلسلے روشن ہو جاتے ہیں اور شاعر از خود فعال و متحرک ہو جاتا ہے اور اس کیفیت میں کسی جبر کا دخل نہیں ہوتا بلکہ براہ راست تاثر کے نتیجے میں اظہار کی صورت واضح ہو جاتی ہے۔ شاعری کا عمل فطری عمل ہے جو ہر کسی کا مقدر نہیں ہو پاتا۔ کچھ کم پڑھے لکھے اور زبان دراز شعرا و نقاد نے اس عمل کو علم ریاضی کے فارمولوں کی طرح مشروط و محدود کر دیا۔ اس طرح تک بندی تو ہو سکتی ہے، سچی شاعری نہیں۔ میں بذات خود تخلیقی درجہ بندیوں سے بالاتر ہو کر شعری اظہار کرتا ہوں اور اسی سوچ کی مہر اپنے ذہن و دل پر ثبت کرتا ہوں۔ میری کاوش رہتی ہے کہ اشعار میں جذبے کی آمیزش اور بیان کی چاشنی کو شامل کر سکوں۔“

عمران عظیم کی فکری بالیدگی ان کے قاری کو نئے موضوعات کا احساس دیتی ہے۔ ان کے شعری اظہار میں سادگی، دل کشی اور پُرکاری ہے۔ ان کی شاعری میں عصری زندگی کے وہ تقاضے ہیں جو عہد حاضر کے فرد کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے:

پوچھا ہے اس نے مجھ سے کہ کیا حال چال ہے — میں نے کہا ہے ٹھیک ہے تیرا خیال ہے
جو کل تھا ابھی تک وہی ہے یہاں — پرانا ہے سب کچھ نیا کچھ نہیں
دریچے بات کرتے ہیں تو منظر بولتا ہے — مری دنیا میں یہ جلوہ برابر بولتا ہے
یہاں کی ہوا میں ہے اپنائیت — یہ انداز گنگوہ والوں کا ہے

اس کتاب میں شاعر نے بہت عمدہ نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے ہمعصروں سے کافی مختلف ہیں انھوں نے اپنی نظموں میں نیا اسلوب خلق کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کی مختلف کیفیات کا خوبصورت اظہار ہے۔ انھوں نے طرح طرح کے موضوعات کو اپنی نظموں میں برتا ہے۔ نذر نیر قریشی گنگوہی اور نذر شفیق احمد انصاری عمدہ نظمیں ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری کی نذر ان کی نظم لائق مطالعہ اور طلبائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو سیراب کرنے والی نظم ہے۔ پہچان کھو گئی، کوئی تو میرے ماسوا ہے انمول رشتہ، اٹھو کہ نیند سے بیزار ہو ہی جائیں ہم، بھیڑ بہت تھی، کرونا بھاگ جاؤ نا اور کرونا بھاگ جائے گا، تمام نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ عمران عظیم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظمیں بھی روایت سے ہٹ کر منفرد انداز میں کہی ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش رووں سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ پر چلنے کی کوشش کی ہے جو صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ درج بالا نظموں میں جہاں موسیقیت، مرتعش لفظوں کا انتخاب اور خیال کا ارتکاز ہے وہیں ان کے یہاں لہجے کا دھیما پن اور سنجیدہ موضوعات پر فکری غنائیت بھی پائی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عمران عظیم کی شاعری میں زندگی کی حسین منظرکشی کی گئی ہے۔ معاشرے کی زبوں حالی اور انسانی اقدار کی شکست و ریخت کو انھوں نے اپنی شاعری میں منعکس کیا ہے۔ وہ اپنے شعری سفر میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں، جو ان کے مستقبل میں نیک شگون ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت ورفتار کا بھی۔

یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

فراق گورکھپوری: شخصیت اور فن

نئی دھلی: فراق ایک جینیس تھے۔ وہ فطری شاعر تھے بناوٹی نہیں تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک جدید عاشق دیا۔ فراق کے پاس مقامی تھیوری ہے۔ وہ اپنی

شاعری میں ملک کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار گزشتہ شام ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'فراق گورکھپوری: شخصیت اور فن' پر منعقدہ 'لٹریری فورم' پروگرام میں اردو کے ممتاز اسکالر، ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے خصوصی خطبے میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو میں فراق جیسا کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا۔ وہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر عابدی نے فراق کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی اور ان کا کلام پیش کرتے ہوئے اپنی دلیلیں قائم کیں۔ پروگرام کی ابتدا میں اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب چندربھان خیال نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا کہ فراق بیسویں صدی میں اردو ادب کی اہم ترین شخصیت تھے۔ انھوں نے اردو کی ہر صنف کو مالامال کیا، چاہے وہ شاعری ہو یا تنقید۔ وہ ہرفن مولا شخصیت کے مالک تھے۔ فراق کی شخصیت میں جو بے باکانہ انداز تھا وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔

پروگرام کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ انھوں نے فراق کو ہندوستانیت کا شاعر قرار دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ خواجہ احمد فاروقی کہا کرتے تھے کہ اگر فراق نہ ہوتے تو ہماری شاعری پرانے ڈھرّے پر چلتی رہتی۔ فراق اس میں ہندوستانیت لے آئے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حسن کو شاعری کا محور ومرکز بنانے والا فراق ہے۔ پہلے اردو ادب میں عاشق ہوا کرتے تھے، فراق نے ہمیں حسن سے روشناس کرایا۔ فراق کا ایک رنگ غزلوں میں ہے تو دوسرا رنگ ان کی رباعیوں میں ہے۔ پروگرام کی نظامت ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے رکن ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ آغاز میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے شال اور کتابیں پیش کرکے مہمانوں کا استقبال کیا۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 12 اپریل 2023

داراشکوہ: فن اور شخصیت

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے زیر اہتمام داراشکوہ فن اور شخصیت کے موضوع پر ایک

توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کی۔

توسیعی خطبے کے لیے پروفیسر تقی عابدی کناڈا کو مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے داراشکوہ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گراں قدر گفتگو کی، جب کہ خطبہ استقبالیہ شعبۂ فارسی کے استاد اور سابق ڈین، اسکول آف لینگویج، جے این یو پروفیسر مظہر آصف نے پیش کیا۔ استقبالیہ خطبہ میں پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ داراشکوہ ادیان و مذاہب کی تعلیمات کا عاشق اور ہندوستانی ثقافت و وراثت کا علمبردار تھا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے تقابل ادیان کا مطالعہ پیش کیا۔ پروگرام میں شعبہ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاد پروفیسر انوار عالم پاشا اور پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے بھی اپنے گراں قدر خیالات سے نوازا۔ پروگرام کی نظامت صدام حسین نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اپریل 2023

عالمی یوم کتاب سمپوزیم

نئی دهلی: عالمی یوم کتاب کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا، جس میں مختلف شعبوں سے وابستہ نامور شخصیات کو مدعو کیا گیا۔ سمپوزیم کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر کمود شرما نے کی۔ شرکا میں مصنف آشوتوش اگنی ہوتری، فلسفی اور ڈرامہ نگار بھرت گپتا، شاعرہ جیا مہتا، مصنف اور کارٹونسٹ مادھو جوشی، مصنف اور ماہر تعلیم سدھیش پچوری، گلوکار ادے کمار ملک اور شاعر ونیکی کمار ملک تھے۔ اس موقعے پر آشوتوش اگنی ہوتری نے کہا کہ انسان بننے کا جو چیلنج ہے اس کے لیے کتابیں ہمت دیتی ہیں، کتابیں ہماری تنہا زندگی کو وسیع کرتی ہیں۔ بھرت گپتا نے کہا کہ کتابیں ایک خاص قسم کے متن کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب آپ کا کسی گرنتھ پر ایمان ہوتا ہے تب ہی آپ کو اس سے نئے معنی ملتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جیسے جیسے میں اس کتاب کو پڑھتا رہا، میرے سامنے نئے نئے معنی کھلتے گئے۔ ونود کھیتان نے کتابوں کے بارے میں اپنی دلچسپ معلومات سامعین کے سامنے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک وقت تھا جب کتابوں کے ساتھ رسالے بھی ہمیں بہت کچھ سکھاتے تھے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ یہ ایک کتاب نہیں جو ہماری زندگی بدل دیتی ہے بلکہ کئی کتابوں کے فہم سے ہماری زندگی بدل جاتی ہے۔ ہیمراج نے کہا کہ میں مطالعہ یا کتابوں میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا، لیکن جب میں اپنی پینٹنگ کر رہا تھا تو کتابوں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ جیا مہتا نے کہا کہ کتابیں استاد سے بہتر ہیں کیونکہ ان سے ہم جتنا چاہیں سیکھ سکتے ہیں۔ مادھو جوشی نے کہا کہ میں بچپن سے ہی کارٹونوں کی دنیا میں تھا اور کتابوں کے مقابلے میں ایک کارٹونسٹ کو کم سے کم الفاظ میں بات کرنی پڑتی ہے۔ انھوں نے اپنے خط میں باپ بننے کی پوری کہانی پر بھی گفتگو کی۔ کمود شرما نے کہا کہ گیتا اور رام چرت مانس ہندوستان کے اجتماعی شعور کا حصہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری زندگی بھی ایک کتاب ہے جسے پڑھ کر ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ کتابیں ہمیں راستہ دکھاتی ہیں کیونکہ علم کو یہاں تیسری آنکھ کہا جاتا ہے۔ پروگرام کی نظامت ہندی کے ایڈیٹر انوپم تیواری نے کی۔ اس موقعے پر مختلف علوم وفنون سے وابستہ اہم شخصیات کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ بھی شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2023

ستیہ وتی کالج میں غزل سرائی، نظم خوانی اور کوئز کے مسابقتی پروگرام

نئی دهلی: شعبۂ اردو ستیہ وتی کالج کی بزم ادب کی جانب سے غزل سرائی، نظم خوانی اور کوئز کے مسابقتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ ڈاکٹر قمر الحسن ٹیچر انچارج نے پروگرام کے آغاز میں طلبہ کو اس کے اصول وضوابط کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس طرح کے پروگرام کے انعقاد کا مقصد طلبہ وطالبات میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنا ہے جس سے نئی نسل کی تعلیم وتربیت اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ انھوں نے کالج کی پرنسپل پروفیسر انجو سیٹھ کی خصوصی ہمدردی کی ستائش بھی کی۔ اس مسابقتی پروگرام میں ڈاکٹر شبیر عالم امبیڈکر کالج، ڈاکٹر جتیندر اور ڈاکٹر محمد مرتضیٰ نے حکم کے فرائض انجام دیے۔ ستیہ وتی کالج کے شعبۂ اردو کی ہونہار طالبہ طہورہ سلیم اور طالب علم رمیز سرور نے غزل سرائی کے پروگرام کی نظامت کی۔ پروگرام کے دوسرے حصے کے کوئز میں تین جماعتیں بنائی گئیں، اس کے سوالات ستیہ وتی کالج کی سابق طالبہ ندا فاطمہ نے بڑے سلیقے سے قائم کیے۔ اس مسابقتی پروگرام میں مختلف کالجوں کے طلبہ نے حصہ لیا۔ غزل سرائی میں اول انعام امبیڈکر کالج کے نوید احمد، دوم انعام رمیز سرور اور سوم انعام ابرار احمد ستیہ وتی کالج نے حاصل کیے۔ کوئز کے مسابقتی پروگرام میں اول انعام ستیہ وتی کالج کی محمد ابرار جان، صوفیہ رحمان اور رضی فاطمہ کی ٹیم کو ملا، دوم انعام امبیڈکر کالج کے شعیب، صفیہ اور صوفیہ کی ٹیم کو دیا گیا، سوم انعام محمد طالب، استانہ اور کہکشاں انجم کی ٹیم نے حاصل کیا۔ انعامات کی تقسیم ڈاکٹر پروین کمار اور منوج کمار ہندی شعبہ ستیہ وتی کالج کے اساتذہ کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ اس پروگرام میں شعبے کے استاذ ڈاکٹر عارف اشتیاق، ڈاکٹر سرفراز جاوید اور ڈاکٹر ندیم پیش پیش رہے۔ پروگرام میں شعبہ کے سال اول، دوم اور سوم کے طلبہ نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی۔ ڈاکٹر قمر الحسن نے آخر میں بزم ادب کے صدر سہیل احمد، نائب صدر طیب اور ابرار احمد، سکریٹری شہروز کے پروگرام کے انعقاد میں حسن اہتمام کی تعریف کی اور جملہ طلبہ کی شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور تمام حاضرین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مئی 2023

مملوک العلی لیکچر

نئی دهلی: ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبہ عربی میں منعقد کیے جانے والے پانچویں مملوک العلی لیکچر میں 'درس وتدریس میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال' کے عنوان پر اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر پروفیسر نعیم الحسن اثری نے کہا کہ اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ درسگاہوں میں نصاب تعلیم کو احسن طریقے سے طلبہ کے ذہنوں میں راسخ کرنے میں جدید ٹکنالوجی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے اور حالیہ دنوں کی عمومی وبا کورونا نے اپنے منفی اثرات کے ساتھ دنیا کو درس وتدریس کے کئی نئے طریقوں سے بھی واقف کرایا ہے۔ نظامت ڈاکٹر سید محمد طارق نے کی۔ موصوف نے اپنے افتتاحی کلمات میں سامعین کو نہ صرف کالج کی قدیم تاریخ سے مختصراً واقف کرایا، بلکہ تعلیمی دورانیے کے دونوں سیمسٹروں میں منعقدہ کیے جانے والے غازی الدین لیکچر اور مولانا مملوک العلی لیکچر کی سابقہ کارروائیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ بعد ازاں مہمان محاضر نے ایک گھنٹے سے زائد وقت میں اپنا قیمتی محاضرہ پیش کیا۔ اس لیکچر کے ساتھ ہی کالج سے پاس ہونے والے طلبہ کے لیے الوداعی تقریب کا بھی انعقاد کیا گیا، جس کی نظامت کے فرائض سال دوم کے طالب علم وقار احمد اور محمد حارث نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ اس موقعے پر کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے بھی پاس ہونے والے طلبہ کے لیے اپنی نیک خواہشات اور روشن مستقبل کے لیے قلبی تمناؤں کا اظہار کیا۔ شعبہ کے سینئر استاذ ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے ساتھ مستقبل میں کامیابی کے ضامن اہم اصول بتلائے، ساتھ ہی شعبہ کے صدر ڈاکٹر محمد عبیداللہ نے بھی طلبہ کے لیے تشجیعی کلمات کہے اور مہمان محاضر کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے یونیورسٹی کی مصروفیات کے باوجود پروگرام کے لیے وقت نکالا اور بزم کو رونق بخشی۔ اس موقعے پر سابق میں شعبہ عربی کے ذریعے منعقد کیے جانے والے مقابلہ خوش خطی میں شریک ہونے والے اور پوزیشن لانے والے طلبہ کو تشجیعی سندیں بھی تفویض کی گئیں۔ پروگرام میں شعبہ کے استاذ ڈاکٹر محمد قمر الدین ڈاکٹر نسیم احمد اور ڈاکٹر عبدالملک کے ساتھ شعبہ کے دیگر طلبہ وطالبات بھی شریک رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مئی 2023

اترپردیش

باقیات اقبال کی اہمیت وافادیت

علی گڑھ: مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے زیر اہتمام عالمی شہرت یافتہ ناقد و

ادیب ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے 'باقیات اقبال کی اہمیت و افادیت' کے موضوع پر اپنے توسیعی خطبہ میں علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ اردو کلام پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے اس زمانے میں اپنے کلام کا ایک حصہ مسترد کردیا تھا، یہ کلام رسائل وجرائد، مثلاً مخزن وغیرہ میں دستیاب تو ہوا لیکن اس پر تفصیلی اور محققانہ کام ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ انھوں نے باقیات اقبال پر مفصل کام کیا ہے اور جلد ہی 800 صفحات پر مشتمل ان کی محققانہ کاوش شائقین ادب تک پہنچ جائے گی۔ عابدی صاحب نے اطلاع دی کہ تقریباً 30 نظموں، 25 سے زائد غزلیات، 46 قطعات کو اقبال نے اس وقت اپنے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں کیا تھا۔ علاوہ بریں بہت سے منظومات سے بعض جزو مسترد کردیے حالانکہ مثلاً معروف نظم ہمالیہ، شکوہ و جواب شکوہ اور دیگر نظموں کے بعض بند موجودہ مطبوعہ کلام میں شامل نہیں ہیں۔ انھوں نے بطور مثال دو بند پڑھ کر سنائے۔ انھوں نے بعض وہ نظمیں بھی پڑھیں جو علامہ اقبال نے بچوں کے لیے بطور نصیحت قلم بند کی تھیں (فکر وزبان کے اعتبار سے وہ شائع ہونے کے لائق تھیں)۔ ڈاکٹر عابدی کی معلومات افزا تقریر سے اقبال اور ان کے کلام سے متعلق بہت سی نئی اور مفید اطلاعات سامعین تک پہنچیں۔

جلسے کی صدارت معروف ناقد اور صاحب قلم پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ انھوں نے ڈاکٹر عابدی کی تقریر کو بہت اہم قرار دیا اور کہا کہ کئی نئے حقائق ہمارے سامنے آئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ عابدی صاحب کی ترتیب 'باقیات اقبال' سے شاعر مشرق سے متعلق تحقیق وتنقید کی نئی راہیں کشادہ ہوں گی اور محققین اقبال کی نئی جہات کی طرف متوجہ ہوں گے۔ مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد عثمان غنی نے مہمانوں کا گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ عابد صاحب نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ انتہائی اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ عابدی صاحب کی تقریر طلبا اور طالبات کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی اور ان کے بیان کردہ نکات کی روشنی میں نوجوان نسل علامہ اقبال سے متعلق تحقیق وتنقید کی طرف مزید متوجہ ہوگی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اپریل 2023

تخلیق کار سے ملاقات

لکھنؤ: شعبۂ اردو مانو لکھنؤ کیمپس کے طلبہ وطالبات اور ریسرچ اسکالرز سے ملاقات کرکے مجھے بے انتہا مسرت

ہورہی ہے۔ میرے لیے یہ ایک یادگار دن ہے۔ اردو کی نئی نسل کو اپنی زبان اور ثقافت کے لیے سرگرم ہونا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار مشہور شاعر جناب سہیل آزاد نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں شعبۂ اردو کے تحت تخلیق کار سے ملاقات پروگرام کے دوران کیا۔ انھوں نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ لکھنؤ کی تہذیبی وراثت کے امین آپ ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے یہ بھی کہا کہ تخلیقی ادب سے ہی پہچان ممکن ہے۔ اپنی ادبی سرگرمیوں اور کلاس کے دوران اس جذبے کو مہمیز رکھنا ضروری ہے۔ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر ہما یعقوب نے ابتدا میں جناب سہیل آزاد کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا اور کہا کہ آپ کی آمد ہمارے طلبہ کے ادبی ذوق وشوق کو نکھارنے کا کام کرے گی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمیر منظر نے سہیل آزاد کا تعارف پیش کرتے ہوئے طلبہ کو بتایا کہ اب تک ان کے تین شعری مجموعے آچکے ہیں اور ایک عمدہ شاعر کے طور پر ادبی دنیا میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمیر منظر نے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ شعبہ کے اساتذہ ڈاکٹر مجاہد الاسلام، ڈاکٹر عشرت ناہید، ڈاکٹر نور فاطمہ، ڈاکٹر اکبر علی کا تعارف بھی کرایا۔ اس موقعے پر جناب پرویز ملک زادہ اور جناب آشوتوش پانڈے کا تعارف بھی کرایا گیا۔ اس موقعے پر جناب سہیل آزاد نے اپنی متعدد غزلیں اور نظمیں بھی سنائیں۔ ان کی نظم سفر اور تار گھر کو طلبہ نے بے حد پسند کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 مئی 2023

ہندوستانی انگریزی شاعری پر قومی کانفرنس

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ انگریزی کے زیر اہتمام 'ہندوستانی انگریزی شاعری: تورودت سے واناول کے روی تک' موضوع پر دو روزہ قومی کانفرنس کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ کانفرنس میں ہندوستان کے انگریزی شعرا کی متنوع تخلیقی خدمات کا جشن منایا گیا اور ہندوستانی احساسات کے اظہار کے ساتھ ہندوستانی انگریزی شاعری کو علمی وقار عطا کرنے پر زور دیا گیا۔ اختتامی سیشن کی مہمان خصوصی اردو انگریزی کی شاعرہ ڈاکٹر زویا زیدی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ زبان بذات خود ایک ثقافت ہے نہ کہ صرف رابطے کا ذریعہ۔ انھوں نے اپنی کچھ نظمیں سنائیں جس میں 'دی بیز اناؤنسمنٹ'، 'لائف از این اوشین ڈیپ اینڈ وائڈ' اور اردو کی نظم 'آیئے بیٹھیے' شامل تھی۔ اس سیشن کے اختتام پر کانفرنس کی کنوینر پروفیسر منیرہ ٹی نے شکریہ ادا کیا۔ قبل ازیں صدر شعبہ پروفیسر محمد عاصم صدیقی نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر زویا زیدی کا تعارف کرایا۔ پلینیری سیشن میں پروفیسر امینہ قاضی انصاری نے ہندوستانی انگریزی شعریات کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے انگریزی شاعری میں پائے جانے والے مخصوص ہندوستانی تجربے اور حس کا ذکر کیا اور کہا کہ عہد حاضر کی شاعری کا مطالعہ دو طریقوں سے کیا جاسکتا ہے جس میں ہندوستانی شعریات کی تفہیم اور تجزیہ کے لیے مخصوص میتھڈ و اسلوب شامل ہیں۔ پروفیسر قاضی نے ہندوستانی تجربے اور شناخت کے ذیلی موضوع کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ ادب صرف آئینہ ہی نہیں، بلکہ یہ ذہن کا ایک نقشہ اور جغرافیہ بھی ہے۔ کنیڈیائی اسکالر کی استعمال کردہ اصلاح 'ڈیشکیپ' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قوم ایک تاریخی تصور ہے جو روایت، ثقافت اور نظریات سے ابھرتا ہے۔ پروفیسر محمد عاصم صدیقی نے 'ہندوستانی انگریزی شاعری کا جشن' موضوع پر مسٹر واناول کے روی، پروفیسر رانو انیال پنت اور پروفیسر سمیع رفیق کے ساتھ ایک مکالمہ میں حصہ لیا۔ مسٹر روی نے اس موقعے پر کہا کہ 'شاعری ان کے لیے ایک فطری عمل ہے اور زبان ثانوی شے ہے' اپنے کلیدی خطاب میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، نقاد، مترجم اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سکریتا پال کمار نے کہا کہ انگریزی میں ہندوستانی شاعری تخلیق کرنے کے لیے سرحد یا کنارے پر ہونا (Liminality) ایک بنیادی شرط ہے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف ثقافتوں کا حامل ہونے سے دو یا زائد زبانوں میں شعر تخلیق کرنا ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ ڈین، فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر عارف نذیر نے شعبہ انگریزی کو ہندوستانی انگریزی شاعری پر کانفرنس منعقد کرنے کے لیے مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ شاعری زندگی کا نچوڑ ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر چند اشعار بھی سنائے۔ کانفرنس میں آٹھ متوازی سیشن منعقد ہوئے جن میں ملک بھر سے تقریباً 50 سے زائد تحقیقی مقالے پیش کیے گئے اور ہندوستانی تخلیقات بالخصوص ہندوستانی انگریزی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو

موضوع گفتگو بنایا گیا۔ کانفرنس کے شریک کنوینر ڈاکٹر ثاقب ابرار نے کانفرنس کی رپورٹ پیش کی جس کے بعد شرکا میں اسناد تقسیم کی گئیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 مئی 2023

اعزاز و اکرام

ایم پی اردو اکادمی کے اعزازات کا اعلان

بھوپال: ریاستی اردو اکادمی، سنسکرتی پریشد، محکمہ ثقافت کے ذریعے سال 2021 اور 2022 میں شائع شدہ کتابوں

پر تشکیل شدہ ایوارڈ جیوری کے ذریعے درج ذیل 6 کل ہند اعزازات اعزازی رقم مبلغ 51000 روپے اور 12 صوبائی اعزازات انعامی رقم مبلغ 31000 روپے دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ کل ہند اعزازات میر تقی میر اعزاز: ڈاکٹر شفیع ہدایت قریشی، دتیہ کو 'انبساط فکر' پر، 'حکیم قمر الحسن اعزاز' عارف عزیز بھوپال کو 'زاویہ نگاہ' پر، 'حامد سعید خاں اعزاز' رخشندہ روحی مہدی کو 'مانسون اسٹور' پر، 'شاداں اندوری اعزاز' بدر واسطی بھوپال کو 'ناچ گان' پر، 'جوہر قریشی اعزاز' رینو بہل دلی کو 'جہان آرزو' پر، 'ابراہیم یوسف اعزاز' ڈاکٹر رضوان الحق دلی کو 'خودکشی نامہ' پر۔ صوبائی اعزازات: 'سراج میر خاں سحر اعزاز' شعور آشنا، برہانپور کو 'انتظار اور کب تک' پر، 'باسط بھوپالی اعزاز' ڈاکٹر محمد اعظم بھوپال کو 'درد کا چاند بجھ گیا' پر' محمد علی تاج اعزاز' اشوک مزاج بدر ساگر کو 'میں اکائی ہوں میں سماج بھی' پر، 'نواب صدیق حسن خان اعزاز' رشید انجم بھوپال کو 'آواز کی دنیا کا دوست امین سیانی' پر، 'شعری بھوپالی اعزاز' رفیق ریوانی، ریوا کو 'کچھ شعر کچھ قطعات کچھ غزلیں' پر، 'کیف بھوپالی اعزاز' رشدی جمیل بھوپال کو، 'مجھو دیال سخن اعزاز' مہیندر اگروال، شیوپوری کو 'رو بہ رو' پر، 'شفا گوالیاری اعزاز' ڈاکٹر واصف یار برہانپور کو 'مٹی ڈال پر'، 'جاں نثار اختر اعزاز' پروفیسر آفاق حسین صدیقی بھوپال کو 'اردو شاعری میں شخصی مرثیے' پر، 'پنا لال نور شریواستو اعزاز' ریاض عالم محمدی، جبل پور کو 'تجلیات بزم ثنا' پر، 'سورج کلا سہائے اعزاز' خالدہ صدیق بھوپال کو 'گلابی شام کے سائے' پر اور 'ندا فاضلی اعزاز' جمیل احمد جمیل جبل پور کو 'رباب فکر' پر۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، ....

رسم اجرا

پیڑھی در پیڑھی

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے کہا کہ علاقائی زبانوں کا ادب دیہی علاقوں میں پوشیدہ ہندوستانی ثقافت کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر خطے کی اپنی الگ ثقافت ہوتی ہے، جس کی عکاسی ادب کرتا ہے۔ اس لیے علاقائی زبانوں میں جتنا زیادہ ادب تخلیق کیا جائے گا، ہندوستانی ثقافت اور ادب اتنا ہی امیر ہوگا۔ پروفیسر یوگیش سنگھ دہلی یونیورسٹی کے وائسریگل لاج کے کونسل روم میں پون سونتی کے لکھے ہوئے ہریانوی کہانیوں کے مجموعہ 'پیڑھی در پیڑھی' کی رسم اجرا کے موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتاب کے مصنف پون سونتی نے ان کہانیوں میں تقریباً 150-100 سال کی دیہی زندگی کو نہایت باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کہانیوں میں جہاں پرانے زمانے میں ساہوکار نظام میں پھنسے کسانوں کی حالت زار کو درست طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ وہیں غیر قانونی طور پر بیرون ملک جانے والے اور مشکلات میں پھنسنے والے نوجوانوں کی حالت زار کو بھی نہایت دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈی یو کے پی آر او پروفیسر انوپ لاٹھر نے کہا کہ ادب اور ثقافت کو کتابوں کی صورت میں طویل عرصے تک محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ علاقائی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں اس وقت کے طریقوں اور لوک زندگی کی تفصیل ضرور ملتی ہے۔ ثقافت وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، لیکن ادب اس مخصوص خطے کی موجودہ ثقافتی خصوصیات کو محفوظ رکھتا ہے اور اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کرتا ہے۔ تقریب کے اختتام پر کتاب کے مصنف پون سونتی نے دہلی یونیورٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ اور دہلی یونیورسٹی کی کلچرل کونسل کے چیئرپرسن اور پی آزاد انوپ لاٹھر کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ انوپ لاٹھر 1984 سے کروکشیتر یونیورسٹی میں یوتھ اینڈ کلچرل ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر کے طور پر تعینات ہونے کے بعد 30 سال تک ہریانوی بولی کو ایک مکمل زبان کے طور پر قائم کرنے کے ذمے دار تھے، اسی دوران 2011 میں انوپ لاٹھر نے مجھے ہریانوی زبان میں ادب لکھنے کی ترغیب دی۔ اس موقعے پر معزز مہمانوں سمیت کئی اساتذہ، افسران اور عملہ کے ارکان موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اپریل 2023

صادق ہدایت کے ناول بوف کور کی بازدید: جدید فارسی ناول پر مقالات

نئی دہلی: انڈیا انٹرنیشنل اور پرائمس بکس کے زیر اہتمام ایران کے عالمی شہرت یافتہ مصنف صادق ہدایت کا مشہور زمانہ ناول بوف کور (اندھا الو) سے متعلق مقالات پر مبنی ایک کتاب بعنوان 'صادق ہدایت کے ناول بوف کور کی بازدید: جدید فارسی ناول پر مقالات' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد پروفیسر سید اختر حسین اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر ارشد القادری کی مشترکہ کوششوں سے تدوین وتالیف کے مراحل سے گزری ہے اور 13 مقالات پر مشتمل ہے۔ مؤلفین نے اس کتاب کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی کے بین الاقوامی ریسرچ ڈویژن کی سابق صدر ڈاکٹر کپیلا واتسیایان کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب کا اجرا ڈاکٹر سکریتا پال کمار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر ادے کمار نے ناول بوف کور کے ملیالم ترجمے پر روشنی ڈالی۔ جواہر لال یونیورسٹی کے شعبہ ہنر و جمالیات کی پروفیسر رنجنی مجمدار نے بوف کور پر بنی فلموں پر تفصیلی گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2023

وفیات

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

لکھنؤ: عالم اسلام کی معروف علمی وادبی شخصیت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر و ناظم ندوۃ العلما مولانا سید

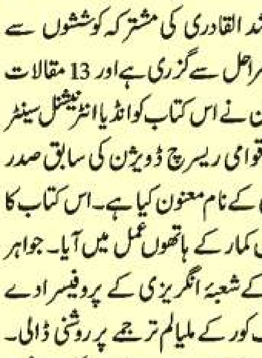

محمد رابع حسنی ندوی نے مختصر علالت کے بعد 13 اپریل کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا کی نماز جنازہ ندوۃ العلما میں رات 10 بجے ادا کی گئی۔ اس کے بعد جسد خاکی کو آبائی وطن رائے بریلی تکیہ کلاں لے جایا گیا۔ پسماندگان میں تین بیٹیاں ہیں۔ مولانا کی پیدائش رائے بریلی تکیہ کلاں میں 1929 کو ہوئی، آپ کے والد ماجد سید رشید احمد حسنی تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ آپ کے سگے ماموں تھے۔ ابتدائی تعلیم خاندانی مکتب میں حاصل کی اور مولانا علی میاںؒ کی تربیت

میں رہے اور ان کے ذاتی سکریٹری کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، ایک سال دارالعلوم دیوبند میں بھی تعلیم حاصل کی۔ 1948 میں دارالعلوم ندوۃ العلما سے فراغت حاصل کی اور 1949 میں اس ادارہ میں معاون استاذ کی حیثیت سے خدمات شروع کی۔ ایک سال حجاز میں دعوتی مقصد سے قیام کیا اور تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔ 1959 میں ندوۃ العلما سے 'الرائد' جاری کیا۔ 1970 میں شعبہ عربی کے صدر منتخب کیے گئے۔ 1993 میں دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم بنائے گئے۔ 1998 میں نائب ناظم اور 2000 میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے انتقال کے بعد ناظم ندوۃ العلما منتخب ہوئے۔ 2003 میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے اور اس وقت سے اب تک صدارت کے منصب پر فائز تھے۔ مولانا نے اکثر ممالک اسلامیہ عربیہ سمیت یوروپ، امریکہ، جاپان، ملیشیا، مراکش، تیونس، الجزائر، جنوبی افریقہ اور متحدہ عرب امارات، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ کے اسفار کیے۔ نیشنل اور انٹرنیشنل سمیناروں میں شرکت کی اور مقالے پیش کیے۔ ان کے بہت سارے مضامین ملک و بیرون ملک کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی رکن اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر، دینی تعلیمی کونسل کے صدر، پیام انسانیت کے سرپرست اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز کے تاحیات رکن رہے۔ مولانا کی اردو اور عربی میں 60 سے زائد تصنیفات ہیں۔ ان کے انگریزی اور ہندی نیز دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں، مشہور تصنیفات میں قرآن کریم انسانی زندگی کا رہبر کامل، رہبر انسانیت، جزیرۃ العرب، سماج کی تعلیم و تربیت، الادب العربی بین عرض ونقد وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو ان کی عربی زبان و ادب کی خدمات کے سلسلے میں 1982 میں صدر جمہوریہ ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ شاہ ولی اللہ ایوارڈ 2015 میں آئی او ایس (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) دہلی کی طرف سے تفویض کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2023

ایم اے ظفر

پٹنہ: روزنامہ 'فاروقی تنظیم' کے بانی مدیر ایم اے ظفر کا 17 اپریل صبح 8:30 بجے پرل اسپتال بریاتو رانچی میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ اور تدفین بعد نماز عشا ادا کی گئی۔

مرحوم کی عمر تقریباً 56 سال تھی، گزشتہ سال مرحوم کا ممبئی میں آپریشن ہوا تھا جو کامیاب رہا۔ ظفر گیا ضلع کے ذکرا میں مولانا فاروق الحسینی کے گھر پیدا ہوئے۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹا اقبال ظفر فاروقی ہیں جنھوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کو ایک بچی بھی تھی جو کم عمری میں انتقال کرگئی۔ ظفر کے والد عالم دین کے علاوہ ایک بلند پایہ صحافی، جمعیۃ علما بہار اور حج کمیٹی کے سکریٹری بھی تھے۔ وہ 'ہمالیہ' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی پٹنہ سے نکالتے تھے۔ مولانا کا جب انتقال ہوا تو ظفر صاحب کی عمر محض 17 سال تھی۔ انھوں نے اسی عمر میں 'ہمالیہ' کی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ عمر کم تھی لیکن حوصلہ بلند تھا، جلد ہی انھوں نے روزنامہ فاروقی تنظیم کا رانچی سے اجرا کیا۔ فاروقی تنظیم نے جو پودا لگایا تھا وہ آج اردو صحافت کا تناور درخت بن گیا۔ چنانچہ آج رانچی سے 13-14 اردو روزنامے شائع ہو رہے ہیں۔ جب بہار سے الگ ہوکر جھارکھنڈ بنا تو ایم اے ظفر نے پٹنہ ایڈیشن شروع کیا جو جلد ہی بہار کے سرکردہ اردو اخبارات میں شمار ہونے لگا۔ فاروقی تنظیم جھارکھنڈ کا پہلا اردو اخبار ہے جس نے یو این آئی کی سروس لی، کمپیوٹر کمپوزنگ کروائی اور آفسیٹ کی چھپائی شروع کی۔ پورے ملک میں فاروقی تنظیم صاف گوئی کے لیے جانا جاتا ہے۔

روزنامہ 'گرم ہوا'، پٹنہ 18 اپریل 2023

نسیم نکہت

لکھنؤ: اردو شاعری کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت بنانے والی ممتاز شاعرہ ڈاکٹر نسیم نکہت کا حرکت قلب بند

ہوجانے کے سبب لکھنؤ میں............ انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش 10 جون 1958 کو اترپردیش کے بارہ بنکی ضلع میں ہوئی۔ ہندوستان کی صف اول کی شاعرات میں نسیم نکہت کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور اہل علم سے داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ خاص کر اردو حلقوں میں ان کی تخلیق دھواں دھواں، خواب دیکھنے والو، یادوں کے موسم کی کافی پذیرائی ہوئی۔ نسیم نکہت نے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تھی اور بطور صحافی بھی انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرایا تھا۔ ڈاکٹر نسیم نکہت اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ تھیں، اپنی لفظیات اور آہنگ کی وجہ سے انھیں معاصر شعری منظرنامہ میں انفراد و اختصاص حاصل تھا۔ ایک خوب صورت اظہار و احساس کی شاعرہ نے نہ صرف مشاعروں میں اپنی پہچان بنائی بلکہ معتبر علمی و ادبی حلقے میں ان کی اپنی ایک شناخت تھی۔ ان کی شاعری میں حیات وکائنات کے بہت سے رنگ ہیں۔ انھوں نے اپنے مشاہدات، محسوسات اور تجربات کو نہایت سلیقے سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار ادیبوں نے اپنے مضامین میں حوالے کے طور پر پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری اتنی اچھی اور گہری ہوتی تھی کہ لوگ اپنی باتوں کو پراثر بنانے کے لیے ان کے اشعار کا استعمال کرتے تھے۔ عام فہم زبان میں گہری بات کرنا نسیم نکہت کے کلام کی خوبی تھی۔ ان کے شوہر منور جعفری (پپلو لکھنوی) بھی معروف شاعر ہیں اور ان کا شمار ملک کے چنندہ مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ معروف شاعرہ ڈاکٹر نسیم نکہت کے انتقال کی خبر سن کر اردو حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ بڑی تعداد میں شعرا و ادبا نے ان کے انتقال کو اردو شاعری کا بڑا خسارہ بتاتے ہوئے ان کی مغفرت کی دعا کی ہے اور اہل خانہ سے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2023

رشید قریشی

لکھنؤ: معروف صحافی و شاعر رشید قریشی کا 12 مئی کی رات اپنی رہائش گاہ امین آباد میں انتقال ہوگیا۔ ان کی

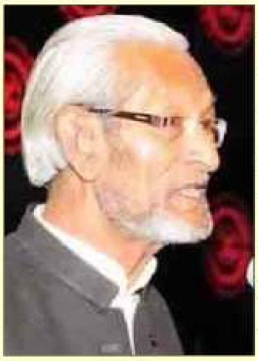

ولادت دسمبر 1944 میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ان کی شاعری کا آغاز 1953 میں ہوا تھا۔ شعرگوئی کے ساتھ ساتھ وہ

اخبارنویسی یعنی صحافت کے میدان میں بھی فعال رہے۔ اپنی صحافتی سرگرمیوں کے دوران وہ کولکاتا اور ممبئی کے اخبارات سے بھی وابستہ رہے۔ ان میں روزنامہ انقلاب (ممبئی) اور روزنامہ 'آزاد ہند' (کولکاتا) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ممبئی میں انھوں نے خواجہ احمد عباس، گلوکار اور ہدایت کار بی آر اشارہ کے لیے بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ لکھنؤ کے اخبارات قومی آواز، صحافت اور ان دنوں سے بھی منسلک رہے۔ 1988 میں انھوں نے ادبی رسالے ماہنامہ 'لاریب' کی اشاعت کی شروع کی جو ابھی تک شائع ہوتا رہا ہے۔ وہ اپنے ارادے پر ہمیشہ اٹل رہے اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی 'لاریب' جاری رکھا۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے کویت اور بحرین کے عالمی مشاعروں میں کئی بار شرکت کی اور وہاں لکھنؤ کی نمائندگی کی۔ ایک طویل مدت سے ان کی ساری دلچسپی اور سرگرمی ماہنامہ لاریب پر مرکوز تھی۔ رشید قریشی کافی دنوں سے علیل تھے۔ انھیں کئی امراض نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ علاج کے لیے وہ دو بار لکھنؤ کے بلرام پور اسپتال میں بھرتی بھی ہوئے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوسکا۔ رشید قریشی کی تدفین عیش باغ کے قبرستان میں ہوئی۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے، بہو ایک بیٹی داماد اور ان کی اولادیں شامل ہیں۔ ان کی اہلیہ پانچ سال پہلے داغ مفارقت دے چکی ہیں۔

روزنامہ......

حسنین نقوی

امروهہ: روزنامہ 'انقلاب' کے بجنور کے نمائندہ سید حسنین نقوی کا 1 مئی کو حرکت قلب بند ہونے سے علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ 58 سالہ حسنین نقوی کے پسماندگان میں دو بیٹیاں اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر سبطین سیدہ ہیں، جو سرکاری ملازم ہیں۔ واضح رہے کہ حسنین نقوی سات بھائیوں میں چھوٹے تھے۔ ان کے چار بھائی ان سے قبل فوت ہوچکے ہیں۔ 1 مئی بروز سوموار کی صبح ان کا جسد خاکی ان کے آبائی وطن محلہ بچدرا امروہہ لایا گیا، جہاں بعد نماز ظہر نماز جنازہ شیعہ شہر امام اور مرحوم کے بہنوئی ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی نے ادا کرائی، جب کہ تدفین درگاہ حضرت شاہ ولایت میں ہوئی جس میں شہر و اطراف کے سماجی سیاسی ادبی اور صحافتی دنیا کے سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ یاد رہے کہ حسنین نقوی طویل مدت سے اردو صحافت سے منسلک رہے ہیں۔ انقلاب کی اشاعت سے قبل انھوں نے کافی عرصہ روزنامہ 'صحافت' کے لیے بجنور سے نمائندگی کی، اسی کے ساتھ انھوں نے دیگر اخبارات کے لیے بھی خدمت کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2023

مولانا یاسین اختر مصباحی

نئی دهلی: مولانا یاسین اختر مصباحی مسلسل ایک ماہ علالت کے بعد 7 مئی کو انتقال کر گئے۔ وہ شدید علالت کی وجہ سے ایمس دہلی میں 7 مئی کی شب داخل تھے۔ انتقال کے بعد ان کا جسد خاکی دہلی سے آبائی گاؤں خالص پور مئو لایا گیا جہاں ہزاروں سوگواروں، علما اور متعلقین کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے جنازہ میں قرب و جوار کے مدارس کے اساتذہ، ذمے داران، طلبا سمیت بیرونی علما و مشائخ اور کثیر تعداد میں سیاسی، سماجی و ملی لیڈران کے ساتھ عوام الناس نے شرکت کی۔

مولانا یاسین اختر مصباحی ادروی (بانی دارالقلم دہلی) کا تعلق مئو کے خالص پور گاؤں سے تھا، جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی مجلس شوریٰ کے رکن اور سابق شیخ الادب، المجمع الاسلامی مبارک پور کے رکن بانی، ہندوستان کے دو مشہور رسائل ماہنامہ حجاز دہلی، ماہ نامہ کنز الایمان دہلی کے سابق مدیر، درجنوں اہم کتب کے مصنف و مترجم و متعدد تنظیموں اور اداروں کے رکن اور سرپرست تھے۔ ان کا شمار بڑے علمائے دین میں ہوتا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم خالص پور ادری میں ہوئی۔ اعلیٰ دینی تعلیم جامعہ اشرفیہ مبارکپور سے حاصل کی۔ دہلی میں دارالقلم کے نام سے ایک تعلیمی و تصنیفی ادارہ قائم کیا۔ کئی درجن کتابیں مرحوم کی تصنیف کردہ ہیں۔ وہ جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے قابل فخر سپوت تھے۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب خالص پور میں ادا کی گئی۔ فراغت کے بعد دارالعلوم غریب نواز الہ آباد میں سنہ 1971 میں تدریسی خدمات شروع کی تھیں۔ 1974 سے 1982 تک جامعہ اشرفیہ مبارکپور میں شیخ الادب کے منصب پر فائز رہے۔ ان کے انتقال سے علما اور طلبا میں غم والم کی لہر دوڑ گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مئی 2023

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دور سے معلومات کی حصول

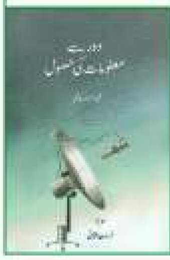

مصنف: محمد احرار عالم، مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 130

قیمت: 90 روپے

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

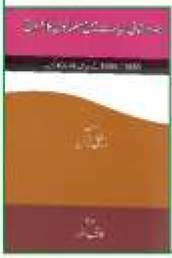

مصنف: رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 533

قیمت: 245 روپے

ممتاز محل

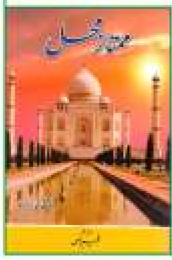

مترجم: فہیم احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 442

قیمت: 210 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

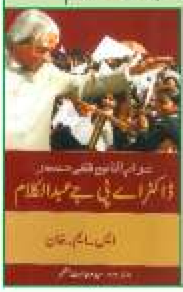

مصنف: ایس ایم خان، مترجم: سید وجاہت مظہر

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 95 روپے

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

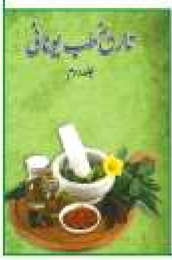

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

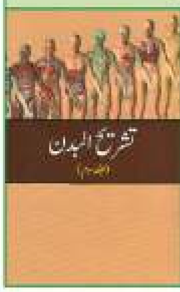

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

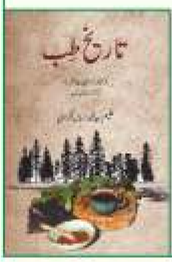

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जून-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०६
URDU DUNIYA Monthly, June-2023, Vol.25, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6